امایہ خان

آمایہ خان

ناولٹ

رات ساحروں کے اعمال کی مانند سیاہ اور تاریک تھی۔ کسی ٹمٹماتے تارے کی روشنی کا نقطہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا آسمان پر۔ گہرا سناٹا کسی طوفان کی آمد کا منتظر تھا۔ اس نے تمام پردے کھینچ کر برابر کر دیے اور نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔

ابھی اس کی نماز ختم نہیں ہوئی تھی کہ کمرے میں کچھ سرسراہٹیں سنائی دینے لگیں۔ نماز کی وجہ سے پیچھے مڑ کر نہ دیکھ سکی لیکن ذہن الجھ کر رہ گیا تھا۔ زبان ازبر آیات کو رٹے رٹائے سبق کی طرح پڑھنے میں مشغول رہی۔

اس نے شہادت کی انگلی اٹھائی، پورے جسم نے گواہی دی بس ایک دل... وہ خاموش رہا۔

سلام پھیرتے ہی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور دہشت کے مارے اندر تک لرز گئی۔ اس کے کمرے میں سانپ ہی سانپ بھرے ہوئے تھے۔ سیاہ چمکیلے سانپ۔ ایک دوسرے پر چڑھتے اترتے پورے فرش پر دندناتے پھر رہے تھے۔ دیواروں پر بھی اس کی تمام پورٹریٹس بھی ان لہردار اجسام کے پیچھے چھپ گئی تھیں۔ زمین پر رینگتے سانپ اس کی توجہ پاتے ہی اپنے پھن اٹھا کر کھڑے ہو گئے اور جھومنے لگے۔ خوف کے مارے اس کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں پا رہی تھی۔ ایک سانپ رینگ کر نماز کے مقام پر پہنچ گیا۔ قریب تھا کہ وہ اسے ڈس لیتا کہ اس نے زوردار چیخ مار کر آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ دیر تک وہ یونہی کانوں پر ہاتھ رکھے آنکھیں بند کر کے بیٹھی رہی۔ پھر کسی نے آہستگی سے اس کی کلائی

پکڑی اور ہاتھ کان سے ہٹا دیا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں تو کمرا بالکل خالی تھا۔ نہ کوئی سانپ' نہ پھنکار نہ ہی سرسراہٹ۔۔۔ تو کیا میں خواب دیکھ رہی تھی؟ اس نے حیرت سے سوچتے ہوئے اپنی کلائی کی طرف دیکھا' جسے کوئی ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ اس نے فوراً" گردن گھما کر دیکھا تو آنکھیں وحشت سے پھیلتی چلی گئیں۔ وہ خود اپنے سامنے بیٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

کار کی مخدوش حالت سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کی کیا حالت ہوئی ہو گی۔۔۔ یا تو وہ مر چکا تھا یا موت سے بدتر تکلیف میں مبتلا تھا۔ برائن نے کار میں بیٹھے ہوئے اندازہ لگایا۔

وہ اور اسمتھ سی ایچ پی (کیلی فورنیا ہائی وے پیٹرول) آفیسرز تھے۔ اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے اور جائے حادثہ پر پہنچے انہیں تھوڑا ہی وقت گزرا تھا۔ کار ایک طرف کھڑی کرنے کے بعد اسمتھ تو فوراً" ہی اتر گیا تھا جبکہ برائن چاہتا تھا' اس ایمبولینس کے وہاں سے چلے جانے کے بعد باہر نکلے' جو زخمی شخص کو اسٹریچر پہ لٹا کر ہسپتال جانے والی تھی۔ وہ کمزور دل نہیں تھا۔ یہ اس کی جاب تھی مگر اس ہفتے میں تواتر سے ہونے والا یہ تیسرا ایکسیڈنٹ تھا۔

پہلے دو حادثے بھی اسی ہائی وے پر ہوئے تھے۔ سولہ سالہ فریڈی لائسنس نہ ہونے کے باوجود باپ کی SUV ہائی وے پر لے آیا تھا اور حادثے کا شکار ہو کر چل بسا۔ دوسرا ایکسیڈنٹ اس سے زیادہ شدید نوعیت کا تھا۔ وہ گاڑی ٹرک سے ٹکرا کر ہوا میں اچھلی اور اس کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ دونوں میاں بیوی کے اعضا سڑک پر بکھر گئے تھے جنہیں جمع کرنے کے بعد تشخیص کے لیے ان کے بچوں اور رشتہ داروں کے پاس لے جانے کی ذمہ داری برائن کے سپرد کی گئی تھی۔

اس کارروائی کی تکمیل کے بعد وہ تین راتوں تک سکون سے سو نہیں پایا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ اپنا ذہن ان دل خراش مناظر سے ہٹا پایا تھا کہ آج ایک اور حادثہ رونما ہو گیا تھا۔ یہ بھی کوئی نوجوان لگ رہا تھا۔ برائن کار میں بیٹھا رہا' جب تک ایمبولینس روانہ نہیں ہو گئی۔ سائرن بجاتی ایمبولینس کے وہاں سے جاتے ہی وہ گاڑی سے اترا۔ Tow Truck کار کو سڑک سے ہٹانے کے لیے آ چکا تھا۔ لیکن اس سے پہلے برائن جائے حادثہ کا پوری طرح جائزہ لینا چاہتا تھا۔

وہ نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا اسمتھ کے نزدیک آیا' جو ایک شخص کا بیان لکھ رہا تھا۔ اس نے وہ حادثہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا' وہ بتانے لگا۔

"اس اسپورٹس کار نے اچانک ہی انڈیکیٹر دیے بغیر اپنی لین چینج کی اور دوسری لین میں پیچھے سے آنے تیز رفتار ٹرک کی ٹکر سے چکراتی ہوئی سڑک کے آخر جا کر الٹ گئی۔"

برائن نے پہلے تاسف سے گردن ہلاتے ہوئے سڑک کے کنارے الٹی کار کی جانب دیکھا' پھر ٹارچ آن کرتا کار کی طرف بڑھنے لگا۔ جس کا بونٹ کرش ہو چکا تھا اور دایاں حصہ لوہے کا پنجر نظر آ رہا تھا۔ ونڈ اسکرین اور کھڑکیوں کے تمام شیشے چھوٹی چھوٹی کرچیوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ برائن نے ٹارچ کی روشنی کار میں گھمائی۔ ڈرائیونگ سیٹ انسانی خون سے رنگی ہوئی تھی۔ پتا نہیں ایکسیڈنٹ کی وجہ کیا تھی؟ ذہنی دباؤ' ڈرائیور کا نشے میں ہونا یا پھر موبائل پر گفتگو اور میسجنگ میں مصروف' ابھی حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

اب وہ اور اسمتھ مل جل کر اچھی طرح کار کی تلاشی لے رہے تھے۔ کار نو سیٹر تھی۔ برائن کو ایکسیلیٹر کے پاس میٹ میں پھنسا ہوا موبائل فون ملا' جس پر خون کے قطروں سے کرچیاں چپٹی ہوئی تھیں' اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر فون کو اچھی طرح صاف کرنے کے بعد آن کر لیا۔ آخری کال اب سے آدھے گھنٹے پہلے کی گئی تھی ساڑھے گیارہ بجے یعنی حادثے کے عین وقت شاید یہی وجہ تھی۔ برائن کو سخت افسوس ہوا۔ ذرا سی لاپروائی زندگی جیسی قیمتی شے سے محروم کر دیتی ہے مگر لوگ باز نہیں آتے۔ نوے فی صد کار کے حادثات اسی باعث ہوا کرتے تھے۔ اس نے آخری کال کا نمبر دوبارہ ملایا اور انگیج ٹون سن کر بند کر دیا۔ اسی اثنا میں اسمتھ ڈیش بورڈ سے تمام پیپرز نکال چکا تھا۔ جس میں ڈرائیونگ لائسنس بھی موجود تھا۔ برائن نے اس کے ہاتھ سے لائسنس لے کر ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔

معیز خان۔۔۔ ایک نہایت خوش شکل نوجوان کی تصویر کے ساتھ اس کا نام اور پتا درج تھا' جسے پڑھتے ہوئے اس کی نگاہوں کے سامنے خون میں لت پت وجود پھر سے آ گیا' جسے کچھ دیر قبل ایمبولینس لے کر ہسپتال روانہ ہوئی تھی۔ اگر یہ شخص بھی مر جاتا تو سات دن میں یہ چوتھی موت ہوتی۔۔۔ جس کا یقیناً" برائن کو بہت عرصے تک افسوس رہتا۔ بظاہر آثار یہی دکھائی دے رہے تھے کہ وہ شخص زندہ نہیں بچے گا۔

☼ ☼ ☼

وہ عورت سر سے لے کر پاؤں تک ہو بہو اس جیسی تھی' رتی برابر فرق نہ تھا۔ ابھی وہ سانپوں کے غائب ہونے کے بعد ٹھیک طرح سے سکون کا سانس لے بھی نہیں پائی تھی کہ دل پھر سے اچھل کر حلق میں اٹکا پڑا تھا۔ بے اختیاری میں اس نے ہتھیلی کو زمین پر جما کر اپنا بوجھ اس پہ ڈالتے ہوئے پیچھے سرکنے کی کوشش کی۔ جہاں تک اسے یاد تھا' عبادت کے اس مقام پر کبھی بھی آئینہ نصب نہیں تھا۔ اس کے پہلو میں بیٹھا انسانی وجود اس کا عکس ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا تو لباس بھی مختلف تھا۔ وہ تو شاید اس پورٹریٹ سے باہر نکلی تھی جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی سب سے حسین تصویر ہے۔ اس کا دل چاہا' وہ اسے چھو کر دیکھے' کیا خبر یہ اس کا وہم ہو۔ پھر وہ رک گئی' ابھی تک کلائی پر اس کی گرفت کا احساس باقی تھا۔

"کون ہو تم؟" بڑی مشکل سے ہمت مجتمع کر کے پوچھا تھا اس نے جس کا جواب ایک تمسخرانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیا گیا۔ "میں تم ہوں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

اس عورت نے اس کی حیرت کا مزا لیتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"ویسے تم اتنی حیران آخر کس وجہ سے ہو؟" بے نیازی سے اپنے ہاتھوں میں پہنی انگوٹھیوں سے کھیلتے ہوئے اس نے طنز کیا "ایسے بن رہی ہو جیسے خود کو پہچانتی ہی نہیں۔۔۔ کبھی آئینہ نہیں دیکھا کیا۔۔۔؟"

اب اس کا وہ بھلا کیا جواب دیتی۔ گونگوں کی طرح ٹکر ٹکر اسے دیکھے گئی۔ اس نے بھی کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کیا' پھر سرسراتی آواز میں گویا ہوئی۔

"مجھے غور سے دیکھو' میں تمہارا حسن ہوں' تم میری پرستش کرتی رہیں۔ تمہاری خواہش ہوں۔ جسے ہمیشہ تم نے مقدم رکھا' میرے آڑے آنے والی ہر رکاوٹ روندتی چلی گئیں۔ اور اب ایسے پیش آرہی ہو جیسے مجھے جانتی ہی نہیں۔" پھر وہ غصے میں غراتی ہوئی بولی "مجھے دیکھ۔ میں تیرا تکبر ہوں۔۔۔"

یہ کہتی وہ اس کے عین مقابل آگئی تو اس نے گھبرا کر پیچھے ہٹنے کے بجائے اسے زوردار دھکا دیا اور عبادت کے مقام سے باہر نکل آئی۔ یہ اس کی بہت بڑی غلطی تھی۔ بے دلی سے ہی سہی قرآن آیات کے ورد نے اس کی حفاظت کی تھی۔ ان سانپوں کو روک رکھا تھا اور ابھی وہ یہ سمجھ کر باہر آئی تھی کہ اپنے تکبر کو پیچھے دھکیل آئی ہے۔ جبکہ حقیقت میں خود اسے حصار پناہ سے باہر پھینک دیا گیا تھا۔۔۔ اب وہ قطعی غیر محفوظ تھی۔

☆ ☆ ☆

اس کا شمار دنیا کے ان چند لوگوں میں ہوتا تھا جن پر خدا ہمیشہ مہربان رہتا ہے۔ مہرز اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا اور دنیا کی ہر نعمت اس کے قدموں میں ڈھیر تھی۔ اس کے باوجود وہ انتہائی منکسرالمزاج اور حلیم طبیعت انسان تھا کیونکہ اس کے ماں باپ پڑھے لکھے اور مہذب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ خود بھی پڑھنے کا شوقین تھا۔ اسکول میں پوزیشن ہولڈر تھا اور انٹر کے بعد اس نے ملک کی مایہ ناز انجینئرنگ یونیورسٹی سے میکنیکل انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی تھی' جس کے بعد اس نے امریکہ میں جاب کے لیے اپلائی کر دیا۔ ماجد خان' اس کے والد پہلے ہی اپنا کاروبار امریکی ریاست کیلی فورنیا منتقل کر چکے تھے اور اس کے مختلف شہروں میں ان کے ڈیپارٹمنٹل اسٹورز تھے۔ اس کے علاوہ بیکرز فیلڈ کنٹری سائیڈ پر ان کے فارمز بھی تھے' جہاں اعلا اقسام کے انگور کاشت کیے جاتے تھے۔ مائیکروسافٹ میں جاب حاصل کرنے کے بعد مہرز باہر چلا گیا۔ ڈیڑھ سال بعد اسے وہ جاب چھوڑنا پڑی۔ روڈ ایکسیڈنٹ میں اس کے والد زخموں کی تاب نہ لا کر انتقال کر گئے تھے۔

ان کی موت کے بعد اسے اپنی جاب اور اپنے کاروبار کے بیچ وقت کی تقسیم میں دقت پیش آنے لگی تو اس نے جاب چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی والدہ کو لے کر اینا ہائم سے بیکرز فیلڈ منتقل ہو گیا۔ اس کے والد نے یہاں بھی ایک گھر خرید رکھا تھا۔ آس پاس کچھ اور مسلمان خاندان بھی آباد تھے جن کے ساتھ جلد ہی مسز ماجد کے اچھے تعلقات استوار ہو گئے۔

اس کے باوجود وہ اپنے شوہر کو بہت یاد کیا کرتی تھیں۔ مہرز نے ان کے ساتھ زیادہ وقت گزارنا شروع کر دیا مگر انہیں اپنے شوہر کے غم نے زیادہ دن جینے نہ دیا۔ ایک سال بعد وہ بھی انتقال کر گئیں اور مہرز اکیلا رہ گیا۔ اپنے اسٹورز کے تمام انتظامات کی دیکھ ریکھ کے لیے اسے آئے دن سفر کرنا پڑتا تھا' کبھی اینا ہائم تو کبھی سان فرانسسکو' کبھی پاساڈینا اور کبھی سان ڈیاگو وہ ہر دم مصروف رہا کرتا تھا۔ بیکرز فیلڈ بہت سرسبز شہر ہے۔ اس کا گھر جس علاقہ میں واقع تھا وہ قدرے اونچائی پر تھا۔ آس پاس بنے گھر ایک ہی لائن میں تھے۔ گھروں کے سامنے خوب صورت لان کے ساتھ سنگی فٹ پاتھ بنا ہوا تھا اور پھر کشادہ سڑک کو پار کرتے ہی گولف گراؤنڈ تھا۔ یہاں کا ماحول انتہائی پرسکون تھا۔ زیادہ شور شرابا اور افراتفری نہیں تھی۔ اس کے والد نے اپنی زندگی میں جیری بٹلر نامی ایک سیاہ فام ادھیڑ عمر آدمی کو ملازم رکھا تھا۔ جو ایک دیانت دار اور مخلص انسان تھا۔ ماجد خان کی مہربانیوں کے صلے میں وہ ہر ممکن طریقے سے انہیں اور ان کے خاندان کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتا تھا۔ مسز ماجد سے خود اصرار کر کے اس نے کچھ پاکستانی ڈشز بھی سیکھ لی تھیں۔ مہرز کے والدین کے انتقال کے بعد بھی اس نے یہ گھر نہیں چھوڑا تھا۔ اب وہ مہرز کا پورا خیال رکھا کرتا تھا۔ خود مہرز بھی جیری پر حد درجہ انحصار کرنے لگا تھا۔ جیری نے کبھی اس کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں وہ گھر کی اچھی طرح حفاظت کیا کرتا

تھا۔

اینا ہائم والا گھر ڈزنی لینڈ سے دس منٹ کی ڈرائیو پر واقع تھا۔ شہر کے اندرونی حصے میں بنا یہ گھر بھی کبھار ہی آباد ہوا کرتا تھا۔ جب مہرز اپنے اسٹور کے انتظامات دیکھنے یہاں آیا کرتا تھا۔ رضا سے دوستی ہو جانے کے بعد اس کے گھر بھی آنا جانا رہنے لگا۔ رضا کے والدین بہت اپنائیت سے ملتے اور اس کی بارہ سالہ چھوٹی بہن عنبر مہرز کو بھائی کہنے اور سمجھنے لگی تھی۔ مہرز اپنے کاموں سے فارغ ہو کر اکثر رضا کے گھر چلا جایا کرتا۔ اگر نہ جاتا تو رضا خود اسے آ کر لے جاتا تھا۔

کل رات مہرز نے عید ملن پارٹی میں جس لڑکی کو دیکھا تھا' وہ اس کی پہلی چاہت تھی۔ وہ پہلی خواہش تھی جو اس کے دل نے کی۔۔۔ وہ پہلی دعا تھی جو اس نے رب سے مانگی تھی۔ پر وہ چاہت اسے مل نہ سکی تھی۔۔۔ وہ خواہش۔۔۔ وہ دعا پوری نہ ہوئی تھی اور یہ کسک آج بھی جان لیوا تھی۔

☆ ☆ ☆

سرد دسمبر کی آخری تین راتیں باقی تھیں۔ اس کے بعد نیا سال شروع ہو گا۔ لیکن مجھے کیا؟؟ اس نے تیزی سے ہاتھ چلائے۔ کیا فرق پڑے گا؟ میری زندگی کون سا تاریخوں کے ساتھ بدلنے والی ہے' جیسی ہے ویسے ہی رہے گی۔ خاصا بے درد خیال تھا جس نے سوجی ہوئی آنکھوں میں پھر سے نمکین پانی بھر دیا۔ اپنی ذات کے اس کمزور پہلو کا انکشاف اسے قدرے ناگوار گزرا' فوراً ہی بازو چہرے پر رگڑ کر آنسوؤں کو صاف کیا۔ "ہونہہ' بلاوجہ رونا آجاتا ہے" اپنے آپ کو کوستی وہ پھر سے برتن دھونے لگی۔

شام سے لگی ہوئی تھی۔ نئے سرے سے سارا کھانا پکانے اور کھلانے کے بعد کچن صاف کرتے کرتے یہ وقت ہو گیا تھا۔ آج وہ خود ہی ذرا سست روی کا شکار تھی ورنہ اتنی دیر بھی نہ لگتی۔ اب تو صرف چمچے باقی رہ گئے تھے۔ انہیں پانی سے دھوتے ہوئے اس کی نظر کھڑکی سے باہر جا رکی۔ تیز ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ باہر اندھیرا ہونے کے سبب کچھ صاف دکھائی تو نہیں دے رہا تھا مگر ہوا کے شور اور درختوں کے جھومتے ہیولے سخت موسم کا احوال سنا رہے تھے۔ آندھی آنے والی تھی۔ اس نے وقت دیکھا۔ بارہ بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ بارہ بجے لائٹ نے چلے جانا تھا۔

"بس یہ تھوڑے سے رہ گئے ہیں' انہیں دھو لوں پھر سو جاؤں گی۔" جانے کس سے مخاطب تھی۔

اور یہ کہہ کر گنگناتی ہوئی دوبارہ کام میں مصروف ہو گئی۔ اس کے پیروں کے اردگرد پانی گر گیا تھا۔ حالانکہ سخت سردی کا موسم تھا مگر اس نے گھر میں رہتے ہوئے کبھی چپل نہیں پہنی تھی' سو اس وقت بھی ننگے پاؤں ہی کھڑی تھی۔ سنگ مرمر کے چکنے فرش پر کھڑے کھڑے پیر برف کی سل کی مانند ٹھوس ہو رہے تھے اور یخ پانی سے برتن دھوتے ہاتھ بھی شل ہو چکے تھے۔ متورم آنکھیں اب نیند کو بلاوے دے رہی تھیں۔ مگر وہ کام کرتی رہی۔

تمام برتن دھو لینے کے بعد انہیں پونچھ کر الماری میں رکھا۔ پھر وائپر سے فرش رگڑنے کے بعد اپنے ہاتھ صابن سے دھو کر انہیں دامن سے پونچھتی ہوئی کچن سے باہر چلی آئی۔ ساری روشنیاں بجھا کر اندھیرے ہال سے گزرتی ہوئی وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اچانک تیز ہواؤں کا شور بڑھ گیا اور ہال کی کھڑکیاں بج اٹھیں۔ اس نے پھرتی سے یکے بعد دیگرے تمام کھڑکیوں کے دھڑدھڑاتے پٹ اچھے طریقے سے مقفل کر دیے۔

وسیع ہال کے وسط میں گھیردار زینے کی سیاہ پتھر کی تیرہ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد سامنے تین کمروں میں سے ایک کمرا گیسٹ روم تھا۔ اس کمرے کی کھڑکیوں کا بند کرنا بھی ضروری تھا۔ اندھیرے کے باوجود وہ تیزی سے زینہ پھلانگتی ہوئی اس مستطیل کمرے تک پہنچ گئی' جس کے فالتو ہونے کی بنا پر شاید رسماً "ان لوگوں" سے منسوب کر دیا گیا تھا جو شاذونادر ہی اس گھر میں آتے تھے۔ قیام کرنا تو دور کی بات ہے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی بنگلے کا خوب صورت لان گیٹ کے ساتھ سڑک اور پھر نہر کا کنارہ بخوبی دکھائی دے رہا تھا کہ پوری دیوار ہی شیشے کی تھی۔ جبکہ دونوں آخری سروں پر ہوا اور خوشبو کی آمد و رفت جاری رکھنے کی غرض سے بنائی گئی دو جالی دار کھڑکیاں نصب تھیں۔ شیشے کے پاس کھڑے ہو کر ابھی ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ بادل زور سے گرجے اور ساتھ ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ وہ دھیمے سے مسکرائی وہیں بیٹھ گئی۔ اسے بارش بہت اچھی لگتی تھی۔

سڑک کے ساتھ بنے فٹ پاتھ سے اتر کر نہر کے کنارے بید مجنوں اور سفیدے کے درختوں کی لمبی قطار تھی۔ بید مجنوں تو حسب عادت اپنے باریک پتوں کی جھالر نہر کے پانی میں ڈبوئے کھڑے تھے۔ پانی کا بہاؤ ہر دم انہیں ساتھ لے جانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ وہ دن میں کئی بار دیکھ چکی تھی' اب رات کے وقت بھی وہی نظارہ تھا مگر رنگوں کی تبدیلی نمایاں تھی۔ سفیدے کے بے شمار قد آور درخت اپنے مضبوط تنے کی طاقت پر نازاں' فقط بالائی حصے ہوا کا ساتھ دیتے برابر جھوم رہے تھے۔ بڑھتی بارش کے ساتھ مٹی کی سوندھی خوشبو ہوا میں شامل ہونے لگی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اس بھیگی رات کا حصہ بن گئی۔

لیمپ پوسٹ کی روشنی میں نظر آتی شیالی سڑک دھل دھلا کر سیاہ رنگت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس نے شاید ارتکاز— کی غرض سے بائیں آنکھ کو انگلی کی پور سے بند کیا اور پھر کھلی آنکھ سے سڑک پر گرتی بارش کے قطروں کا بغور جائزہ لینے لگی۔ پھر اس کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ یہ عام پانی کے معمولی قطرے نہ تھے زمین کو ستاروں کی دید سے محروم رکھے جانے پر آسمان کا اظہار برہمی تھا کہ بادلوں کا سینہ چیر کر بہ قوت زمین کی طرف پھینکے جانے والے ستارے پاش پاش ہو رہے تھے— نہیں— تو پھر ہیرے ہوں گے تب ہی اس قدر جگمگا رہے ہیں— ورنہ بارش کے پانی میں اتنی چمک کیسے ہو سکتی ہے کہ آنکھوں میں چبھنے لگے اور شاید انہی ان گنت ہیروں کے چکنا چور ٹکڑے اڑ کر آنکھ میں چبھے تھے کہ اس نے فوراً" آنکھ میچ لی— درد سا ہو رہا تھا۔

وہ کچھ پل یونہی آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی۔ پھر جیسے ہی دوبارہ آنکھیں کھولیں' لائٹ چلی گئی۔ سڑک اندھیری ہو گئی۔ اب صرف پانی کی آواز تھی۔ ہیروں کی چمک نظر سے اوجھل ہو چکی تھی۔ کمرے میں پہلے ہی اندھیرا تھا اور ویسے بھی اسے ڈر نہیں لگتا تھا— مگر نہیں شاید صرف اس کمرے میں ڈر نہیں لگتا تھا' اسے ورنہ ویسے تو وہ ہر دم بس خوفزدہ ہی رہا کرتی تھی۔ یہ کمرا صرف انتہائی ضروری فرنیچر سے آراستہ تھا۔ ایک بیڈ اور ٹیبل کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اسی لیے بطور گوشہ عافیت اس نے اس جگہ کا انتخاب کر رکھا تھا کہ یہ سادہ سا کمرا اس عالی شان گھر سے اتنا مختلف تھا کہ اس کا حصہ ہی نہیں لگتا تھا۔

دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ اس کمرے سے دکھائی دینے والے منظر نے آسمان و زمین کی وسعتوں کو اس کی دسترس میں دے رکھا تھا۔ باوجود اس کے کہ زمین ہر گو تنگ تھی اس کے لیے اور آسمان کھلا مگر جو بھی تھا غنیمت تھا۔

لائٹ چلے جانے کے کچھ لمحوں بعد تک تو سب کچھ غیر واضح تھا پھر جب آہستہ آہستہ آنکھوں کو اندھیرے سے انسیت ہوئی تو بیرونی منظر اپنی جزئیات سمیت قدرے با معنی نظر آئے۔ رات بالکل سیاہ بھی نہ رہی تھی۔ شاید بادلوں کے سبب جن کی عجیب سرمئی سی روشنی نے تاحد نگاہ آسمان کا احاطہ کر رکھا تھا کہ زمینی اجسام بھی وجود کھونے کے بجائے فقط سایوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ بارش ابھی تک ہو رہی تھی۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ تھوڑی بہت بجلی چمک جاتی تو لمحہ بھر کو نظر چندھیا جاتی اور پھر دوبارہ وہی سرمئی اجسام—

مسلسل بارش نے خنکی میں خاطر خواہ اضافہ کیا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر تو پہلے ہی ٹھنڈے برف ہو رہے تھے مگر زمین پر اتنی دیر تک بیٹھے رہنے کے باعث اب ریڑھ کی ہڈی میں بھی درد ہو رہا تھا۔ وہ کپکپاتے بدن

باہوں میں سمیٹتی آہستگی سے اٹھی اور بستر پر رکھا کمبل اٹھا کر اپنے گرد اچھی طرح سے لپیٹ کر دوبارہ قالین پر بیٹھ کر بارش دیکھنے لگی جواب ترچھی ہو کر شیشے سے ٹکرا رہی تھی۔ اس نے اپنا رخسار کانچ کی دیوار سے اس قدر نزدیک کر لیا کہ ٹھنڈک اور نمی سے چہرہ تر ہونے لگا۔

اتنی کڑاکے کی سردی میں وہ بارش میں بھیگنے کا رسک تو نہیں لے سکتی تھی۔ مرنے کی خواہش رکھنے کے باوجود خودکشی کی ہمت نہیں تھی اس میں اور وہ مرنا کیوں چاہتی ہے..... اپنے دل کے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ منتظر نگاہوں سے آسمان کی جانب دیکھنے لگی۔ جیسے جواب وہاں سے ملنے والا ہو..... ہمیشہ کی طرح آج بھی امید باندھے بیٹھی تھی کہ شاید وہ دیکھ پائے گی۔

خواہش اوقات سے کہیں بڑھ کر تھی۔ آگے پیچھے بہت سے لمحے سرک گئے اور نظر اس کی طرف ناکام پلٹ آئی۔

"آج بھی کوئی معجزہ رونما نہیں ہوا۔" طنزیہ ہنسی خود کو بے عزت کرنے کے لیے تھی۔ تب ہی سرگوشی سنائی دی۔

"کوئی بات نہیں، تم نہ سہی پر وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے اور وہ جانتا ہے کہ تم بے قصور ہو....."

آواز دل کے پاس سے ہی ابھری تھی، شاید اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے مگر ضمیر اس تسلی دینے والے بحث پر آمادہ نظر آتا تھا۔

"نہیں، غلطی میری ہی تھی۔ میں نے انہیں غصہ نہ دلایا ہوتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا....." پر وہ یہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ کوئی نہ کوئی وجہ مل ہی جاتی تھی انہیں، چاہے وہ کچھ کہتی یا پھر چپ رہتی۔

اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا..... باقی ماندہ جسم کی چوٹیں ہمیشہ سے قابل برداشت تھیں۔ کام کرنے کی عادت کی وجہ سے جسم کو سختی سہہ جانے کی عادت ہو چکی تھی۔ اس لیے زیادہ دقت نہیں ہوتی تھی لیکن زہر بھرے جملے ہر شب سیاہ ناگ کا روپ دھار..... کے

اسے ہراساں کرتے تھے۔ ابھی بھی اس کا آدھا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ کیا وجہ تھی؟ آج کا واقعہ اتنا غیر معمولی تو نہ تھا کہ پانچ گھنٹے گزر جانے کے باوجود درد کا احساس باقی ہے۔ وہ سوچ میں ڈوبی تھی۔

پھر کچھ اس دل کو بے قراری ہے
سینہ جو یائے زخم کاری ہے

وہ دھیمے سروں میں گنگنانے لگی۔ بارش کے قطرے ساز موسیقی چھیڑ رہے تھے۔

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

اسے معلوم بھی نہ ہو سکا اور آنسو اس کے چہرے پر پھسلتے چلے گئے۔ آج شاید رو کر ہی دل ہلکا ہونا تھا۔ ورنہ اکثر تو گیت ہی مرہم بن جایا کرتے تھے۔ اشعار کی محفل میں ہر خیال مجسم صورت اس کے سامنے آ موجود ہوتا۔ درد ہو یا امید وہ اپنے جذبات کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر رات بسر کرتے اکثر اس خالی کمرے میں آ جایا کرتی تھی۔ اس کا اپنا کمرا..... صرف صبح کے لیے تھا، ہر نئے دن کی شروعات وہیں سے ہوا کرتی تھی مگر رات..... کو وہ یہاں بیٹھ کر اپنے آپ سے باتیں کرتی تھی۔ پھر اسے کسی اور کی موجودگی کا بھرپور احساس ہونے لگا۔ کوئی اور بھی ہے، جو رات کے اس پہر اس کی تنہائی میں شریک ہے اور جو کچھ بھی وہ سوچ رہی ہے، کہہ رہی ہے..... اسے نہایت توجہ سے سن رہا ہے۔ اس لیے اب ہمیشہ وہ اسی سے مخاطب ہوتی اور اپنے تمام دکھ درد کہہ دیتی۔ حالانکہ وہ سب کچھ جانتا تھا، پھر بھی وہ کہتی رہتی۔ ہنستے روتے گیت گاتے اپنے دل کی ہر بات اسے بتاتی۔ اب بھی ہولے سے گنگناتے ہوئے وہ اپنے بالوں کی چوٹی کھولنے لگی۔

ہلکے ہاتھ سے بل کھولتے ہوئے اس نے اپنی انگلیوں سے گردن کو بھی سہلایا۔ درد کو تھوڑا آرام ملا تو وہ بار بار یہ عمل دہرانے لگی۔ تب ہی اس کے ہاتھ اکھڑے ہوئے ڈھیر بالوں کے گچھے میں الجھ کر رہ گئے۔ وہ حیرت سے اپنے ہاتھ میں آئے ٹوٹے بالوں کو دیکھنے لگی۔

"او تو اس لیے اتنی تکلیف ہو رہی تھی۔"

شام کو کیا ہوا تھا؟ اسے یاد آنے لگا۔ جب ان کی ہر بات سے اختلاف کرتی وہ اٹھ کر جانے لگی تو انہوں نے اس کے بالوں سے پکڑ کر اسے واپس اپنی طرف کھینچا تھا۔ اس کی چیخ نے انہیں اس کی تکلیف کا احساس دلایا تو پھر انہوں نے اس کے بالوں کو چھوڑا ہی نہیں۔ اسی طرح سر کو خوب جھٹکے دے کر چہرے پر ربڑ کی چپل مارتے ہوئے اسے بلبلاتے دیکھ کر انہیں تسکین ہو رہی تھی۔ جتنی تکلیف وہ انہیں دیا کرتی تھی، اس سے کہیں زیادہ سزا دی تھی اسے۔ ساتھ کے ساتھ ساتھ زبان بھی شعلے اگل رہی تھی۔

"کمینی، ذلیل..... زبان چلاتی ہے آگے سے..... دیکھ اب کیا بولے گی بول؟" منہ پر چپل مارتے ہوئے بار بار اس سے یہی کہا جا رہا تھا۔ ہر مزاحمت چھوڑ کر وہیں کھڑی وہ مار کھاتی رہی۔ اب تو کوئی بچانے والا نہ رہا تھا۔ انہیں روکنے والے ہاتھ منوں مٹی تلے دب چکے تھے۔

خوب مار چکنے کے بعد بالآخر تھک کر انہوں نے اس کی جان چھوڑ دی اور کھانا لانے کے لیے کہا۔ وہ اپنے آنسو پونچھتی کچن میں چلی آئی۔ شام سات بجے سے رات بارہ بجے تک وہ کام کرتی رہی تھی۔ ہر روز اسی طرح کام میں خود کو الجھا کر اپنا وقت گزارنا آسان تھا۔ مار تو وہ اتنے عرصے سے کھاتی آ رہی تھی کہ جسم ہر درد سے عاری ہو چکا تھا۔ مگر وہ ان گالیوں اور کوسنوں کا کیا کرتی، جو اس کا دل چھلنی کر دیا کرتی تھیں۔ اب بھی اس نے گڑگڑا کر اپنی موت کی دعا مانگی تھی۔

"یا اللہ! مجھے اس تکلیف دہ زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات دے دے۔ اب اس قید سے آزاد کر دے مجھے....."

اور اس رات اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ دعا قبول کر لی تھی۔

☆ ☆ ☆

مہرز خاموشی سے اپنے مشروب کے گھونٹ بھرتے ہوئے کسی سوچ میں گم تھا۔ رضا کے گھر عید ملن پارٹی تھی۔ مسلم کمیونٹی کے بہت سے لوگ شریک تھے۔ دیار غیر میں اپنوں کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ اس محرومی کے ازالہ کے طور پر تمام پاکستانی آپس میں دیرینہ تعلقات بنائے رکھتے ہیں۔ مل جل کر ون ڈش پارٹیز کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ کبھی باربی کیو، کبھی سمندر کے کنارے پکنکس تو کبھی عید ملن۔ یوں کیلی فورنیا میں ہوتے ہوئے بھلے کچھ دیر کے لیے ہی سہی ہم اپنے آپ کو پاکستان میں محسوس کرتے ہیں۔

رضا اور مہرز کی دوستی محض ایک اتفاق تھی۔ رضا نے نئی نئی ڈرائیونگ شروع کی تھی اور بے دھیانی میں مہرز کی پارک شدہ اسپورٹس کار کو زوردار ٹکر دے ماری تھی۔ مہرز اپنی کار سے کچھ قدم کے فاصلے پر ہی موجود تھا۔

رضا اس کی کار کو ٹکر مارنے کے بعد حواس باختہ ہو کر اپنی کار سے باہر نکلا اور منہ کھول کر ہنستے ہوئے مہرز کو دیکھنے لگا۔ اس کی کار کی پچھلی لائٹ توڑ دینے کے بعد وہ مہرز سے زبردست گھونسے کی توقع کر رہا تھا لیکن وہ

"آئم سوری میں نے....." رضا نے منمنا کر معافی مانگنی چاہی تو مہرز نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔ پھر بمشکل اپنی ہنسی روک کر اس سے گویا ہوا۔

"اٹس اوکے! یہ لائٹ خراب ہو چکی تھی۔ کل ہی میں اپنی کار کو مکینک کے پاس لے جانے کا سوچ رہا تھا۔ کوئی بات نہیں..... آج لے جاؤں گا..... آپ پلیز اتنا شرمندہ نہ ہوں۔ اٹس اوکے۔"

اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے رضا کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ آج ان کی دوستی کو تین سال ہو چکے تھے۔ مہرز کے والد کے انتقال کے بعد جب وہ دنیا سے بالکل کٹ کر رہ گیا تھا۔ رضا نے زبردستی اسے اپنے ساتھ ان ہی پارٹیز میں لانا شروع کیا تھا۔

لذیذ پاکستانی کھانوں کے ساتھ محفل موسیقی..... یہ

دونوں باتیں رضا کے حوالے سے بہت مشہور تھیں۔ اسے آئے دن ایسی تقاریب منعقد کرنے کا بے حد شوق تھا۔ اس کے بہت سے دوست تھے۔ جبکہ مہرز کا حلقہ دوستی محدود تھا۔ ایک حسن تھا' جو لاہور میں رہتا تھا لیکن انٹرنیٹ کے ذریعے رابطے میں رہا کرتا تھا۔ دوسرا دوست رضا' اپٹاہائم میں رہائش پذیر تھا۔ اس کے اصرار پر مہرز اس کی زیادہ تر تقریبوں میں شرکت کرتا تھا۔ جس کی اہم وجہ رضا کی بے لوث دوستی کے ساتھ ساتھ محفل موسیقی بھی تھی۔

آج عید ملن پارٹی کی وجہ سے لوگ بھی کافی زیادہ تھے اور رضا اسے وقت نہیں دے پا رہا تھا مہرز بیکرز فیلڈ سے رش آورز میں ڈرائیو کرنے کے باعث تین گھنٹوں میں اپٹاہائم پہنچا تھا۔ اگلے دن ہفتہ تھا۔ اس کا ارادہ اتوار کی شام تک اپٹاہائم میں موجود اپنے گھر میں گزارنے کا تھا۔ کچھ گھنٹوں کے لیے اسے اپنے اسٹورز کا حساب کتاب چیک کرنے بھی جانا تھا۔ قریباً" ہر ہفتے ہی اس کا اپٹاہائم چکر لگا کرتا تھا اور ویک اینڈ اسی طرح تھوڑا کام اور تھوڑا آرام کرنے میں گزر جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اگلے دن کے معمولات کے بارے میں سوچتا ہوا آہستہ آہستہ اپنا مشروب ختم کر رہا تھا۔ تب ہی نگاہ ایک لڑکی پر جم کر رہ گئی۔

وہ لڑکی اپنی گود میں ایک ڈیڑھ سال کی بچی کو لیے بیٹھی تھی اور اسے کوئی نظم گا کر سنا رہی تھی۔ بچی بے حد خوب صورت تھی اور اس لڑکی سے کافی مشابہت رکھتی تھی۔ بس دونوں کی آنکھوں کا رنگ مختلف تھا۔ اس بچی کی آنکھیں نیلی تھیں جبکہ اس لڑکی کی ہلکی بھوری شہد رنگ چمک دار آنکھیں تھیں لیکن معصومیت دونوں چہروں پر یکساں تھی۔

"بالکل وہی چہرہ۔۔۔ ذرا سا بھی فرق نہیں ہے۔" مہرز کی نگاہوں کا مرکز وہ لڑکی تھی۔ باقی سب کچھ جیسے پس منظر میں چلا گیا تھا۔ اس کی نگاہ کی مستقل تپش سے چونک کر لڑکی نے ادھر ادھر دیکھا۔ مہرز جیسے یکدم ہوش میں آ گیا۔ وہ خود کو ہرگز اس کے سامنے نہیں لانا چاہتا تھا۔ انتہائی غیر محسوس انداز میں وہ چند قدم پیچھے ہٹا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔

غزل پروگرام شروع کرواتے ہوئے رضا کی نگاہیں مہرز کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ ایسا نہ کرتا۔ اگر جانتا ہوتا کہ مہرز ایک گھنٹہ پہلے ہی وہاں سے جا چکا ہے۔

رات کو رضا نے اس کے سیل پر بار بار کال کی لیکن اس نے ریسیو نہیں کی تھی۔

اگلی صبح جب وہ سو کر اٹھا تو کچھ دیر بستر میں ہی لیٹا رہا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ذہن بار بار اس لڑکی کو سوچ رہا تھا۔

"مجھے اپنے آپ کو سنبھالنا ہوگا۔" خود کو سرزنش کرتا وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور باتھ روم میں جا کر چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ آئینے میں اپنی سرخ آنکھوں کو دیکھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ پوری رات کتنی بے چین نیند سویا ہے۔ سر بھاری ہو رہا تھا اور جسم بے تحاشا ست۔۔۔ وہ تو یہاں آرام کرنے آتا تھا۔ رت جگے منانے نہیں۔

دوبارہ اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے پکا ارادہ کیا تھا کہ وہ اب اس لڑکی کے بارے میں نہیں سوچے گا۔

☆ ☆ ☆

سر پر تیز چمکتے ہوئے' آگ برساتے سورج کی تپش تھی اور تاحد نظر پھیلا ہوا ویران صحرا آنکھوں کے سامنے تھا۔ جس کی جلتی بھنتی ریت پر چلتے چلتے اس کے پاؤں آبلوں سے بھر گئے تھے۔ ریت میں دھنسے ہوئے قدم اٹھانا بے حد دشوار تھا۔۔۔ وہ پھر بھی چلتی رہی۔

اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے چہرے کی کھال جھلس چکی ہے اور ہونٹوں پر پپڑیاں جم رہی ہیں۔ پیاس کے مارے برا حال تھا مگر وہ رکی نہیں۔ شاید کوئی سایہ نظر آئے' اس نے سوچا اور سائے کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں مگر دور دور تک بس صحرا تھا اور کچھ نہیں۔

اس نے پھر دیکھا تو اس بار اسے پانی نظر آ گیا۔ وہ بے اختیار مسکرائی تو خشک ہونٹوں نے پھٹ کر خون جاری کر دیا۔ وہ بمشکل اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر نظر آتے پانی کی سمت میں بھاگنے لگی۔ گرتی پڑتی وہ پانی تک پہنچنے کی کوشش میں ہلکان ہوئی جا رہی تھی اور پانی تھا کہ اس سے نزدیک ہونے کے بجائے مسلسل دوری بڑھاتا چلا جا رہا تھا۔ وہ رک گئی۔

بھاگتے بھاگتے اس کا سانس پھول چکا تھا۔ حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا اور جسم خشک لکڑی کی مانند چٹخنے لگا تھا۔ اس نے ہاتھوں کا چھجا بنا کر پانی کی طرف دیکھا اور مایوس ہو کر ہاتھ نیچے کر لیے۔ وہ سراب تھا' چمکتا ریتا۔ جسے پیاسا دور سے دیکھے تو پانی سمجھے۔ اس نے بھی یہی غلطی کی تھی۔ انتہائی مایوسی کے عالم میں وہ تھک ہار کر وہیں بیٹھ گئی۔ کھولتی ریت اس کا بدن جھلسا رہی تھی۔ پر اب اسے کوئی پروا نہیں تھی۔۔۔ آگے جانا اس کے بس میں نہیں تھا۔ اب وہ اور نہیں چل سکتی تھی۔

گرم سانسیں تیزی سے اندر باہر آ جا رہی تھیں۔ اسے اپنی بے بسی پر رونا آنے لگا لیکن باوجود کوشش کے آنکھوں سے کوئی آنسو نہیں ٹپکا تھا۔ وہ بھی خشک ہو چکی تھیں۔ بے بسی کے شدید احساس سے مغلوب ہو کر وہ دیوانوں کی طرح ہنسنے لگی اور ہنستی چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

مہرز کا سیل وائبریشن پر تھا' کئی بار تکیے کے نیچے لرزش ہوئی مگر وہ اتنی گہری نیند میں تھا کہ اسے احساس نہ ہوا۔ رضا کا پریشان ہو جانا فطری تھا۔ دوپہر کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔ اس نے فوراً" مہرز کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس کے بستر سے اتر کر آدھ مندی آنکھوں سے دروازہ کھولنے تک رضا نے بیل پر مزید دو ہاتھ دے مارے۔

"آ رہا ہوں یار!" وہ جانتا تھا کہ رضا کے علاوہ اور کوئی ہو نہیں سکتا تھا۔ دروازہ کھولنے کے بعد مہرز نے کسلمندی سے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

"گڈ مارننگ رضا۔۔۔" اس سے خفا ہونے کے باوجود رضا کو ہنسی آ گئی۔ "جناب گڈ مارننگ صاحبہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے رخصت ہو چکیں۔۔۔ وہ سپہر ہو رہی ہے۔"

"اچھا مجھے وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔۔۔"

رضا نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھا تھا اور دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو سہلا رہا تھا۔

"تم کسی وجہ سے ڈپریس ہو؟" وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"ہوں۔۔۔" مہرز نے چونک کر سر اٹھایا۔ رضا کے چہرے پر فکر کی لکیریں دیکھ کر اس کی تسلی کے لیے تھوڑا سا مسکرا کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا "نہیں تو۔۔۔ ڈپریشن کیسا؟"

"پھر رات کو اس طرح بغیر بتائے کہاں چلے گئے تھے۔۔۔؟"

رضا اس کا بہت اچھا دوست ہونے کے باوجود اس کے ماضی سے واقف نہیں تھا۔ مہرز نے سختی سے لب بھینچ کر خود کو کچھ بھی کہنے سے روک لیا۔ رضا نے کچھ لمحوں تک اس کے جواب کا انتظار کیا لیکن اس کی طویل خاموشی نے اسے سمجھا دیا۔

"تم بتانا نہیں چاہتے تو رہنے دو۔۔۔ میں اصرار نہیں کروں گا۔ مجھے تو صرف تمہاری خیریت نیک مطلوب ہے۔"

مہرز اس کی بات سن کر بے ساختہ ہنس پڑا۔ "تم کیا مجھے خط لکھ رہے ہو؟"

رضا اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے سامنے اپنا ہاتھ بڑھا کر کہنے لگا۔ "اٹھو منہ ہاتھ دھو شیو کرو' شاور لو' جو کرنا ہے جلدی سے کرو' ماما نے کھانا بھیجا ہے کھا کر چلیں گے۔"

مہرز نے ابرو اچکائے۔ "کہاں؟"

"Toysrus۔ مجھے عنبر کے لیے گفٹ لینا ہے۔" رضا نے اپنی چھوٹی بہن کا نام لیا۔ "اس کا برتھ ڈے ہے کل۔۔۔"

"اوہ۔۔۔ سوری میں بھول گیا تھا۔" مہرز نے بے

اختیار اپنا سر پیٹ لیا۔
"کوئی بات نہیں..... ہم بس گھر پر ہی سیلبریٹ کر رہے ہیں فیملی کے ساتھ بس ہم ہی ہوں گے....."
"پھر بھی میں ہمیشہ اسے گفٹ تو دیتا ہوں نا.... مجھے یاد رکھنا چاہیے تھا۔" اس نے رضا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں ٹوائزرس جا رہے تھے۔ رضا کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو کر مہرز رات والی لڑکی کو بالکل بھول چکا تھا۔ ہفتہ بھر کی تھکن اتر چکی تھی۔ گہری نیند لینے سے طبیعت پر اچھا اثر پڑا تھا۔

رضا، مہرز کی اسپورٹس کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ جب وہ پارکنگ لاٹ میں پہنچا تو مہرز نے ہنستے ہوئے اسے تنبیہہ کی۔
"یہاں کسی گاڑی کو مت ٹھونک دینا۔"

رضا بھی وہ دن یاد کر کے ہنس پڑا۔ "مجھے آج تک اس بات پر حیرانی ہے کہ تم نے غصہ میں آ کر میرا منہ کیوں نہیں توڑ دیا۔ تمہاری نئی اسپورٹس کار کی لائٹ توڑی تھی میں نے اور تم ہنس کر مجھ سے ہاتھ ملانے لگے تھے کیوں؟"

"مجھے تمہاری شکل دیکھ کر ہنسی آئی تھی۔ ویسے بھی مجھے کسی کو اس طرح شرمندہ کرنا اچھا نہیں لگتا۔ جو پہلے ہی اپنی غلطی پر نادم ہو اس سے کیا کہا جائے ... سو میں نے تمہیں ریلیکس کرنے کے لیے تم سے ہاتھ ملا لیا۔" پھر وہ رضا کو چھیڑتے ہوئے بولا۔ "اور ہاتھ ملا کر آج تک پچھتا رہا ہوں۔ چھوڑو میرا پیچھا۔"

"اب بھی نہیں..... اب اترو۔" کار پارک کرنے کے بعد رضا نے اسے اترنے کے لیے کہا۔ مہرز جیسے ہی کار سے باہر آیا۔ ایک اور گاڑی پارکنگ لاٹ میں داخل ہوئی۔ ٹوائزرس میں کچھ دیر گھومنے کے بعد مہرز کو احساس ہوا کہ ایک شخص اور بھی ہے جس سے وہ پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ گیارہ سال بعد بھی نہیں.....

☼ ☼ ☼

یا خوف سے درگزریں یا جاں سے گزر جائیں
مرنا ہے کہ جینا ہے، اک بات ٹھہر جائے

وہ اپنے کمرے میں چھپی بیٹھی تھی۔ اسٹڈی ٹیبل کے نیچے گھس کر اس نے کرسی کو ممکنہ حد تک اندر کھینچ رکھا تھا۔ اس کے خیال میں یہ سب کی نظروں سے محفوظ رہنے کے لیے بہترین جگہ تھی۔ مگر دل اب بھی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ آخر کیوں؟ اس نے اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ایک گہرا سانس اندر کھینچا تو فضا میں بکھری کافور اور اگربتی کی مہک سمٹ کر اس کی سانس میں شامل ہو گئی۔ اک خوف سا رگ و پے میں سمانے لگا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں نے ایسا تو نہیں چاہا تھا ... اب میں کیا کروں؟"

ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اسے قرآن پاک کی تلاوت سنائی دینے لگی۔ نہ جانے کون تھا جو سورۂ یاسین قرآت سے پڑھ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کرسی کو آگے دھکیلا اور گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی میز کے نیچے سے نکل آئی۔ پھر اسی انداز سے چلتی ہوئی دروازے کے قریب پہنچی اور کی ہول سے باہر جھانکا۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔

"اتنے سارے لوگ کیوں آ گئے ہیں ہمارے گھر میں.... میں نے تو بس تایا جان کو فون کیا تھا۔" وہ ڈر کے مارے وہیں دروازے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور دانتوں سے ناخن چبانے لگی۔ عجیب سے ہول اٹھ رہے تھے۔ نہ سانس قابو میں آ رہی تھی نہ ہی دل کی دھڑکن۔

یکدم وہ اچھل پڑی.... دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔

"دروازہ کھولو رامین...." آواز مانوس معلوم ہوئی تو ہمت مجتمع کر کے اٹھی اور دروازہ کھول دیا مگر دروازہ کھولتے ہی اس کی نگاہ ارد گرد کھڑے لوگوں کو نظر انداز کرتی ہال کے بیچوں بیچ اپنی ماں پر جا رکی۔ اسے حیرت ہوئی۔

"یہ اس طرح سب کے بیچ میں کیوں لیٹی ہوئی ہیں؟ اور یہ سفید کپڑے پہلے تو نہیں تھے ان کے پاس۔"

وہ سوچ میں گم میت کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ پھر کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے اپنے آس پاس نظر دوڑائی۔ کمرے کے دروازے کے ساتھ ہی اس کی دونوں پھوپھیاں کھڑی تھیں اور وہ دونوں روتے ہوئے اس سے کچھ کہہ رہی تھیں لیکن وہ ان کی بات سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس قدر شور تھا کہ ہر لفظ نے اپنے معانی کھو دیے تھے۔ وہ سب کو دیکھ تو سکتی تھی مگر سن نہیں سکتی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک شیشے کی چار دیواری میں قید ہے، جس کے باہر ہونٹ ہلاتی مورتیاں کھڑی ہیں۔

پھر کسی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ اس کی بڑی پھپھو آمنہ بیگم تھیں، جو اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے اسے میت کے قریب لے کر جا رہی تھیں۔ وہ کسی معمول کی طرح خاموشی سے ان کے ساتھ چلتی ہوئی اپنی ماں کے قریب پہنچ گئی پر جیسے ہی اس کی نظر اپنی ماں کے چہرے پر پڑی وہ بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔ اور مڑ کر اپنے کمرے میں واپس جانے لگی۔ آمنہ نے اسے روکنے کی کوشش کی تو اس نے بھرپور مزاحمت کرتے ہوئے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ آمنہ بیگم نے دوبارہ انتہائی سختی سے اس کا بازو پکڑ کر کہا۔

"نہیں....!" تو وہ ان کی منت پر اتر آئی۔

"پلیز پھپھو! مجھے جانے دیں...." اس کی خوف زدہ ہرنی جیسی آنکھیں دیکھ کر آمنہ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اسی دم وہ بھاگتی ہوئی دوبارہ اپنے کمرے میں واپس چلی گئی۔

لیکن اس دفعہ اس نے کمرے کا دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ قدسیہ نے آمنہ بیگم کو اشارہ کیا اور دونوں بہنیں مل کر اس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ فرش پر بیڈ سائیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی اور اس کا سانس بے ترتیب ہو رہا تھا۔

آمنہ بیگم نے غور سے اسے دیکھا تو ان کا دل بھر آیا۔ اس کا حلیہ بے حد خراب ہو رہا تھا۔ کپڑے انتہائی میلے، جن پر جابجا چکنائی کے بڑے بڑے دھبے صاف نظر آ رہے تھے۔ پیر کالے سیاہ اور ایڑیاں پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ بے حد کمزور ہو گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، سوکھے ہونٹ الجھے بال اور چہرے پر خوف کی پرچھائیں۔

"کتنی پیاری ہوا کرتی تھی اور اب.... کیا حال ہو گیا ہے اس کا.... ہمیں اسے بھابھی کے پاس نہیں چھوڑنا چاہیے تھا...." انہیں پچھتاووں نے گھیر لیا۔ وہ بھاری قدموں سے چلتی ہوئی اس کے پاس آئیں۔ انہیں نزدیک آتا دیکھ اس نے اپنے پاؤں سمیٹ لیے اور گھٹنوں پر سر رکھ کر اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپا لیا۔ وہ آہستگی سے اس کے پاس بیٹھ گئیں، پھر پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

"رامین.... گڑیا باہر آ جاؤ...."

"نہیں...." اس نے ان کی بات ماننے سے فوراً انکار کر دیا۔ "اگر میں باہر گئی تو...." وہ کہتے کہتے رک گئی۔ آمنہ بیگم کے عقب میں قدسیہ پھپھو کو دیکھ کر اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ پھر کچھ سوچ کر وہ آمنہ بیگم کے نزدیک ہو کر ان کے کان میں کچھ کہنے لگی۔ قدسیہ کو اس کی حرکت سے الجھن ہونے لگی۔ آخر ایسی کیا بات تھی، جو وہ ان کے سامنے کہنے سے اجتناب کر رہی تھی۔ وہ ان دونوں کے نزدیک ہی بیٹھ گئیں۔ آمنہ بیگم نے اس کی سرگوشی کے جواب میں ترحم آمیز نظروں سے اس کی جانب دیکھا اور بولیں۔

"تم گھبراؤ مت۔ وہ اب تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتیں۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ وہ مر چکی ہیں...." انہوں نے بہت مشکل سے کہا۔ رامین کا دل ایک لمحے کو سکڑ کر سمٹ سا گیا۔

"مر چکی ہیں؟" اسے یقین نہیں آیا تھا۔

"نہیں پھپھو! میں نے ابھی دیکھا ہے، ان کی آنکھیں ذرا سی کھلی ہوئی ہیں۔ وہ ایسے ہی سوتی ہیں۔ آپ پلیز انہیں اٹھائیں جا کر...." آمنہ بیگم نے نفی میں سر ہلایا تو وہ انہیں قائل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"جائیں پھپھو.... جا کر دیکھیں نا.... میں صحیح کہہ رہی ہوں.... وہ سو رہی ہوں گی۔ وہ مر نہیں سکتیں۔ ابھی تو میں زندہ ہوں۔ انہوں نے کہا تھا وہ مجھے مار کر مریں گی۔ پھر اکیلی کیسے مر گئیں....؟" وہ بری طرح ان کا کندھا پکڑ کر انہیں جھنجھوڑ رہی تھی۔ آمنہ بیگم نے کوئی بھی جواب دیے بغیر اپنے لب کس کر بھینچ لیے اور دوسری طرف دیکھنے لگیں۔ ان سے مایوس ہو کر رامین خود ہی اٹھی اور بھاگتی ہوئی میت کے پاس پہنچ کر اپنی مری ہوئی ماں کو جھنجھوڑنے لگی۔ "اٹھ جائیں پلیز.... اٹھیں نا ماما.... یہ لوگ کہہ رہے ہیں آپ مر گئی ہیں...." اس کے لاکھ جگانے پر بھی اس کی ماں نے کوئی حرکت نہ کی۔ اس کی ماں کی رشتہ دار عورتوں نے زبردستی پکڑ کر اسے پیچھے ہٹایا۔ ایک بولی۔

"لگتا ہے اس کا دماغ الٹ گیا ہے.... صدمہ بھی تو گہرا ہے۔" دوسری عورت نے تاسف سے سرہلاتے اسے تسلی دیتے ہوئے بٹھانے کی کوشش کی۔

"حوصلہ کرو بیٹے.... اپنی ماں دی مغفرت لئی دعا کر.... جان والے نوں اساں موڑ کر نئیں لا سکدے۔"

"ارے عصر کا وقت نکلا جا رہا ہے.... آخری بار اسے اس کی ماں کا چہرہ دکھا دو...." نہ جانے کس کی آواز آئی تھی۔ پھر وہی عورت جو پہلے اسے زبردستی بٹھانے پر مصر تھی، اب اٹھانا چاہ رہی تھی۔

"چل آ جا.... اخیر واری اپنی سوہنی ماں دا مکھ دیکھ لے...." مگر رامین اٹھنے کے بجائے وہیں جم کر بیٹھی رہی۔

"اس کا مطلب ہے.... ماما سچ مچ مر چکی ہیں.... اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ مجھے ان کے مرنے کا دکھ ہے۔" وہ باری باری سب کی روتی شکلیں دیکھنے لگی۔ روتے ہوئے لوگ کتنی عجیب سی شکلیں بناتے ہیں.... وہ ایک ایک کی شکل دیکھتی سوچ رہی تھی اور پھر طیبہ خالہ کی شکل دیکھ کر تو وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

رونے والے اپنا رونا بھول کر حیرت سے اسے تکنے لگے۔ ان کے بدلتے تاثرات نے اسے کھل کر ہنسنے پر مجبور کر دیا.... اور وہ بے تحاشا قہقہے لگا کر ہنستی ہی چلی گئی۔

اس کا خواب سچ ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

جس کی ایک جھلک نے پوری رات اسے بے چین رکھا تھا، وہ لڑکی پھر اس کے سامنے تھی۔ مہریز ایک شیلف کے سامنے کھڑا تھا، جب اس کی نظر بل کھاتی اس لڑکی پر جا رکی۔ اس وقت بھی وہی چھوٹی بچی اس کے ہمراہ تھی۔ رضا اپنی شاپنگ مکمل کر چکا تھا، اس نے مہریز کو دیکھ کر اشارہ کیا تو اس نے جواباً ہاتھ کے اشارے سے پانچ منٹ میں آنے کا کہا اور شیلف کی اوٹ میں ہو گیا۔ اس لڑکی کے اسٹور سے باہر نکلتے ہی مہریز شیلف کے پیچھے سے نکلا اور بے منٹ کاؤنٹر پر جا کھڑا ہوا۔ عنبر کو دینے کے لیے اس نے ایک باربی فراری کار پسند کی تھی۔ اسے گفٹ پیک کروانے کے بعد اس نے اپنا والٹ کھول کر ایک نوٹ کیشئر کے سامنے رکھ دیا اور رضا کی طرف دیکھنے لگا جو ایک طرف کھڑا کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ تبھی کیشئر نے اس کی توجہ دلائی۔ مہریز تھوڑا سا شرمندہ ہوا۔ اس نے فوراً وہ ایک ڈالر کا نوٹ اٹھا کر واپس اپنے والٹ میں رکھا اور پھر نہایت دھیان سے مطلوبہ رقم گن کر کیشئر کے حوالے کی اور اپنا باکس اٹھا کر رضا کے ساتھ کار پارکنگ کی طرف چلا پڑا۔

راستے بھر وہ رضا کی تمام باتوں کو بے دھیانی سے سنتا رہا۔ یہ کیفیت کچھ دیر کے لیے ختم ہوئی۔ جب وہ رضا کو مطمئن کرنے کے لیے زبردستی مسکراتا ہوا اسے اپنے گھر سے رخصت کرنے لگا لیکن اپنے خالی گھر میں داخل ہونے کے بعد کسی کو کھو دینے کا ملال پھر سے دل میں جا گزیں ہو چکا تھا۔

اتنے سال گزر جانے کے باوجود وہ لڑکی آج بھی اول روز کی طرح اس کے ذہن و دل پر قابض تھی۔ حالانکہ سولہ سترہ سال کی عمر میں کی گئی محبت تو وقتی اثرات کی حامل ہوتی ہے جیسے پانی کی سطح پر ابھر کر معدوم ہوتے

بلبلے۔ کم از کم اس نے لوگوں سے یہی سنا تھا' اور یہی سمجھا تھا کہ وقت گزرتے ساتھ اس یاد کا زخم بھر جائے گا اور نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ پر جانے کیوں اس کا دل دنیا والوں کے تجربے کو غلط ثابت کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔

اس نے ٹی وی آن کر لیا اور بے مقصد چینل تبدیل کرتا ایک میوزک چینل پر رک گیا۔ وہ لاشعوری طور پر خود کو آمادہ کرنے لگا کہ اس لڑکی سے منسلک ہر وہ چیز یاد کرے جس سے مہریز کو دکھ پہنچا تھا۔ مگر ناکامی یہاں بھی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا' وہ بالکل بے بس ہو رہا تھا۔ اپنے آپ سے لڑ رہا تھا خود کو یقین دلانے کے لیے کہ اس کی موجودہ کیفیت محبت' ہرگز نہیں ہے لیکن یہی جھوٹ دہراتے دہراتے وہ تنگ آچکا تھا۔ اگر وہ محبت نہیں تھی تو میں اب تک اسے کیوں یاد رکھے ہوئے ہوں۔ اگر اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی تو اتنے سالوں بعد اسے دیکھ کر۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور گہرے سانس لینے لگا۔ بہت گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ شیشے کا سلائیڈنگ دروازہ کھول کر وہ اپنے کمرے سے باہر کے عقبی حصے کی طرف نکل آیا اور وہاں موجود سوئمنگ پول کے پاس رکھی کین کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھک کر اس نے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

ذہن ماضی کے شکنجوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اتنی آسانی سے رہائی کیونکر ملتی؟

☆ ☆ ☆

تعزیت کرنے کے لیے آنے والوں کو جمگھٹا سوئم کے بعد کم ہوتا جا رہا تھا۔ آمنہ بیگم کی تین گھنٹے بعد فلائٹ تھی۔ وہ چند دنوں کے لیے بھائی کے پاس رہنے آئی تھیں کہ یہ سانحہ ہو گیا۔ عبید کے انتقال کے بعد اب رامین کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کی موت کے ساتھ ہی سب گلے شکوے بھی دم توڑ گئے تھے۔ وہ رامین کے کمرے میں آئیں تو وہ اپنے بستر پر اوندھی لیٹی کنارے سے ہاتھ لٹکا کر زمین پر انگلیوں سے نادیدہ نقش و نگار بنا رہی تھی اس نے آمنہ کی آمد کو محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ وہ چلتی ہوئی اس کے نزدیک آئیں اور جھک کر الجھے بالوں میں چھپے چہرے کو اپنے ہاتھ سے سہلا کر اسے متوجہ کیا۔

"اٹھو رامین! مجھے کچھ دینا ہے تمہیں۔"

وہ بدستور اوندھی لیٹی اپنے پیر ہلاتی رہی۔ اس کا چہرہ پہلے ہی ڈھکا ہوا تھا۔ وہ گدے کے کنارے اپنی تھوڑی ٹکا کر مسلسل زمین پر ہاتھ چلائے جا رہی تھی۔

"دے دیں۔" اسے یہ جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ آمنہ پھپھو اسے کیا دینا چاہتی ہیں۔ آمنہ نے ادھر ادھر دیکھا تو ڈریسنگ ٹیبل پر انہیں ایک ہیئر برش نظر آ ہی گیا۔ وہ ہیئر برش اٹھا کر اس کے پیروں کے پاس بستر پر بیٹھ گئیں۔

"ایسے نہیں دے سکتی۔ پہلے تم اٹھ کر بیٹھو۔"

ان کے بیٹھنے کے باعث رامین کا پیر جھلانا موقوف ہو چکا تھا۔ اگر وہ پیر ہلاتی تو پھپھو کو لگ سکتا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا۔ پھر اسے لگا کہ ان کا کہا ماننا پڑے گا۔ اپنے بازوؤں کے بل وہ سیدھی ہو بیٹھی۔ پھپھو کے چہرے پر پیار بھری مسکراہٹ نظر آئی۔

"چلو' اب میرے پاس آؤ۔ پہلے تمہارے بال بناؤں گی۔"

رامین ان کے کہنے پر عمل کرتی ان کے سامنے بیٹھ گئی آمنہ نے پہلے اس کے بال سلجھائے' پھر انہیں سمیٹ کر چوٹی بنانے لگیں۔ وہ اس سے ہلکی پھلکی باتیں کرتی جا رہی تھیں۔ جس کے جواب میں رامین نے ہوں ہاں کے علاوہ کچھ اور نہیں کہا تھا۔ بال اچھے طریقے سے بندھ گئے تو رامین پوری کی پوری ان کی طرف گھوم گئی۔

"آپ مجھے کیا دینے والی تھیں؟" آمنہ بیگم نے اس کی یاددہانی پر فوراً" اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر اپنے سامنے رکھ لیا اور اسے کھول کر کچھ جیولری نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ تین ہیرے کی انگوٹھیاں' دو سونے کے کڑے اور نازنین کے نام والا لاکٹ اور چین۔

"یہ تمہاری ماما کے جسم سے اتارا تھا میت کو غسل دینے سے پہلے میں نے سنبھال کر رکھ لیے تھے۔ اب تم انہیں ان کی جگہ پر رکھ دو۔" پھر کہنے لگیں۔ "بلکہ ایسا کرو تم انہیں پہن لو۔" رامین جواب تک بے تاثر چہرے سے ان کی ہر بات چپ چاپ سن رہی تھی' ایک دم کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی۔

"نہیں۔ میں نہیں پہنوں گی۔" آمنہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا' وہ ان زیورات کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے سامنے بستر پر وہ زیور ایک سیاہ سانپ میں تبدیل ہو گیا۔ وہ چیخ پڑی۔

"پھپھو! اسے لے جائیں۔ یہ سانپ مجھے کاٹ لے گا۔" رامین بدک کر پیچھے ہٹی تھی۔

"کیا ہوا رامین؟" آمنہ بیگم نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالنا چاہا مگر وہ بار بار ان سے زیورات ہٹانے کا کہتی رہی۔ انہوں نے پلٹ کر وہ زیور بستر سے اٹھایا۔

"اچھا دیکھو میں لے کر جا رہی ہوں۔ تمہاری ماما کی دراز میں رکھ دوں گی۔ ٹھیک ہے۔ تم گھبراؤ مت۔ میں ابھی رکھ کے آئی ہوں۔"

اس وقت اس کے ساتھ کسی قسم کی کوئی بحث کرنے کا فائدہ نہیں تھا۔ وہ سیدھی نازنین کے کمرے میں گئیں سائیڈ ٹیبل کی دراز کھول کر زیور اس میں ڈالا اور واپس رامین کے پاس پہنچ گئیں۔ اس کی نگاہیں دروازے پر ہی لگی تھیں۔ آمنہ بیگم نے اسے بتایا۔

"میں نے ہٹا دیا ہے وہ زیور۔ ٹھیک ہے؟"

رامین نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ آمنہ نے فوراً" آگے بڑھ کر اس کو اپنی بانہوں میں لے لیا اور اسے چومنے لگیں۔

"کیوں ڈر گئی تھی میری بچی! ہاں۔ کیا ہوا؟"

"پھپھو! آپ ماما کا سارا زیور یتیم خانے کو دے دیں۔ مجھے نہیں چاہیے۔"

آمنہ نے حیران ہو کر اسے خود سے الگ کیا۔ "بیٹے کیوں کہہ رہی ہو؟"

"پھپھو پلیز! آپ ان سانپوں کو گھر سے نکال دیں۔ ماما نے اس کی زکوٰۃ نہیں دی تھی۔ آپ یہ زیور لے جا کر اسے پھینک دیں۔ ڈونیٹ کر دیں۔ مجھے نہیں چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بھائی صاحب سے کہوں گی۔ تم جیسے چاہو گی ویسا ہی کر دیں گے' ٹھیک ہے؟ اب یہ رونا دھونا چھوڑو اور مجھے ہنستے ہوئے رخصت کرو۔ میں اب واپس جا رہی ہوں۔" وہ اس کا سر سہلانے لگیں۔

"کیوں؟ آپ کیوں جا رہی ہیں؟" رامین ان کے جانے کا سن کر واقعی پریشان ہوئی تھی۔

"تمہارے پھوپھا کا آپریشن ہے بیٹا! مجھے جانا ہو گا۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں تو بس چھ دن کے لیے ہی آئی تھی کہ یہ سب ہو گیا۔" وہ اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے بولیں۔ "میں کچھ مہینوں بعد دوبارہ چکر لگاؤں گی۔ پھر زیادہ دن رہوں گی تمہارے پاس۔ ٹھیک ہے؟"

رامین نے صرف سر ہلا دیا۔ وہ کسی کو جانے سے نہیں روک سکتی تھی۔ اگر روک سکتی تو آج اکیلی نہ ہوتی۔ اسی وقت عمر نے کمرے کا دروازہ بجایا اور اندر آگیا۔ اس کے پیچھے قدسیہ بیگم بھی داخل ہوئیں۔ انہیں دیکھ کر رامین نے سر جھکا لیا۔ قدسیہ نے آمنہ کو دیکھتے ہوئے ایک ترچھی سی نظر رامین پر ڈالی تھی۔ عمر نے آمنہ سے کہا۔

"پھپھو چلیں۔ ڈرائیور گاڑی لے آیا ہے۔"

آمنہ بیگم نے اس سے اپنا سوٹ کیس گاڑی میں رکھنے کا کہا۔ وہ تین دن سے یہیں پر تھیں اور ان کا سامان بھی۔ عمران کا سوٹ کیس اٹھا کر چلا گیا۔ قدسیہ بیگم آمنہ سے بولیں۔

"چلیں آپا بیگم! بھائی صاحب سے مل لیں۔ پھر میں آپ کے ساتھ ایئر پورٹ چلوں گی۔"

آمنہ نے دھیرے سے سر ہلایا اور رامین کو الوداع کہتے ہوئے ان کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ انہیں رامین اپنے بچوں کی طرح عزیز تھی۔

شفیق الرحمان سے ملنے کے بعد وہ گاڑی میں آکر بیٹھ گئیں۔ قدسیہ بھی ساتھ تھیں۔ انہیں ایئر پورٹ چھوڑ کر انہیں اپنے گھر واپس چلے جانا تھا۔ ڈرائیور نے

گاڑی اسٹارٹ کی اور ایرپورٹ کے راستے پر ڈال دی۔ کچھ دیر بعد قدسیہ بیگم نے اپنے نادر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے لگتا ہے رامین کا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔ کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔"

"ٹھیک ہو جائے گی۔ ابھی تھوڑی ڈسٹرب ہے۔ لوگوں سے ملے جلے گی تو آہستہ آہستہ اس کا خوف کم ہو جائے گا۔" آمنہ بیگم نے بہن کو تاکید کرنا ضروری سمجھا۔ "تم آتی جاتی رہنا۔ خیال رکھنا اس کا۔"

قدسیہ نے ہنکارا بھرا۔ "میرے آنے سے کیا ہوگا؟ اسے تو آپ اچھی لگتی ہیں۔ ہمیں کسی خاطر میں نہیں لاتی بالکل اپنی ماں جیسی ہے۔" نازنین سے نفرت کا اظہار کرنا وہ ہمیشہ یاد رکھتی تھیں' آمنہ نے افسوس سے سر ہلایا۔

"شاید اسی لیے وہ تم سے گھل مل نہیں پاتی کہ میں اسے اپنے بھائی کی اولاد سمجھتی ہوں اور تم نازنین کی بیٹی سمجھ کر ملتی ہو۔"

"ماں کا اثر تو آتا ہے اولاد پر۔" قدسیہ نے کندھے اچکائے۔

"باپ کا بھی آتا ہے اور رامین بہت اچھی بچی ہے۔ سب کی بہت عزت کرتی ہے۔"

"خدا کو مانیں آپا بیگم۔ اب بچی کہاں رہی؟ پچیس کی تو ہو گئی ہوگی۔"

"میں عمر کی بات نہیں کر رہی' رشتے کی بات کر رہی ہوں۔ وہ ہماری بیٹی جیسی ہے۔ تم پیار کرو گی تو پیار پاؤ گی۔" آمنہ کو جب بھی موقع ملتا' وہ انہیں سمجھانے کی کوشش کرتی تھیں۔ قدسیہ پر کیا اثر ہوتا تھا؟ وہ کچھ جاننے کے لیے بے چین تھیں' بالآخر پوچھ بیٹھیں۔

"ویسے۔ کافی دیر رہیں آپ اس کے کمرے میں۔ کیا کہہ رہی تھی رامین؟" آمنہ بیگم سرد آہ بھر کر رہ گئیں۔ قدسیہ ہمیشہ سے کن سوئیاں لینے کی عادی تھیں۔

"وہ اپنی ماں کا سارا زیور ڈونیٹ کرنا چاہتی ہے۔" آمنہ نے سیدھے سادے لفظوں میں انہیں بتا دیا۔

"میں نے بھائی صاحب سے کہہ دیا ہے۔ جیسے رامین کہے۔ کر دیجئے۔" قدسیہ کو اعتراض ہوا۔

"ایسے کیسے ڈونیٹ کر دے گی؟ اس میں ہمارا بھی حصہ ہے۔"

"قدسیہ۔ نازنین کے زیور میں ہمارا حصہ کہاں سے بنتا ہے؟" آمنہ کو حیرت ہوئی۔

"کیوں نہیں؟ بہنوں کا بہت حق ہوتا ہے بھائیوں پر۔ ہمارے بھائی کا پیسہ تھا۔" قدسیہ اپنی ماں کی زبان بولی تھیں۔ آمنہ کو ان کی اس منطق سے ہرگز اتفاق نہیں تھا۔

"بھائی کی محبت پر بہنوں کا حق ہوتا ہے اس کے روپیہ پیسہ جائیداد پر نہیں۔ ہمارے بھائی کی اولاد کو اللہ زندگی دے۔ وہ اپنے ماں باپ کی دولت کو جیسے چاہے برتیں' رکھیں یا پھینک دیں۔ اس میں تمہارا ہمارا کیا لینا دینا؟"

اپنے طور پر انہوں نے قدسیہ کو شرمندہ کرنا چاہا لیکن ہمیشہ کی طرح ناکام ہوئی تھیں۔

"اس میں لالچ کی کیا بات ہے؟ بری کا زیور تو ہماری ہی طرف سے تھا نا۔"

"اس پر بھی ہمارا حق نہیں ہے۔ جسے دیا وہی مالک تھی۔" آمنہ بیگم اپنے حجاب کی پن ٹھیک کرتے ہوئے بولیں۔ قدسیہ کے پاس دلائل کی کمی نہیں تھی۔

"کیوں؟ ہماری ماں کی نشانی ہے۔ میں تو ضرور کہوں گی بھائی صاحب سے۔"

ان کی مسلسل تکرار سے آمنہ بیگم کو بھی غصہ آیا۔

"قدسیہ ہوش کے ناخن لو۔ کیسی بری۔ کیسا زیور؟ کیا باتیں لے بیٹھی ہو؟" وہ انہیں ڈانٹ کر بولیں۔

"اور تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ نازنین نے امی بیگم کا زیور بدل کر دوسرے سیٹ لے لیے تھے۔ اب کس نشانی کی بات کر رہی ہو تم؟" آمنہ کو آج بھی اچھی طرح یاد تھا۔

بہن کو قائل کرنے میں ناکام ہو کر قدسیہ کا غصہ ناز پر اترنے لگا۔

"ناز بھابھی کو تو اللہ پوچھے گا جو کچھ انہوں نے کیا تھا میرے ساتھ۔ میں تو ہرگز معاف نہیں کروں گی۔"

آمنہ کو بہن کے خیالات جان کر سخت افسوس ہوا۔

"قدسیہ۔ وہ مر چکی ہے۔ اپنا دل صاف کر لو۔ مرے ہوئے لوگوں سے بیر پال کر کیا ملے گا؟" آمنہ بیگم ان کا ہاتھ تھام کر نرمی سے سمجھانے لگیں۔

"اللہ تعالیٰ اگر ان سے بازپرس کرے گا تو یقیناً ہم سے بھی ضرور پوچھے گا۔ ہو سکتا ہے ہمیں بھی اس کی معافی کی ضرورت ہو۔ اس کے مرنے کے بعد ہمیں کیسے معافی ملے گی؟ کبھی سوچا ہے؟"

"ہم نے ایسا کیا ظلم توڑا تھا؟ امی بیگم نے؟ میں نے؟ عبید بھائی نے تو رانی بنا کر رکھا تھا اسے۔"

"ناز کا رانی بننا ہی تو برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ ذرا سا ایڈجسٹ کر لیتیں امی بیگم تو عبید کو الگ نہ ہونا پڑتا۔ اسے دل سے قبول کر لیتے تو وہ بھی ہمارے خاندان کو اپنا سمجھتی۔ تم سارے قصور ان کے کھاتے میں ڈال کر بری الذمہ نہیں ہو سکتیں قدسیہ! تھوڑا یا زیادہ۔ کہیں نہ کہیں قصور تم لوگوں کا بھی تھا۔"

"آپ یہاں نہیں تھیں۔ آپ نہیں جانتیں جب انہوں نے ہمیں دنیا بھر میں رسوا کیا تو ہم پر کیا بیتی تھی۔"

آمنہ بیگم شادی کے بعد ابوظہبی میں رہ رہی تھیں۔ ان کے شوہر بینک میں کام کرتے تھے۔ عبید الرحمن کی شادی میں شرکت کی غرض سے وہ کچھ دنوں کے لیے آئی تھیں اور پھر اپنے شوہر کے ساتھ واپس چلی گئیں۔ اس دوران وہاں سے کبھی کبھار جب ان کا لاہور آنا ہوتا تو وہ اپنے مشاہدے کی نظر میں حالات کا جائزہ لیتی تھیں' اور ساتھ ہی ساتھ ماں اور بہن کے سامنے ناز کی شخصیت کے مثبت پہلو لے کر آتی تھیں۔ ان کا ماننا تھا کہ کوئی بھی شخص صرف برا نہیں ہوتا اور آپس میں ایک دوسرے کی کمزوریوں کو تھوڑا سا نظرانداز کر کے ہی زندگی آسان بنائی جا سکتی ہے۔

ناز نے قدسیہ کے ساتھ جو کیا تھا۔ انہیں اس کی تفصیل معلوم تھی' اسی لئے انہوں نے قدسیہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں جانتی ہوں اس نے جو کیا تھا۔ امی بیگم نے سب بتایا تھا مجھے فون پر۔ لیکن قدسیہ! ناز سے غلطی ہوئی تھی اور یوں دیکھا جائے تو وہ شخص تمہارے نصیب میں تھا ہی نہیں۔ اللہ نے تمہیں اس سے بہتر شخص کی بیوی بنایا ہے۔ شکر کرو' ان لوگوں کی اصلیت پہلے معلوم ہو گئی۔ اور یہ سب ناز کی اس غلطی کی وجہ سے ہوا۔"

قدسیہ بیگم کو بڑی بہن کا یوں ناز کی سائیڈ لینا بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا' اور انہوں نے اسی وقت اس کا اظہار بھی کر دیا۔

"آپ ہمیشہ ناز بھابھی کی طرف داری کرتی آئی ہیں اور آج بھی ہمیں قصوروار ٹھہرا رہی ہیں۔ میں آپ کی بہن ہوں۔ امی بیگم ہماری ماں تھیں۔ لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ ہم دونوں سے زیادہ آپ کو ناز بھابھی سے ہمدردی ہے۔"

آمنہ بیگم نے ان کی بات کی سختی سے تردید کی۔

"نہیں قدسیہ! ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میں صرف حقیقت بیان کر رہی ہوں اور ہر انسان کو حق بات ہی کہنی چاہیے۔ چاہے معاملہ اس کے قریبی رشتہ دار کا ہی کیوں نہ ہو۔

اگر تم چاہتی ہو کہ تمہاری بہن ہونے کی حیثیت سے میں تمہاری غلطیوں کی نشاندہی نہ کروں تو مجھے ناز کی کمزوریاں اچھالنے پر مجبور بھی مت کرو۔ امی بیگم میری بھی ماں تھیں لیکن وہ فرشتہ تو نہیں تھیں۔ انسان تھیں۔ بالکل ناز کی طرح ایک عام انسان۔ جس سے غلطیاں بھی سرزد ہوتی ہیں اور گناہ بھی۔ زیادتی انہوں نے بھی کی تھی۔ ناز اور عبید کے تعلقات کشیدہ کرنے میں بہرحال ان کا ہاتھ بھی تھا۔"

وہ ایک پل کے لیے سانس لینے کو رکیں پھر گویا ہوئیں۔

"میں ہمیشہ دعا کرتی ہوں کہ اللہ میری ماں کی مغفرت کرے۔ اور میں یہ دعا بھی ضرور کروں گی کہ اللہ تعالیٰ ناز کو بھی معاف کر دے۔ بلکہ میرے اور

تمہارے بھی کبیرہ و صغیرہ تمام گناہ معاف فرمائے۔ تم بھی معافی مانگا کرو۔ اپنے لیے۔ ہم سب کے لیے۔ جو عذاب ہم نہیں سہہ پائیں گے کسی دوسرے کو اس عذاب میں جلتا دیکھنے کی خواہش بھی نہیں کرنی چاہیے۔ بس اللہ معاف کردے۔ ہم سب کو معاف کردے۔" خوف خدا سے لبریز دل اور زبان سے اس کی رحمت کی طلب گار ہو کر آمنہ بیگم بے اختیار رو پڑی تھیں۔ قدسیہ نے تسلی کی خاطر اپنی بہن کے کندھے پر ہاتھ تو رکھا لیکن دل کے سوتے خشک تھے اور بنجر زمین پر سبزہ نہیں اگا کرتا۔

☼ ☼ ☼

اسکول کا پہلا دن تھا۔ مہرز زیر لب مسکراتے ہوئے مس ریکا کو روتے ہوئے بچوں کو چپ کرانے کی کوشش میں ہلکان ہوتا دیکھ رہا تھا۔ کلاس ون کے زیادہ تر بچے اپنی ماؤں کو یاد کرتے گلا پھاڑ پھاڑ کر روئے جارہے تھے لیکن اس کی یہ مسکراہٹ اس وقت غائب ہوگئی' جب اس کے ساتھ بیٹھی لڑکی نے بھی اچانک رونا شروع کردیا۔ پتا نہیں اسے یک دم کیا ہوا تھا؟ کافی دیر سے وہ اس کے ساتھ ہی بیٹھی تھی اور ایک لفظ نہیں بولی تھی۔ وہ اسکول آکر بہت خوش تھا لیکن پتا نہیں کیوں اس لڑکی کی وجہ سے اس کا موڈ خراب ہوگیا۔

دوپہر کو اس نے گھر واپس آکر اپنی امی سے اس کا ذکر کیا تو وہ اسے پیار سے سمجھانے لگیں۔

"بیٹا! آپ اسے چپ کروادیتے۔ کل آپ اسے سمجھایئے گا کہ اچھے بچے تو اسکول جاکر خوش ہوتے ہیں۔ روتے نہیں ہیں۔" مہرز نے ان کی نصیحت گرہ سے باندھ لی۔

لیکن اس کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اگلے دن وہ اسکول پہنچا تو وہ لڑکی بہت خوش لگ رہی تھی۔ کلاس میں وہ بار بار اپنی نئی رنگین پنسلیں گھڑتی رہی اور ڈرائنگ بناتی رہی۔ آج وہ خود میں ہی اتنی مگن تھی کہ اردگرد روتے ہوئے بچوں کی طرف اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ بریک ٹائم میں وہ جھولوں کے نزدیک بیٹھی اپنا لنچ باکس کھول رہی تھی کہ مہرز اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس لڑکی نے مسکراتے ہوئے اسے اپنے برابر بیٹھنے کو کہا' پھر زبردستی اپنا آدھا فرنچ ٹوسٹ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ وہ اسے مزے کا لگا تھا۔ وہ لڑکی اپنا آدھا ٹوسٹ ختم کرنے کے بعد بولی۔

"تمہارا نام مہرز ہے نا؟"

"ہاں۔۔۔" وہ تھوڑا حیران ہوا۔ "تمہیں کیسے پتا؟"

"میں نے تمہارے پنسل باکس پر لکھا دیکھا تھا۔" اس نے مزے سے جواب دیا۔

"تمہیں پڑھنا آتا ہے؟"

"ہاں! مجھے پڑھنا اچھا لگتا ہے۔" یہ جان کر مہرز پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"تو پھر کل رو کیوں رہی تھیں؟" جواباً" وہ منہ بسورتے ہوئے کہنے لگی۔ "میرے ہاتھ میں بہت درد ہورہا تھا' ماما نے مارا تھا۔"

"کیوں مارا تھا تمہاری ماما نے؟" مہرز نے ہمدردی سے پوچھا۔

"بس ایسے ہی اور میں نے تو ان کی ہیلپ کی تھی۔ وہ ناراض ہوگئیں۔ میرا ہاتھ مروڑ دیا۔ یہاں سے۔" اس نے اپنا بایاں بازو اس کے سامنے کردیا۔

"لیکن مارا کیوں تھا؟" مہرز کا تجسس برقرار تھا۔

"وہ دادی کے کپڑے دھو رہی تھیں۔" وہ راز سے پردہ اٹھانے پر رضامند ہوگئی۔ "انہوں نے بھائی سے کہا' ہانڈی کا چولہا بند کردو۔ بھائی اور میں کھیل رہے تھے۔ بھائی نے جاکر چولہا بند کیا اور بھاگ گیا۔ میں نے پھر سے سارے چولہے کھول دیے۔ بے چاری ماما پہلے ماچس جلاتیں پھر چولہا کھولتی تھیں' میں نے ان کی ہیلپ کردی کہ انہیں بار بار چولہا نہیں کھولنا پڑے گا بس۔۔۔ ماچس جلائیں گی اور کھٹ سے چولہے میں ڈال کر ہانڈی پکالیں گی۔ ماما نے مجھے تھینک یو بھی نہیں کہا۔ اتنا چلائیں اور زور سے میرا ہاتھ مروڑ دیا اور کہا اب کچن میں مت آنا۔" وہ انگلی اٹھا کر اپنی ماما کی نقل اتارتے ہوئے بولی۔ مہرز سر کھجاتا ہوا بولا۔

"انہوں نے گھر میں مارا تھا اور تم کلاس میں رو رہی تھیں؟"

"ہاں۔ میں نے دیکھا سب بچے رو رہے ہیں۔ میری چوٹ میں تو درد بھی ہو رہا تھا۔ میں بھی رونے لگی۔" اس کا لہجہ بہت دکھی تھا۔ "پتا ہے مہرز۔ جب ماما ڈانٹتی ہیں اور مجھ پر غصہ کرتی ہیں نا میرا دل چاہتا ہے میں نمک مرچ میں زہر ملا کر کھالوں اور مرجاؤں۔"

"تم چولہا کھول کر بیٹھ جانا۔۔۔ خود ہی مرجاؤ گی۔" مہرز کو ہنسی آرہی تھی۔

"تم ہنس کیوں رہے ہو؟" وہ غصے سے بولی۔

"تم بالکل بدھو ہو' تمہیں نہیں پتا' چولہے کی گیس سے لوگ مرجاتے ہیں۔"

"کیا؟ تمہیں کیسے پتا؟" وہ حیرانی آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

"مجھے معلوم ہے۔" مہرز فخریہ لہجے میں بولا۔ "میری امی نے بتایا تھا۔ تم بہت بے وقوف ہو۔ اس لیے تمہاری ماما نے مارا تھا۔"

"ان سے تو میں سوری کرلوں گی۔ تم مجھے بتاؤ تمہیں اور کیا کیا معلوم ہے؟"

مہرز کی معلومات نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ اس لیے وہ کلاس میں اسی کے ساتھ بیٹھنے لگی۔ بریک میں بھی وہ لڑکیوں کے ساتھ کھیلنے کے بجائے اس سے باتیں کرتی رہتی۔ مہرز نے اس باتونی لڑکی کی خاطر اپنے بہت سے پسندیدہ کھیل کھیلنے موقوف کردیے تھے۔ وہ پکڑم پکڑائی نہیں کھیلتا تھا کہ وہ اسے پکڑنے میں ناکام ہو کر رونے لگ جاتی۔ منکی بارز پہ چڑھنا اسے پسند تھا لیکن رامین ایک بار گرنے کے بعد اب دوبارہ اس پر جانا نہیں چاہتی تھی اسی لیے مہرز کی دلچسپی بھی ختم ہوچکی تھی۔

کلاس ٹو میں آنے کے بعد بھی ان کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ ایک دن گیمز کے پیریڈ میں پی ٹی کے بعد وہ دونوں گراؤنڈ کے کنارے بنچ پر بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ مہرز نے رامین سے سوال کیا۔ "تم بڑی ہو کر کیا بنو گی؟"

رامین نے دو منٹ تک نہایت سنجیدگی سے غور و فکر کے بعد جواب دیا۔ "میں مس نینسی بنوں گی۔ وہ بہت پیاری ہیں۔" اس نے اپنی ڈرائنگ ٹیچر کا نام لیا' جو برطانوی شہری تھیں اور سرخ و سفید رنگت کے ساتھ ان کی آنکھوں کا رنگ ہلکا سبز تھا۔

"اور تم بڑے ہو کر کیا بنو گے؟"

مہرز نے فوراً" کہا۔ "میں Muscle man (طاقت ور آدمی) بنوں گا۔"

"وہ کیا کرتا ہے؟ کیسا ہوتا ہے؟"

"Muscleman بہت اسٹرانگ ہوتا ہے۔ بگ مین۔۔۔ جیسے میرے پاپا۔۔۔ تمہارے پاپا۔" اور رامین کا چہرہ فق ہوگیا تھا۔ اس نے پوچھا "تم بڑے ہو کر مجھے مارو گے؟"

مہرز الجھ کر پورا کا پورا اس کی طرف گھوم گیا۔ "میں تمہیں کیوں ماروں گا؟"

"بگ مین لڑکیوں کو مارتے ہیں نا کیونکہ وہ اسٹرانگ ہوتے ہیں۔ میرے پاپا کی طرح۔" اس کے تصور میں بگ مین کا جو خاکہ بنا تھا' وہ مرد طاقت ور ہونے کے ساتھ ساتھ عورت پر ہاتھ بھی اٹھاتا تھا۔ لیکن یہ بات صاف صاف وہ مہرز سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ بس وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ مہرز بڑا ہو کر اس کے پاپا جیسا بنے۔

"مہرز! تم اسٹرانگ بنو گے تو میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گی۔ ہماری دوستی ٹوٹ جائے گی۔" اس نے مہرز کی دکھتی رگ چھیڑ دی تھی۔

"رامین! میں تمہیں نہیں ماروں گا۔ میں کسی کو نہیں ماروں گا۔ میں اچھا والا بگ مین بنوں گا نا۔"

سات سالہ مہرز کے لیے بڑا ہونا بے حد اہم تھا۔

"دیکھو۔ ٹیوزڈے کو تم نے مجھے مارا تھا۔ پر میں نے تمہیں نہیں مارا نا۔"

"تو میرے ہاتھ تو اتنے سوفٹ ہیں تمہیں چوٹ بھی نہیں لگی۔ اور تم مارو گے تو میں نیچے گر جاؤں گی۔"

"نہیں۔۔۔ میں نہیں ماروں گا۔ میں اچھا بچہ ہوں۔ میری امی کہتی ہیں اچھے بچے لڑکیوں کی ریسپکٹ

کرتے ہیں۔ میں تو تم پر غصہ بھی نہیں کرتا۔ تمہاری ساری باتیں مانتا ہوں پلیز مجھے بڑا ہو کر Muscleman بننے دو۔"

وہ اس سے باقاعدہ التجا کرنے لگا جیسے رامین کی اجازت کے بغیر اس کا بڑے ہونا ناممکن ہو۔ رامین چاہتی تو نہیں تھی پر مہرز کی دوستی کی خاطر اس نے مجبوراً" اجازت دے ڈالی۔

☼ ☼ ☼

کلاس تھری میں ٹیچرز نے لڑکے لڑکیوں کو الگ بٹھانا شروع کردیا۔ اگر وہ دونوں اپنی سیٹ چھوڑ کر ایک دوسرے کے ساتھ آکر بیٹھتے تو کلاس ٹیچر انہیں دوبارہ الگ بٹھا دیتیں۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے اس حقیقت کو تسلیم کرلیا کہ اب وہ کلاس میں اکٹھے نہیں بیٹھ سکیں گے۔ اپنی باتوں کا کوٹہ وہ بریک اور چھٹی کے وقت پورا کرنے لگے۔

کلاس فور تک پہنچتے ان کی دوسرے لڑکے لڑکیوں سے بھی تھوڑی دوستی ہونے لگی۔ مہرز اپنے دوستوں کے ساتھ وہی کھیل پھر سے کھیلنے لگا جو رامین کی وجہ سے چھوڑ چکا تھا اور رامین اپنی ہم مزاج سہیلیوں میں گھلنے ملنے لگی۔ ساتھ بیٹھنے کے کم کم مواقع ملتے مگر دوستی ہنوز برقرار تھی۔

ایک صبح کلاس ٹیچر نے ان کی کلاس کا ایک نئے لڑکے سے تعارف کروایا۔ حسن چوہدری ... وہ نیو ایڈمیشن تھا۔ چھوٹے قد کا ڈرا سہما حسن پہلے دن سے ہی شرارتی لڑکوں کے مذاق کا نشانہ بننے لگا۔ کوئی ٹیچر سے آنکھ بچا کر اس کی پنسل اٹھا لیتا تو کوئی پیچھے سے بال کھینچ دیتا اور وہ بس ڈیسک پر سر رکھ کر رونے لگ جاتا تھا۔

ایک دفعہ کلاس کے شرارتی بچے احمد نے اسے ٹانگ اڑا کر گرا دیا' جب وہ اپنی کاپی چیک کروا کر واپس اپنی ڈیسک پر آرہا تھا۔ اس دن پہلی بار حسن نے ٹیچر سے شکایت کی۔ اس کے گھٹنے پر بہت چوٹ آئی تھی۔ ٹیچر نے احمد کو کان پکڑوا کر کونے میں کھڑا کردیا اور چھٹی ہونے تک وہیں کھڑا رہا تھا لیکن چھٹی کے بعد اس نے حسن کو جالیا۔ وہ اپنی شکایت لگانے کا بدلہ نکالے رہا تھا۔ رامین یہ ماجرا دیکھ کر ان کے سر پر پہنچ گئی اور زور سے اپنا اسکیل احمد کے کندھے پر مارا۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹا تو رامین نے دوبارہ ہاتھ اٹھا دیا۔ احمد ڈر کر وہاں سے بھاگ گیا۔ حسن اپنے آنسو پونچھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ رامین نے اسے اپنے تھرماس سے پانی نکال کر دیا۔ مہرز بھی نزدیک آکر اسے تسلیاں دینے لگا۔

اس دن سے حسن اور مہرز کی دوستی پکی ہوگئی تھی۔ اب رامین اور مہرز کے ساتھ حسن بھی دنیا جہان کی باتیں کیا کرتا۔ وہ بھی رامین کی طرح باتونی واقع ہوا تھا۔

چھٹی ہوتے ہی وہ تینوں ساتھ بیٹھ کر گپیں لگاتے رہتے اور بہت مزے کرتے تھے۔

لیکن اس مثلث کو ٹوٹنے میں زیادہ دن نہیں لگے تھے۔ ایک چھوٹے سے واقعے نے اس رشتے کی نوعیت ہی بدل دی تھی۔ فیورٹ ٹافی اسٹیکرز اور کھلوں سے متعلق جملوں پر مشتمل معصوم گفتگو کرنے والے' لمس کے جادو سے ناآشنا تین بچوں کو ساتھ بیٹھا دیکھ کر جانے رامین کے پاپا نے کیا سمجھا تھا۔ وہ چھٹی کے وقت اسے لینے آئے تو وہ حسب معمول ان دونوں کے درمیان بیٹھی ہنستے ہوئے باتیں کررہی تھی۔ اس کے پاپا نے ان دونوں کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر اسے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور زور سے تھپڑ مار کر ڈانٹنے لگے کہ وہ لڑکوں کے ساتھ باتیں کیوں کررہی ہے؟

مہرز اور حسن گھبرا کر فوراً" وہاں سے ہٹ گئے تھے۔ رامین روتی ہوئی گھر گئی تھی۔

مہرز اس کے لیے بے حد فکر مند تھا۔ جانے اس کے پاپا نے گھر پہنچ کر اس کا کیا حشر کیا ہوگا۔ اسے سخت تشویش ہورہی تھی۔

اگلے تین دن رامین اسکول نہیں آئی تھی۔ ویک اینڈ کے بعد جب پیر کو وہ اسکول آئی تو خاموشی سے کلاس میں جا کر بیٹھ گئی۔ مہرز کو توقع تھی کہ وہ خود اسے اپنا حال بتائے گی جس طرح ہمیشہ وہ ہر چیز اس سے شیئر کرتی تھی مگر شاید اس کی نظر نہیں پڑی تھی مہرز پر۔ وہ

حسن کو لے کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ دونوں نے اس سے بات کرنا چاہی لیکن رامین کا رویہ بے حد روکھا اور عجیب تھا۔ اس نے کسی بھی سوال کا کوئی جواب نہیں دیا اور سر جھکائے اپنی کاپی پر سوال حل کرتی رہی۔ کچھ دیر کے بعد وہ دونوں شرمندہ ہو کر وہاں سے ہٹ گئے۔

مہرز بددل نہیں ہوا تھا۔ اسے یقین تھا وہ کچھ دنوں بعد خود اس کے پاس آئے گی اور وہ پھر سے اچھے دوست بن جائیں گے لیکن اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔

☼ ☼ ☼

مہرز کا مکمل دھیان پڑھائی کی طرف ہوگیا۔ اسے ہر سبجیکٹ پسند تھا اور پوزیشن لینا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ رامین اور اس کی دوستی اب اس کی ترجیحات میں شامل نہیں تھی۔ وہ انتہائی بدلحاظ اور بدتمیز ہوچکی تھی۔ اس کے مزاج کی یہ تبدیلی مہرز سمجھنے سے قاصر تھا۔ ویسے بھی وہ لوگ آپس میں بات نہیں کرتے تھے۔ دو سال پہلے ان کی دوستی ختم ہوگئی تھی اور جس طرح ہوئی تھی' اس کے بعد رامین سراپا بدل ہی گئی تھی۔ اس کی ہنسی' کھلکھلاہٹیں' دوستانہ مزاج' بے فکری' خوشی سب کچھ جیسے جادو کی چھڑی کے زور پر غائب کردیا گیا تھا پہلے مہرز کو اس سے کوئی شکایت نہیں تھی مگر اب ہر شکایت اسی کی ذات سے وابستہ ہوچلی تھی۔ ایک ہی کلاس میں ہونے کے باعث کچھ نہ کچھ واسطہ تو پڑتا رہتا تھا۔ لڑکے لڑکیاں آپس میں ضروری حد تک بات چیت کرتے ہی تھے۔ مگر تمام لڑکیوں میں رامین کا رویہ انتہائی غیر مناسب تھا۔ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ مخالف جنس اس کی ناپسندیدہ ترین مخلوق بن چکی ہے۔ کسی بھی معمولی سی بات پر وہ شعلے اگلتی' ایسی تیسی کردیتی تھی۔ اسی باعث لڑکے اس سے الجھنے کی ہمت نہیں کرتے تھے اور ذرا دور دور ہی رہا کرتے۔ اسے پروا نہیں تھی وہ شاید یہی چاہتی تھی کہ اسے "ناپسند" کیا جائے۔

مہرز اس کے اس رویے سے بہت مایوس ہوا تھا۔ وہ اس کی دوست رہ چکی تھی۔ اس لحاظ سے اس کے ساتھ تھوڑی رعایت برت سکتی تھی' لیکن اس نے ماضی کی ہر اچھی یاد کو اپنے بدصورت رویے سے ڈھانپ دیا تھا۔

اپنی تمام تر توجہ پڑھائی کی طرف مبذول کرنے کے بعد مہرز فرسٹ پلیس کے لیے جدوجہد کرنے لگا۔ فرح علیم' رامین کی بہترین دوست۔ تعلیمی میدان میں اس کی حریف بن کر سامنے آئی۔ وہ فرسٹ آنے لگی اور مہرز سیکنڈ۔ محض ایک دو نمبروں کے فرق سے وہ پیچھے رہ جاتا تھا۔ اسے فرح علیم سے چڑ ہوتی جارہی تھی۔ ایک وہی اس کی کامیابی کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ ورنہ فرسٹ پوزیشن حاصل کرنا کوئی ایسا مشکل کام نہ تھا۔

فرح علیم سبجیکٹ ٹیچرز کے ساتھ کافی بے تکلف تھی۔ وہ پراعتماد تھی اور کلاس کے علاوہ اکثر بریک ٹائم میں ٹیچر سے مشکل موضوعات پر بھی سوالات کیا کرتی تھی۔ تمام ٹیچرز اسے پسند کرتے تھے اور اس کی پوزیشن کی وجہ سے اہمیت بھی دیتے تھے۔

فرح علیم سے منسلک منفی جذبات کے زیراثر مہرز نے ایک دن کلاس میں اسے "مس کی چمچی" کہہ کر پکارا۔ جواب بہت سخت ملا لیکن فرح کی جانب سے نہیں بلکہ رامین کی طرف سے' جو اپنی سہیلی کی توہین برداشت نہیں کرپائی تھی۔ اس نے جواباً" مہرز کو کھری کھری سنائی تھیں مہرز مزید کچھ بھی کہے بغیر وہاں سے ہٹ گیا۔ اس وقت یہ لوگ کلاس سیونتھ میں تھے۔

مقابلہ بازی نے مہرز کو اور زیادہ محنت پر اکسایا تھا۔

یہ محنت رنگ لائی تھی۔ مہرز اور فرح کے نمبرز کا درمیانی فاصلہ کم ہونے لگا تھا اور بالآخر مہرز اپنی سخت حریف کو شکست دینے میں کامیاب ہوگیا۔

فرسٹ پوزیشن پر اب مہرز کا قبضہ ہوچکا تھا۔

دن مہینے سال گزرتے رہے۔ وہ اب نائنتھ کلاس میں آگئے تھے۔ اس دن رامین کی سالگرہ تھی۔ اسکول کی طرف سے اسٹوڈنٹس کو اپنی برتھ ڈے پر یونیفارم

کے علاوہ لباس پہننے کی اجازت تھی۔ رامین نے سیاہ جارجٹ کا عام سا شلوار قمیص پہن رکھا تھا' لیکن وہ بہت خاص لگ رہی تھی۔

اپنی طرف سے اس نے کوئی اہتمام نہیں کیا تھا' لیکن یہ وہ عمر ہوتی ہے جب لڑکیوں کو کسی بھی قسم کے بناؤ سنگھار کی ضرورت نہیں ہوتی' وہ اس کے بنا ہی پرکشش لگتی ہیں۔ کلاس کی سب لڑکیاں اسے سالگرہ کی مبارک باد کے ساتھ ساتھ ستائش بھی دے رہی تھیں اور ان کے سراہنے پر وہ خوش ہونے کے بجائے شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے کبھی خود کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یوں نا دانستگی میں سب کی توجہ کا مرکز بن جانے سے وہ کچھ عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔ "پذیرائی" ہر ایک کو اچھی لگتی ہے' لیکن رامین کے لیے یہ نیا تجربہ تھا۔

اسمبلی کے بعد وہ سب کلاس میں بیٹھ کر ٹیچر کی آمد کے منتظر تھے۔ یونہی ادھر ادھر دیکھتے مہرز کی نظر رامین پر جا رکی۔ وہ فرح کے ساتھ بیٹھی اس کے دیے گفٹ کو کھولتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ چھوٹے سے باکس میں سفید نگینوں والی بالیاں تھیں۔ فرح کو شکریہ کہتے ہوئے نہایت شوق سے رامین نے ایک بالی اٹھا کر اپنے کان کے پاس لے جا کر پوچھا۔ "کیسی لگ رہی ہے؟"

"بہت اچھی۔۔۔ ابھی پہن لو۔۔" فرح نے تعریف کے ساتھ ہی اصرار شروع کر دیا۔ رامین نے ملائمت سے کہا۔ "اچھا نہیں لگے گا اسکول میں اس طرح سج بن کر بیٹھ جاؤں۔ بلاوجہ سب گھوریں گے۔ میں گھر جا کر پہن لوں گی۔ پرامس۔" مہرز ان کی گفتگو با آسانی سن سکتا تھا۔ وہ دونوں ساتھ والی لائن میں ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔

"ٹھیک ہے۔ رہنے دو۔۔ گھر جا کر پہن لینا۔ ویسے تم یوں سادہ بھی بہت پیاری لگ رہی ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ سب تمہیں دیکھ رہے ہیں۔" فرح نے پیار سے اس کے ہلکے براؤن سلکی بالوں کی لٹ کان کے پیچھے اڑا دی۔ رامین نے سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے اس کی رائے کی تردید کی لیکن مہرز۔۔۔ وہ شاید پہلی بار فرح کی رائے سے دل ہی دل میں اتفاق کر رہا تھا۔ رامین واقعی بہت پیاری لگ رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ آج بات بے بات ہی مسکرائے جا رہی تھی۔ ورنہ تو ہر دم اس کی تیوریاں چڑھی رہتی تھیں۔ یہ نیا منظر تھوڑی دیر بعد مہرز کی توجہ کھینچ رہا تھا۔ "خوش، مطمئن اور مسکراتی ہوئی رامین۔"

غیر ارادی طور پر اس کی نظریں بار بار اس کے چہرے کا طواف کرتی رہیں لیکن یہ مشغلہ صرف ایک دن پر محیط رہا۔ اگلے دن سے اس کا وہی پرانا انداز واپس آگیا اور مہرز کی توجہ پھر سے پڑھائی کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔

میٹرک کے فزکس ٹیچر نہیں آئے تھے۔ ان سب کو فری پیریڈ مل گیا تھا۔ آدھی کلاس باسکٹ بال کورٹ میں پہنچ گئی۔ باقی ادھر ادھر بکھر گئے۔ مہرز کچھ دیر حسن کے ساتھ باتیں کرتا رہا' پھر لائبریری کی طرف نکل آیا۔ ریفرنس بک سے اپنے مطلوبہ نوٹس لینے کے بعد وہ دروازے سے باہر نکل رہا تھا کہ اسے رامین نظر آئی۔

وہ لائبریری میں آخری کونے والی میز پر اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ جس چیز نے مہرز کو ٹھٹکنے پر مجبور کیا وہ رامین کے آنسو تھے۔ جنہیں وہ بار بار ٹشو سے پونچھ رہی تھی۔

وہ پوری کوشش سے اپنی آواز دبائے ہوئے تھی۔ پھر بھی اس کی ہچکیاں بندھ چکی تھیں اور جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مہرز کا دل بے اختیار پگھل سا گیا اور یک دم ہی اس کی ذات سے وابستہ ہر شکایت ختم ہو گئی۔

لائبریری بالکل خالی تھی۔ ان دونوں کے علاوہ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ مہرز جب اس کے عین سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھا تو وہ چونک گئی۔ اپنے آنسو چھپانے کے لیے اس نے جلدی سے سر جھکا کر اپنی نوٹ بک کھول لی اور تیزی سے صفحے پلٹنے لگی۔ وہ اس وقت کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو؟" مہرز نے نرمی سے پوچھا۔

"میں نہیں رو رہی۔" اس نے سر اٹھائے بغیر اسی لہجے میں جواب دیا جو اس کا خاصا بن چکا تھا۔

لیکن مہرز نے برا نہیں مانا۔ وہ یکلخت اس کے دل کے بہت قریب ہو گئی تھی۔ جیسے ان کے درمیان کبھی کوئی دوری آئی ہی نہیں تھی۔ یہ وہ رامین تھی جو اس کی دوست تھی اور ہر چھوٹی سے چھوٹی بات اس سے شیئر کیا کرتی تھی۔ جس کے ننھے منے دکھ اس کے دلاسوں کے محتاج تھے۔

"بتاؤ نا کیوں رو رہی ہو؟" رامین نے بے بسی سے اس کی جانب دیکھا۔ کنچوں سی چمکتی شہد رنگ آنکھوں میں شفاف پانی ہلکورے لے رہا تھا۔ مہرز دیکھتا رہ گیا۔

کھڑکیوں سے اندر آتی سردی کی نرم دھوپ مہرز کی پشت سے چمکتی ہوئی رامین کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ سورج سے بڑھ کر تپش اس کی سنہری آنکھوں میں تھی۔ دہکتے رخسار اور ادھ کھلے ہونٹ کپکپاتے ہوئے دل کی بات کہتے کہتے رک سے گئے تھے۔

وہ بمشکل گویا ہوئی۔ "میری نانی امی کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔" اور اتنا کہتے ہی وہ پھر سے رونے لگی۔ وہ اسے تسلی دینے لگا۔ رامین سسکتے ہوئے اپنی پیاری نانی کے جانے کون کون سے قصے سناتی رہی۔ مہرز خاموشی سے اس کی ہر بات سنتا رہا۔ یونہی لگاتار بولتے ہوئے یک دم اسے شرمندگی کے شدید احساس نے گھیر لیا۔ مہرز نہایت انہماک سے اس کے نزدیک ہو کر اس کی ہر بات توجہ سے سن رہا تھا۔ وہ نظریں چرا کر ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مزید ایک لفظ کہے بغیر اس نے اپنی کتابیں اٹھائیں اور تیز تیز چلتی ہوئی لائبریری سے باہر نکل گئی۔ مہرز چپ چاپ اسے وہاں سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

☆ ☆ ☆

اپنے گھر واپس آکر بھی اس کا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ تنہائی میں بہت دیر تک وہ اپنی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اسے خوشی تھی کہ رامین نے دوبارہ اسے اسی منصب پر فائز کر دیا تھا۔ جہاں پر وہ نو سال پہلے تھا لیکن۔۔۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی تھا کہ وہ اپنے آپ کو ہواؤں میں محسوس کر رہا تھا بالکل نیا اور انوکھا جذبہ لہو بن کر اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔

ہر روز اسے دیکھتے رہنے کے باوجود ایسا کیوں لگ رہا تھا جیسے آج پہلی بار دیکھا ہے۔

آج سے پہلے تو وہ کبھی اس طرح بے خود نہیں ہوا۔ یہ تبدیلی اس کے اندر آئی تھی یا رامین پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گئی تھی۔ اس نے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں تو وہی چہرہ نگاہوں کے سامنے آگیا۔ مہرز گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ ابھی تک اس کے آس پاس تھی۔ اس کے روبرو' تصور میں اس کی صورت نقش ہو چکی تھی۔ وہ اس کے علاوہ کچھ اور سوچ ہی نہیں پا رہا تھا۔ ایک لمحے نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا تھا۔ اسے اپنے دل کی دھڑکن واضح طور پر سنائی دے رہی تھی' جو کسی اجنبی دھن پر دھڑک رہا تھا۔ پورا جسم جیسے مسحور کن مدہوشی کے عالم میں تھا۔ لب خود بخود مسکرانے لگے تھے۔

یہ کیا ہو رہا تھا اسے؟ وہ نہیں جانتا تھا۔

بس اتنا معلوم تھا کہ رامین کا خیال خمار بن کر لحظہ بہ لحظہ روح کی گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا۔

وہ آج بھی اسے یاد کر رہا تھا اتنی ہی محبت اور لگاوٹ سے جتنا گیارہ سال پہلے اس شام اپنے گھر میں یاد کر رہا تھا۔ محبت اسے اس دن ہوئی تھی رامین سے' جب اس کی آنکھوں میں ڈوب کر وہ ارد گرد کی ہر شے سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ اس رات بھی اسے نیند نہیں آئی تھی۔ اور آج کی رات بھی وہ سو نہیں پا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

آراستہ مخمل سے گٹھلیاں' سیپارے اور سفید چاندنیاں باہر نکالی جا چکی تھیں۔ لان میں رکھی کرسیوں کو اٹھا کر سوزوکی میں لادا جا رہا تھا۔ اگلے آدھے گھنٹے میں قناتیں بھی ہٹائی جانی تھیں۔ شفیق

الرحمان کا ڈرائیور آمنہ بیگم اور قدسیہ کو ان کی منازل پر پہنچا کر واپس آچکا تھا اور اب باہر کے کاموں میں دیگر ملازمین کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

آمنہ بیگم نے انہیں نازنین کے زیور کے بارے میں بتا دیا تھا۔ رامین کی نشاندہی پر انہوں نے عافیہ سے کہہ کر سارا زیور نکلوایا تھا کیونکہ وہ خود اپنی ماں کے زیورات کو چھونے سے انکار کر چکی تھی۔ عافیہ نے مشورہ دیا کہ زیور کو بیچ کر اس کی رقم عطیہ کر دی جائے۔ اس طرح ڈھیر سونا گاڑی میں یتیم سینٹر لے کر جانا ذرا مشکل ہوتا۔ شفیق الرحمان آمنہ بیگم سے کہہ چکے تھے کہ جیسا رامین نے کہا ہے' ویسا ہی ہو گا۔ انہوں نے عافیہ کو بھی سمجھا دیا کہ اس معاملے میں کوئی رائے دینے کے بجائے وہی کریں' جیسا کہا گیا ہے۔ عافیہ نے مزید ایک لفظ کہے بغیر شوہر کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے تمام زیور ایک مناسب سائز کے بیگ میں ڈالا اور عمر کو لے کر ڈرائیور اور سیکیورٹی گارڈ کے ہمراہ آدھے گھنٹے میں جا کر واپس بھی آگئیں۔

شفیق الرحمان نے رامین کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اس کے کمرے میں آئے تو وہ کھڑکی کے پاس زمین پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"تم اپنا ضروری سامان لو اور میرے ساتھ چلو۔" انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ رامین نے اپنا سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کے لہجے میں شفقت تھی اور آنکھوں میں فکر و ملال کے سائے لرز رہے تھے۔ وہ ہمیشہ سے ایسے ہی تھے۔ بہت مہربان اور سب کا خیال رکھنے والے۔ رامین تو پھر ان کے سگے بھائی کی اولاد تھی۔

"نہیں تایا جان ابھی نہیں۔۔۔ میں ابھی نہیں جا سکتی۔۔۔ مجھے یہاں کچھ کام کرنے ہیں۔"

وہ اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گئے پھر کہنے لگے۔

"تو ایسا کرتے ہیں' میں اور عافیہ کچھ دن کے لیے تمہارے پاس رہ جاتے ہیں۔ پھر جب سب کام ختم ہو جائے تو ہمارے ساتھ چلی چلنا۔"

لیکن جو کام وہ کرنا چاہتی تھی کسی اور کی موجودگی میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ اسے خود ہی انجام [illegible] تھے۔

"نہیں تایا جان! میں کر لوں گی۔ زیادہ بڑا کام [illegible] ہے۔ آپ بلاوجہ پریشان ہوں گے۔ اگر دل گھبرا [illegible] میں آجاؤں گی نا آپ کے پاس۔ ابھی پلیز کچھ دنوں [illegible] لیے مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔"

اس نے التجا کی۔ وہ بغور اس کی جانب دیکھنے [illegible] مگر وہ اپنی بات ختم کرتے کرتے نہ جانے کہاں کھو [illegible] تھی۔ کیسی خالی آنکھیں تھیں اس کی۔ خشک ویران صحرا کی مانند جن میں زندگی کی کوئی رمق نہ تھی۔ [illegible] شفیق الرحمان کو بہت سے پچھتاووں نے گھیر لیا۔ وہ اس کے لیے بہت فکر مند ہوتے ہوئے بھی [illegible] عرصے اس سے لاتعلق رہے تھے بلکہ کر دیے [illegible] تھے۔

"میں بے بس تھا۔ یا شاید وہ میری بزدلی تھی۔ [illegible] ہم بزدل ہو جاتے ہیں۔ اپنی عزت بچانے کی خاطر شرپسند اور فسادیوں سے گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ڈرتے ہیں جو کیچڑ ہماری ذات پر اچھالا جا رہا ہے [illegible] ہمارے دامن کو داغ دار نہ کر دے۔ کہیں زبان کے خنجر ہمیں گھائل نہ کر دیں۔ ہم پیٹھ موڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ عبید کے جانے کے بعد ہم سب نے اپنی ذات کو لالچ اور طمع کے ہر الزام سے تو بری ثابت کر دیا لیکن ہم اسے کیوں بھول گئے؟ یہ تو ہمارا اپنا خون تھی جس کی زندگی ہم نے یونہی ضائع ہونے دی۔ ذرا سی ہمت کر لیتے' ڈٹ جاتے اسے اپنے ساتھ ہی لے جاتے۔ وقت پر اس کی شادی ہو جاتی۔ میری بیٹی سے دو برس بڑی ہے۔ آج اس کی طرح اپنے گھر بار میں مگن ہوتی۔ کیسی مرجھا گئی ہے۔ ہم سے غلطی ہو گئی۔ بہت بڑی غلطی ہو گئی۔"

ان کی سوچوں کا لامتناہی سلسلہ ان گنت پچھتاووں سے بھرا پڑا تھا۔ ان کا دل بھر آیا۔ سسکنے کی آواز پر رامین نے مڑ کر انہیں دیکھا۔ شفیق الرحمان عینک اتار کر اپنی آنکھیں مل رہے تھے۔ اسے یقین نہیں آیا۔

"تایا جان! آپ رو رہے ہیں؟"

وہ تڑپ کر اٹھی اور ان کے آنسو پونچھنے لگی۔ شفیق الرحمان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تم ہم سے ناراض ہو؟ اسی لیے ہمارے ساتھ نہیں جانا چاہتیں نا' ہمیں معاف کر دو بیٹا!"

"نہیں تایا جان! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ تو میرے بابا جیسے ہیں۔۔۔ میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔" وہ انہیں یقین دلانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ "آپ میری فکر مت کریں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ دیکھیے گا' میں اب ہمیشہ آپ کو ہنستی ہوئی ملوں گی۔ بس آپ مت روئیے۔" اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر ملائمت سے ان کے آنسو صاف کیے۔

"اس اکیلے گھر میں کیا کرو گی رامین؟ ہمارے ساتھ چلو۔" وہ ابھی تک اسے لے جانے پر بضد تھے۔

"مجھے یہاں ہونا چاہیے تایا جان! اگر ان کا فون آیا اور اگر وہ واپس آگئے تو؟ میں گھر اکیلا چھوڑ دوں گی تو ان کی واپسی کی ہر امید دم توڑ دے گی۔"

تایا جان کو علم تھا' رامین کس کی بات کر رہی ہے۔ وہ ان کی تسلی کی خاطر پھر کہنے لگی۔ "میں آجاؤں گی اگر دل گھبرایا تو میں فوراً" آپ کے پاس آجاؤں گی۔ آپ مجھ سے دور تھوڑی ہیں' بس کچھ دن اور۔۔۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں۔۔۔ میں آجاؤں گی۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی وہ اجازت طلب نظروں سے ان کی جانب دیکھنے لگی۔ تایا جان نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔ "ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔" ان کے وعدے پر اعتبار نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی اور کچھ ان کے دل پر بوجھ بھی تھا کہ جب وہ مشکل میں تھی تو اسے ساتھ لے جانے کوئی نہیں آیا تھا۔ اب اس پر زبردستی کیا کرتے۔ بس کچھ دن کہہ رہی ہے پھر لے جائیں گے اسے۔۔۔ وہ دل ہی دل میں تہیہ کرنے لگے۔

"تم فکر نہ کرو عبید! میں اسے اب کبھی بے آسرا نہیں ہونے دوں گا۔" اپنے مرحوم بھائی کا خیال آتے ہی وہ ایک بار پھر آبدیدہ ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

تقسیم ہند سے قبل مطیع الرحمان اپنے بھرے پرے خاندان کے ساتھ آگرہ میں رہا کرتے تھے۔ پیسے کی ریل پیل تھی۔ پورا خاندان مل جل کر رہتا تھا۔ مطیع الرحمان کی شادی صبیحہ بیگم سے ہوئی تھی اور ان کا ایک بیٹا بھی تھا شفیق الرحمان۔ پاکستان وجود میں آیا تو مطیع الرحمان سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں چلے آئے۔ وطن کی محبت میں انہوں نے گھر والوں کو بھی ناراض کر دیا' جو ہندوستان چھوڑنے کے خلاف تھے۔ یہاں آکر انہوں نے نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ سستا زمانہ تھا اور ہم وطن ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک تھے۔ چند سالوں میں وہ اس قابل ہو گئے کہ اپنے بیوی' بچوں کے لیے ایک مکان خرید لیا اور اطمینان سے رہنے لگے۔ اسی دوران آمنہ پیدا ہوئیں۔

حالت بہتر ہونے کے بعد مطیع الرحمان نے اپنے خاندان والوں سے رابطہ کیا۔ تھوڑی ناراضی دکھا کر وہ لوگ مان گئے۔ مطیع الرحمان اپنے بڑے بیٹے شفیق الرحمان کو لے کر آگرہ گئے۔ واپسی پر ان کے والدین ہمراہ تھے۔ مطیع الرحمان کی چھوٹی بہن لاڈلی بیگم اپنے چچازاد سے بیاہی گئی تھیں۔ وہ اپنے والدین کے بڑے بیٹے تھے۔ ان کا فرض تھا کہ ان کی خدمت کریں' سو ہمیشہ کے لیے انہیں لاہور لے آئے۔

عبید الرحمان آمنہ سے چھ سال بعد دنیا میں آئے۔ ڈیڑھ سال کی عمر میں ہی وہ شدید بیمار ہوئے کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ مستقل علاج اور دعاؤں سے وہ صحت یاب تو ہو گئے لیکن صبیحہ بیگم کے دل میں ڈر بیٹھ گیا تھا۔ وہ عبید کو ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھتیں۔ انہیں ایک پل کے لیے بھی اپنی نگاہوں سے دور نہ ہونے دیتی تھیں۔ اسی باعث ان کا اسکول بھی دیر سے شروع ہوا کہ صبیحہ بیگم میں انہیں خود سے جدا کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔

عبید الرحمان کے بعد قدسیہ کی پیدائش ہوئی لیکن اسے ماں کی وہ توجہ نہ مل سکی' جو وہ بڑے بھائی' بہن کو مل چکی تھی اور عبید کو ابھی تک مل رہی تھی۔ اس کا

خیال رکھنا' دادی بیگم اور آمنہ کی ذمہ داری تھی اور انہوں نے اپنی یہ ذمہ داری خوب نبھائی تھی۔

مطیع الرحمان کے والد کا انتقال ہوا اور جائیداد بٹ گئی۔ ان کے چچا اور تایا نے ایمان داری سے ان کا حصہ انہیں پہنچا دیا۔ اس رقم سے مطیع الرحمان نے کاروبار شروع کیا۔ جس میں اللہ نے خوب برکت دی اور رزق میں کشائش ہونے لگی۔ لاڈلی بیگم بھی سال دو سال میں بھائی کے گھر چکر لگا لیا کرتی تھیں۔

صبیحہ بیگم کی ایک ہی بہن تھیں جو آگرہ میں مقیم تھیں۔ ایک دن انہیں اطلاع ملی کہ بہنوئی حادثے میں مارے گئے ہیں۔ وہ فی الفور عبیدالرحمان کے ساتھ آگرہ پہنچیں۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ سسرال والوں کا سلوک صالحہ کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہے۔ صالحہ کے تین بچے تھے۔ گلناز تو عبید سے ڈھائی سال چھوٹی تھی لیکن اس کے دو جڑواں بچے فقط چھ ماہ کے تھے۔ ان دونوں بہنوں کا میکہ تو رہا نہ تھا۔ والدین انتقال کرچکے تھے۔ صالحہ کو تنہا مصیبت میں چھوڑنا صبیحہ بیگم نے گوارا نہ کیا۔ انہوں نے مطیع الرحمان سے فون پر رابطہ کیا اور ان کی اجازت سے اپنی بہن صالحہ اور اس کے تینوں بچوں کو لے کر واپس لاہور آگئیں۔

مطیع الرحمان سادگی پسند اور سلجھے ہوئے انسان تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ نہایت دردمند دل بھی رکھتے تھے۔ صالحہ کو انہوں نے اپنی بہن سمجھ کر اپنے گھر میں رکھا اور اس کے بچوں کے ساتھ ہمیشہ شفقت سے پیش آتے رہے۔ صبیحہ بیگم بھی ایک سگھڑ اور سمجھ دار عورت تھیں۔ انہیں فضول خرچی کی عادت نہیں تھی اور اپنے بچوں کی بھی انہوں نے اچھی تربیت کی تھی۔

دونوں بہنوں کی اولادیں آپس میں گھل مل گئی تھیں۔ جس طرح انہوں نے اپنے بڑوں کا اتفاق سلوک دیکھا تھا۔ وہی اپنائیت ان کے دلوں میں گھر کر گئی تھی۔

گریجویشن کے بعد شفیق الرحمان نے ایک اسکول میں پڑھانا شروع کردیا اور رزلٹ آتے ہی بینک میں نوکری کے لیے اپلائی کردیا۔ بینک میں نوکری ... لیکن اسکول والے ان جیسے قابل استاد کو چھوڑ... آمادہ نہیں تھے۔ انہوں نے بصد اصرار انہیں ... کرلیا کہ وہ دوپہر میں ایک گھنٹے کی کلاس لے لیا کر... بینک میں نوکری مل جانے کے بعد والدین نے ... کی بات طے کردی تھی۔ مطیع الرحمان نے ا... دوست کی بیٹی عافیہ کو ان کے لیے پسند کیا تھا۔ صبیحہ ... کو بھی اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ شادی ... چند ماہ بعد ہی بینک والوں نے ان کا ٹرانسفر ابوظہبی کردیا۔ والدین کی اجازت سے شفیق الرحمان عافیہ ... لے کر ابوظہبی روانہ ہوگئے اور وہیں سکونت اختیار کرلی۔ ان ہی دنوں عبید میٹرک کے امتحان دے کر فارغ ہوئے تھے۔ صالحہ بیگم کی بیٹی گلناز نویں جماعت میں اور قدسیہ ساتویں میں پڑھ رہی تھیں۔ گلناز کے جڑواں بھائیوں میں سے ایک کم عمری میں ہیضے کی وبا کا شکار ہوکر چل بسا تھا۔ دوسرا بھائی ٹیپو پہلی جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ عبیدالرحمان اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ اسے بھی ان کے بغیر چین نہیں آتا تھا۔

صبیحہ بیگم کے لاڈ پیار نے عبید کو تھوڑا ضدی بنادیا تھا اور وہ غصے کے بھی تھوڑے تیز تھے۔ کچھ باتوں پر انہیں بلا سوچے سمجھے غصہ آجاتا۔ تب چھوٹے بہن بھائی (ٹیپو اور قدسیہ) گھر کے کسی کونے میں جا دبکتے۔ ایسے میں گلناز نہایت سمجھ داری سے ان کا غصہ ٹھنڈا کیا کرتی۔ اس کی طبیعت میں صبر و تحمل تھا۔

بڑی بیٹی کی حیثیت سے آمنہ نے گھر کے نظم و نسق میں صبیحہ بیگم کا ہاتھ بٹانا شروع کردیا تھا۔ تب ہی شفیق الرحمان کے توسط سے ابوظہبی میں مقیم خاندان سے ان کے لیے بہت اچھا رشتہ آیا۔ وہ لڑکا بھی وہیں شفیق الرحمان کے ساتھ کام کرتا تھا۔ انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ لڑکے کے والدین سے ملتے ہی فوراً رشتہ منظور کرلیا گیا اور گھر میں آمنہ کی شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔

صالحہ نے شروع دنوں سے اپنی بیٹی گلناز کو گھر کے کاموں کا عادی بنایا تھا۔ مطیع الرحمان نے اپنے گھر کے بالائی حصے میں ان کے لیے ایک پورشن مختص کر رکھا ... جل پر باورچی خانے کے علاوہ دو بیڈ روم اور ایک اسٹور روم بنوایا گیا تھا۔ وہ صالحہ کو الگ سے خرچا دیا کرتے تھے۔ تاکہ وہ اپنی مرضی سے اپنے بچوں کی ضروریات پوری کرسکیں۔ انہوں نے احسن طریقے سے مدد کرنے کے ساتھ انہیں خود مختار بھی کر رکھا تھا۔ تاکہ وہ اپنے آپ کو زیر بار نہ محسوس کریں اور ان کے بچوں میں خود اعتمادی پیدا ہو۔

آمنہ کی شادی کی تیاریوں میں گلناز اور صالحہ نے صبیحہ کا بے حد ہاتھ بٹایا۔ صبیحہ' آمنہ اور صالحہ کو لے کر جہیز کی خریداری کے لیے بازار جاتیں تو گھر کو سنبھالنے کی پوری ذمہ داری گلناز کے کندھوں پر ہوتی تھی۔ کھانا پکانے اور قدسیہ کی پڑھائی میں مدد کے ساتھ وہ عبید کے تمام کام بھی اپنے ذمہ لے لیا کرتی۔ وہ بی اے فرسٹ ایر میں تھی۔ اپنی پڑھائی کے ساتھ وہ باقی کام بھی خوش اسلوبی سے کررہی تھی۔

آمنہ کی رخصتی ہوجانے کے بعد بھی اس نے صبیحہ بیگم کا ہر طرح سے خیال رکھا اور انہیں آمنہ کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ اپنے حسن سلوک کی بدولت وہ صبیحہ بیگم کے دل میں گھر کر گئی اور انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ گلناز کو اپنی بہو بنائیں گی۔ عبیدالرحمان کے لیے گلناز سے بہتر کون لڑکی ہوسکتی تھی۔ وہ ان کی مزاج آشنا تھی۔ بھلے شکل و صورت کے لحاظ سے عبید کے سامنے دبتی تھی' پر اس چیز کی صبیحہ بیگم کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ خود بھی بس قبول صورت تھیں۔ لڑکی ہی ان کی بہن اور اس کی بیٹی تھی۔ لیکن اس کے مزاج کے سبب اسے بہت چاہنے لگی تھیں۔ انہوں نے مطیع الرحمان سے اس بات کا تذکرہ کیا تو وہ کہنے لگے۔

"عبید کے لیے تو اماں بیگم' طوبیٰ کا کہہ رہی تھیں۔"

طوبیٰ' مطیع الرحمان کی بہن لاڈلی بیگم کی چھوٹی بیٹی کا نام تھا۔ صبیحہ بیگم کو برا تو لگا کہ ان کی ساس نے اکیلے میں بیٹے کے سامنے نواسی کا نام لیا اور ان سے مشورہ لینا بھی ضروری نہ سمجھا' جبکہ وہ ہمیشہ دل و جان سے ان کی خدمت کرتی آئی تھیں لیکن اس وقت یہ جتانا مطیع الرحمان کی ناراضی کا سبب بھی بن سکتا تھا۔ وہ حسب عادت اپنے دل کا حال پوشیدہ رکھتے ہوئے میٹھے لہجے میں گویا ہوئیں۔

"یہ تو اماں بیگم کی محبت ہے کہ انہوں نے ہمارے عبید کے لیے سوچا۔ طوبیٰ بہت پیاری بچی ہے' لیکن اگر بہو کی حیثیت سے دیکھا جائے تو وہ اس کسوٹی پر پوری نہیں اترتی۔" وہ سنبھل سنبھل کر گفتگو کرنے کے ساتھ مطیع الرحمان کے چہرے کے تاثرات کا بھی بغور جائزہ لے رہی تھیں۔ ابھی تک تو ان کے چہرے پر کسی قسم کی ناگواری دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ اس لیے صبیحہ بیگم نے گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

"ہمارے گھرانوں میں شکل و صورت سے زیادہ لڑکی کا سگھڑاپا دیکھا جاتا ہے۔ اس کی نرم مزاجی' گفتگو کا سلیقہ' بڑوں کا ادب' چھوٹوں کا لحاظ ہونا' یہ سب اہمیت رکھتا ہے۔ اب آپ ہماری ہی مثال لیجیے' بھلا آپ جیسے خوبرو اور وجیہہ شخص کے سامنے ہم جیسی معمولی شکل و صورت اور پستہ قامت لڑکی کی اوقات ہی کیا تھی؟ پر اماں بیگم نے آپ کی چچازاد حسن آرا کو چھوڑ کر ہمیں پسند کیا حالانکہ ہم غیر بھی تھے۔"

مطیع الرحمان انہیں ٹوکے بغیر نہ رہ سکے۔ "ایسا مت کہیے۔ آپ ہماری نظر میں دنیا کی حسین ترین خاتون سے کم نہیں۔"

صبیحہ بیگم تیر نشانے پر لگتا دیکھ کر مسکرائیں۔

"یہ آپ کی محبت ہے۔ مگر ذرا سوچیے اگر میں نے آپ کے گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کی پرورش میں کوتاہی برتی ہوتی تو گزارا کیسا ہوتا؟ فقط حسن و جمال کے ساتھ زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔ لڑکیوں میں گھر بنانے کا سلیقہ بھی ہونا چاہیے۔ طوبیٰ کی پرورش لاڈلی بیگم نے ذرا زیادہ ہی لاڈ پیار سے کی ہے۔ تھوڑی منہ زور ہے اور گھرداری سے حد درجہ بے زار بھی۔ ہاتھ میں کوئی ہنر بھی نہیں ہے۔ میں نے لاڈلی بیگم کو ہمیشہ اپنی بہن سمجھا ہے۔ میرے لیے گلناز اور طوبیٰ ایک

جیسی ہیں۔ باقی رہا عبید کی شادی کا فیصلہ۔ تو آپ کا اور اماں بیگم کا عبید پر زیادہ حق ہے۔ آپ جو بھی فیصلہ کریں گے ہمیں دل و جان سے قبول ہوگا۔"

صبیحہ بیگم شوہر کو اپنے نقطہ نظر سے آگاہ کرنے کے بعد سونے کے لیے لیٹ گئیں۔ انہوں معلوم تھا مطیع الرحمان کا اگلا قدم کیا ہوگا۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح وہی ہوا' جو صبیحہ بیگم چاہتی تھیں۔ مطیع الرحمان نے اماں بیگم کو طوبیٰ کے لیے انکار کردیا اور کچھ دنوں بعد لاڈلی بیگم سے فون پر یہ کہا کہ "طوبیٰ کے لیے جیسے ہی کوئی اچھا رشتہ آئے بات طے کردینا۔" یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ ہمارے بھروسے بچی کو بٹھائے رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

لاڈلی بیگم جانتی تھیں کہ ان کی والدہ نے طوبیٰ اور عبید کے رشتے کی خواہش کی تھی۔ اپنے بھائی کی بات سن کر انہیں بہت مایوسی ہوئی تھی' پر انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ مطیع الرحمان نے اس بات کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے صبیحہ بیگم کو تاکید کی تھی۔

"فی الحال اپنے اس ارادے کا کسی سے ذکر مت کیجیے گا کہ ہم گلناز کو بہو بنانا چاہتے ہیں۔ ہم نے بھی اماں بیگم سے کچھ نہیں کہا ہے۔ ورنہ انہیں افسوس ہوتا کہ ہم نے سگی بہن کی اولاد پر صالحہ کی بیٹی کو ترجیح دی ہے۔"

صبیحہ بیگم نے تابعداری سے سر ہلا دیا۔ ان کا مقصد پورا ہوچکا تھا۔ شوہر کے سامنے انہوں نے طوبیٰ کی ہنسنے بولنے والی طبیعت کو کھلنڈرا پن اور غیر ذمہ داری ظاہر کیا تھا۔ طوبیٰ کے مقابلے میں گلناز انہیں زیادہ پیاری تھی۔

عبید الرحمان نے تعلیم مکمل کرتے ہی عملی زندگی میں قدم رکھ دیا۔ ان کا رجحان نوکری سے زیادہ کاروبار کی طرف تھا۔ ان کے ایک دوست کے والد کی فیصل آباد میں سوتی کپڑے کی فیکٹری تھی۔ وہ اپنا زیادہ تر مال ایکسپورٹ کیا کرتے تھے۔ عبید اپنے دوست کے ساتھ ان سے ملے۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ اپنے تیار کردہ کپڑے کے ملبوسات بنا کر فروخت کریں۔ اس کے لیے سرمائے کی ضرورت تھی اور ایک ایسے شخص کی جو لاہور میں ان کی برانڈ کو پہچان دلا سکے۔

عبید نے اپنے والد اور بھائی شفیق الرحمٰن کی مدد سے پیسوں کا انتظام کیا اور اپنے دوست کے ساتھ پارٹنر شپ کرلی۔ چند ایک سال کاروبار کو جمانے میں عبید نے دن رات محنت کی۔ جس کا پھل یہ ملا کہ کاروباری حلقوں میں ان کی ساکھ بہتر سے بہتر ہوتی رہی اور منافع میں اضافہ بھی ہونے لگا۔

اب صبیحہ بیگم سنجیدگی سے عبید کی شادی کرنے کا سوچ رہی تھیں۔ ان کے خیال میں یہ مناسب وقت تھا کہ عبید اور گلناز کی شادی کردی جائے۔

گلناز ان ہی کے گھر میں پلی بڑھی تھی۔ ایک بار اس نے اپنی ماں اور خالہ کی وہ گفتگو اتفاقاً "سن لی' جس میں صبیحہ بیگم صالحہ کو اس کے لیے آئے رشتے سے انکار کرنے کے لیے کہہ رہی تھیں۔ اسی دم صبیحہ بیگم نے اسے اپنی بہو بنانے کی خواہش کا اظہار بھی کردیا تھا۔ معصوم لڑکی اس دن سے عبید کو اپنے شوہر کے روپ میں دیکھنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

صبیحہ بیگم کی ایک جاننے والی اپنی بیٹی کی شادی کا دعوت نامہ لائیں۔ وہ پہلے صبیحہ بیگم کے گھر کے ساتھ والے مکان میں رہا کرتی تھیں۔ دو سال پہلے ہی انہوں نے گھر بدلا اور گلشن اقبال شفٹ ہوگئی تھیں۔ اس کے باوجود اپنے محلے داروں سے میل جول برقرار تھا۔ وہ اپنی بیٹی آسیہ کی شادی کا کارڈ لے کے آئیں اور پورے خاندان کو شرکت کی دعوت دے کر چلی گئیں۔ ان ہی دنوں آگرہ سے لاڈلی بیگم بھی اپنے بچوں کے ساتھ ایک مہینے کے لیے لاہور آئی ہوئی تھیں۔ تمام رشتہ دار اور جان پہچان کے لوگ ان سے ملنے آرہے تھے یا اپنے گھر دعوت پر بلا رہے تھے۔

مہندی والے روز مطیع الرحمان نے اماں بیگم کی طبیعت کے باعث ان کے ساتھ جانے سے معذرت کرلی تھی۔ اماں بیگم اپنی کمزوری کے باعث کم ہی کہیں آیا جایا کرتی تھیں۔ قدسیہ اور طوبیٰ بخوشی ان کے ساتھ چلنے پر راضی تھیں۔ عبید الرحمان بادل نخواستہ راضی ہوئے تھے کہ گاڑی انہوں نے ہی چلانی تھی۔ یہ جمعہ کی رات تھی اور ایک نئی فلم "سولا جٹ" سینما کی زینت بننے جارہی تھی۔

عبید کے لڑکپن کا یہ واحد شوق ہنوز برقرار تھا۔ سینما میں پہلی فلم "ارمان" دیکھی تھی انہوں نے بارہ سال کی عمر میں۔ جس کے گیتوں کی کتاب خرید کر انہوں نے اس کی شاعری کو حفظ بھی کیا۔ "طلسم کدے" میں رکھنے والا یہ پہلا قدم ہرگز آخری ثابت نہیں ہوا تھا۔ گھر والوں سے چھپ کر یہ مشغلہ دوستوں کی مہربانی سے جاری وساری رہا۔ بورڈ کے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد تو وہ دوستوں کے ہمراہ ہر جمعہ اور اتوار کا لیٹ نائٹ شو دیکھ کر ہی گھر واپس آتے تھے۔ مطیع الرحمان نے کئی بار سرزنش کی' حتیٰ کہ مرغا بنا کر پٹائی بھی کرڈالی مگر بے سود۔ نہ وہ عبید الرحمان کی دوستیاں چھڑوا سکے اور نہ ہی فلمی شوق۔ اس کی بڑی وجہ صبیحہ بیگم بھی تھیں' جو اپنے لاڈلے کی اس دلیل کے ساتھ پشت پناہی کرتی تھیں کہ "ذرا سی تفریح ہر انسان کا حق ہے اور عبید نے کبھی اس شوق کی آڑ میں اپنی کسی بھی ذمہ داری سے منہ نہیں موڑا تھا' نہ ہی ان کی پڑھائی متاثر ہوئی تھی پھر کیوں والدین کی طرف سے بے جا اس بے ضرر شوق پر قدغن لگائی جائے تو یہ درست نہ ہوگا۔"

مطیع الرحمان کو غصہ ان کی تفریح پر نہیں ان کی بے خبری پر آیا کرتا تھا۔ لیکن صبیحہ بیگم کی وجہ سے وہ خاموش ہوگئے۔ عبید نے جب کام شروع کیا تو دل لگا کر کیا۔ کاروبار جم جانے کے بعد یہ تفریح دوبارہ شروع ہوئی۔ ان کے والد مطیع الرحمان کو سوائے اس ایک شوق کے ان سے اور کوئی شکایت نہ تھی۔

جب آسیہ کی مہندی پر لے جانے کی ذمہ داری ان پر آئی تو انہیں یوں پہلا شو چھوٹ جانے کا انہیں بے حد قلق تھا کہ جب تک مہندی کی تقریب اختتام پذیر نہ ہوجاتی۔ ان کا واپس آنا ناممکن تھا۔

لیکن۔۔۔ وہاں قسمت نے کچھ ایسی مہربانی کی کہ جس قدر بھناتے ہوئے گئے تھے اسی قدر خوشی سے گنگناتے ہوئے واپس لوٹے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

کیلی فورنیا ہائی وے پر "مہرز خان" نامی ایک نوجوان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ آفیسرز کے مطابق اس نوجوان کے زندہ بچنے کے امکانات کم ہیں۔

مہرز خان اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ روڈ ایکسیڈنٹ میں اس کے والدین کی وفات ہو چکی ہے۔ اب وہ کیلی فورنیا میں اپنے پرانے اور با اعتماد ملازم جیری کے ساتھ رہتا ہے۔ رضا اس کا دوست ہے۔ مہرز کا اس کے گھر بھی آنا جانا ہے۔ رضا کی چھوٹی بہن عنبر کو وہ بھی اپنی بہن سمجھتا ہے۔

رامین ایک مغموم و معصوم لڑکی ہے۔ ماں کے ظلم کی وجہ سے ہر وقت دہشت زدہ رہتی ہے۔ ماں کے انتقال پر اس کی پھوپھیاں آمنہ بیگم اور قدسیہ بیگم اسے سنبھالتی ہیں۔ تایا شفیق الرحمان اسے اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کرتے ہیں مگر وہ منع کر دیتی ہے۔

رامین اور مہرز کے درمیان اسکول کے پہلے دن سے ہی خوب اچھی دوستی ہو جاتی ہے۔ پھر حسن بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے مگر ایک دن رامین کے والد اسے مہرز اور حسن کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ کر بہت سختی کرتے ہیں۔ اس دن کے بعد سے رامین ان دونوں سے کھنچ جاتی ہے۔ میٹرک تک آتے آتے رامین کی سرد مہری کے باوجود مہرز اس کو پسند کرنے لگتا ہے۔

مطیع الرحمان اور صبیحہ بیگم کے دو بیٹے شفیق الرحمان اور عبید الرحمان اور بیٹیاں آمنہ بیگم اور قدسیہ بیگم ہیں۔ لاڈلی بیگم، مطیع الرحمان کی چھوٹی بہن ہیں اور صالحہ بیگم، صبیحہ بیگم کی چھوٹی بہن ہیں، جو بیوہ اور تین بچوں کی ماں ہیں۔ صبیحہ بیگم اپنے میاں کی رضامندی سے انہیں اپنے ساتھ رکھ لیتی ہیں۔ ان کی بہت سگھڑ مگر قدرے عام صورت بیٹی گل ناز کو صبیحہ بیگم عبید الرحمان کے لیے لینے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ گل ناز بھی عبید الرحمان کو پسند کرتی ہے۔ دوسری طرف لاڈلی بیگم کی خواہش ہے کہ عبید الرحمان کے لیے ان کی بیٹی طوبیٰ کو لیا جائے۔ صبیحہ بیگم بہت ہوشیاری سے مطیع الرحمان اور اپنی ساس کو گل ناز کے حق میں راضی کر لیتی ہیں۔

امایہ خان

دوسری قسط

فرح ایک ہفتے کے لیے اپنے والدین کے ساتھ عمرہ کرنے گئی ہوئی تھی۔ رامین کو میتھس Quadratic theorems سمجھنے میں کافی وقت کا سامنا تھا۔ گھر میں یکسوئی سے پڑھائی نہیں کی

جاسکتی تھی۔ وہ اکثر اوقات اپنا ہوم ورک اسکول آکر مکمل کیا کرتی تھی۔ بریک کے بعد میتھس کا پیریڈ تھا اور اس کا کام ابھی تک باقی تھا۔ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا' کیسے کرے؟ وہ پریشان سی کاریڈور کی سیڑھیوں پر بیٹھی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

مہرز اس کے سامنے سے گزرا تو رامین نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ وہ فوراً" اس کے پاس چلا آیا۔

"ہاں بولو؟" وہ تھوڑا جھجک رہی تھی۔ اپنے سلوک کے پیش نظر اسے توقع نہیں تھی کہ مہرز اس کی مدد کرے گا لیکن دو دن پہلے لائبریری میں دی گئی تسلیوں نے تھوڑی ہمت بندھائی تھی کہ وہ اسے مدد کے لیے بلا رہی تھی۔ "مجھے یہ formula Quadratic کی ذرا سمجھ نہیں آرہی... میرا تھیورم بھی رہتا ہے۔ مجھے سمجھادو گے پلیز؟" اس نے اپنے مزاج کے بالکل برعکس نرمی سے التجا کی۔ مہرز نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا۔

"دیکھو... بریک ختم ہونے میں پانچ منٹ رہتے ہیں۔ میں اپنا جرنل لاتا ہوں۔ تم فی الحال اسے کاپی کرلو اور ٹیچر کو ہوم ورک سب مٹ کروادو... میں تمہیں کل گیمز کے پیریڈ میں سمجھادوں گا۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مہرز نے ہمیشہ کی طرح چٹکی میں اس کا مسئلہ حل کیا تھا۔ رامین نے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا مگر وہ اپنا جرنل لانے جاچکا تھا۔

اگلے دن مہرز نے اپنے قول کے مطابق اسے تھیورمز حل کرنا سکھائے۔ وہ نہایت سنجیدگی سے اسے ایک ایک بات سمجھا رہا تھا۔ اس کی نظریں کتاب کے علاوہ کہیں نہیں بھٹکی تھیں۔ سارا فارمولا سمجھانے کے بعد اس نے رامین کو اپنا رف رجسٹر تھمایا اور کہا۔

"کلاس اور ہوم ورک میں کیے گئے سارے تھیورمز اس میں لکھے ہیں۔ تم اسے گھر لے جاؤ اور ان سے ہیلپ لے کر پریکٹس کرو۔

اوکے... میں جارہا ہوں... مزید کوئی اور ہیلپ چاہیے ہو تو بلا جھجک بتادینا۔" مہرز اپنا بیگ اٹھا کر اپنے دوستوں کے پاس چلا گیا۔ اس کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد رامین کو یاد آیا کہ اسے بائیولوجی کے بھی نوٹس چاہیے تھے۔ وہ اپنا پین بند کرکے اٹھی اور نپے تلے قدموں سے باسکٹ بال کورٹ سے گزر کر اس کے سامنے پہنچ گئی۔ مہرز اور کچھ لڑکوں کا گروپ پول سے ذرا آگے کھڑا باتوں میں مصروف تھا۔ رامین کچھ دنوں سے مہرز کے دیکھنے پر گڑبڑا سی جاتی تھی۔ حالانکہ زیادہ تر وہ نظریں جھکائے رکھتا تھا مگر جب اٹھاتا تو...

وہ کچھ جھجکتی ہوئی اس سے بات شروع کرنے ہی والی تھی کہ سب لڑکے اکٹھے آگے بڑھنے لگے۔ ان کے سامنے مہرز بھی چلنے لگا۔ رامین الٹے قدموں پیچھے ہٹتی رہی اور بات بھی کرتی رہی۔ پھر جیسے ہی وہ اپنی بات ختم کرکے تیزی سے مڑی' اس کا سر پول سے ٹکرا گیا۔ جہاں اس کی آنکھوں کے آگے یکدم اندھیرا چھایا۔ وہیں سب لڑکوں کے بے اختیار قہقہے بلند ہوئے۔ رامین نے زور سے اپنا سر جھٹک کر دن میں نظر آتے تاروں کو رقص کرنے سے روکا تھا۔ اتنے قہقہوں کے بیچ میں فقط ایک شخص کی نرم آواز اس کی خیریت دریافت کررہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ مہرز لب بھینچ کر اپنی مسکراہٹ چھپانے کی ناکام کوشش کرتا اس کے پاس کھڑا ہوکر اس کا حال چال پوچھ رہا تھا۔

"ہوں... ہاں۔" وہ بمشکل کہتی آگے بڑھ گئی۔ وہ شرمندہ تھی لیکن ہنسی تو اسے بھی آرہی تھی۔

یہ واقعہ یاد آتے ہی مہرز مسکرانے لگا۔ کیسی پگلی تھی وہ... ہر کام میں تیزی دکھاتی... اپنی خوب صورتی سے بے خبر... سیدھی سادی سی...

اسکول کو آرڈینیٹر آنے والے تھے۔ پورے اسکول میں تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔

وزٹ والے دن وہ سب سینئر پریفیکٹس ہائی الرٹ تھے۔ خیر خیریت سے پورے اسکول کا چکر لگا لینے کے بعد جیسے ہی کو آرڈینیٹر' پرنسپل اور وائس پرنسپل اور سب ٹیچرز کے ساتھ ہال کے اندر گئے۔ ان لوگوں نے

سکھ کا سانس لیا۔ تمام جونیئر پریفیکٹس کو ان کی ڈیوٹیز پہلے ہی بتادی گئی تھیں۔ وہ سب متعلقہ کلاسز میں جاچکے تھے۔ اب یہ لوگ سکون سے ہال کے باہر کھڑے آپس میں باتیں کررہے تھے۔ رامین دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ جلال اور آصفہ ہیڈ بوائے اور ہیڈ گرل تھے۔ انہوں نے وہ گلدستے اور ہار اٹھا کر اسٹاف روم میں رکھنے جانا تھا۔ جو کو آرڈینیٹر کو استقبالیہ میں پیش کیے گئے تھے۔ پتا نہیں جلال کو ایک دم کیا سوجھی۔ اس نے ایک کھلا ہوا گلاب گلدستے سے کھینچ کر باہر نکالا اور رامین کو جاکر پیش کردیا۔

"دس از فار یو۔"

وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ تمام لڑکے اس کی سخت طبیعت کی وجہ سے اس سے خار کھاتے ہیں۔ اس لیے جلال کا اس طرح پھول پیش کرنا اسے حیران کرگیا تھا۔ دیکھے بنا ہی وہ جانتی تھی کہ اس وقت ان سب کی نظریں اسی سین پر ہوں گی۔ وہ جلال سے پھول لینا نہیں چاہتی تھی لیکن کوئی بھی سخت جواب دینے کی وجہ سے وہ خود بھی تماشا بن جاتی۔ اس نے کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے وہ پھول پکڑلیا اور جلال مڑ کر آصفہ کے پیچھے چل دیا۔

مہرز یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ رامین خاموشی سے وہ گلاب رکھ لے گی۔ اسے اچھا نہیں لگا۔ کچھ دن بعد اس نے جلال سے پوچھا کہ اس نے اسے وہ پھول کیوں دیا تھا؟

"ایسے ہی یار... اچھی لڑکی ہے۔ میں نے سوچا اسے بھی پتا ہونا چاہیے کہ وہ اچھی ہے۔"

لیکن مہرز مطمئن نہ ہوسکا۔ اسے افسوس بھی ہورہا تھا کہ یہ ہمت اس نے کیوں نہیں کی۔

☼ ☼ ☼

مہرز کو نئے پریفیکٹس کی ڈیوٹی لسٹ ان کی کلاس میں جاکر دینی تھی۔ اس نے حسن کو ساتھ لیا اور وہ دونوں چلتے ہوئے کیمبرج کلاسز کی طرف آگئے۔

سر تنویر نے لسٹ دیکھ کر تینوں پریفیکٹ کے نام لیے۔ جب سارہ خان کا نام پکارا گیا تو مہرز نے کھڑی ہونے والی لڑکی کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ وہ بہت پیاری لڑکی تھی اور کافی پراعتماد بھی... مسلسل مسکراتے ہوئے وہ بھی مہرز کی جانب دیکھے جارہی تھی۔ حسن نے مہرز کو ٹھوکا دیا۔ پھر سر سے اجازت لے کر وہ دونوں باہر آگئے۔

"کیوٹ ہے یار... ہے نا؟" حسن نے اس کی رائے بھی پوچھی۔

"مگر تمہارے ساتھ سوٹ نہیں کرے گی۔" اس نے حسن کی پست قامت کو نشانہ بنایا۔

"جانتا ہوں... سوٹ تو وہ تیرے ساتھ کرے گی۔ دونوں پٹھان ہو... گورے اور لمبے بھی... اسٹڈیز میں بھی سب سے آگے... ہم غریبوں کو وہ کیوں گھاس ڈالے گی۔" حسن نے جل کر جواب دیا۔

"اونہوں... فضول باتیں مت کیا کرو... مجھے کسی لڑکی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں بس اپنی اسٹڈیز کو اہمیت دیتا ہوں۔"

وہ لوگ چلتے چلتے نوٹس بورڈ کے سامنے آگئے۔

"تم دیکھنا' ایک دن رول آف آنرز میں یہاں میرا نام لکھا ہوگا۔" اس نے اونچی دیوار پر ٹنگے اس آبنوسی بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔ جن پر رول آف آنر حاصل کرنے والے تمام اسٹوڈنٹس کے نام جلی حروف میں درج کیے گئے تھے۔

سارہ بہت جلد اپنی بولڈ طبیعت کی وجہ سے مشہور ہوگئی۔ بہت سے لڑکوں سے اس کی دوستی ہوچکی تھی۔

ان سے بھی جو اس کی کلاس میں نہیں پڑھتے تھے۔ وہ نئی آئی تھی' اس لیے کسی بھی لڑکے سے واقف نہیں تھی۔ کچھ دنوں بعد لڑکوں کے ایک گروپ سے اس کا جھگڑا ہوگیا اور بڑھتے بڑھتے بات پرنسپل تک جا پہنچی۔ وہ جھگڑا مہرز کے سامنے شروع ہوا تھا مگر ان کے ساتھ شامل نہ ہونے کے باوجود سارہ نے اس کا بھی نام لے دیا تھا۔

مہرز کو بھی پرنسپل کے آفس میں طلب کرلیا گیا تھا۔ سب لوگ بے حد حیران ہوئے تھے۔ سینئر کلاسز کے تمام سیکشنز میں اس بات کو خوب اچھالا جارہا تھا کہ مہرز نے سارہ کے ساتھ بدتمیزی کی ہے اور وہ اکثر بریک میں اس کے پیچھے آوازیں کستا پھرتا ہے۔

مہرز کا غم و غصہ سے برا حال تھا۔ جس گروپ کے ساتھ سارہ کی لڑائی ہوئی تھی۔ وہ سارے نالائق اور بدتمیز لڑکوں پر مشتمل تھا۔ مگر مہرز کی کنڈکٹ ہمیشہ سے قابل ستائش رہی تھی۔ وہ پڑھائی میں بھی اچھا تھا۔ پرنسپل نے جب دوسرے لڑکوں کے ساتھ اسے اپنے آفس میں طلب کیا تو بطور خاص اسے مخاطب کرکے کہا کہ ہمیں آپ سے یہ امید نہیں تھی۔

گویا اسے صفائی کا موقع دیے بغیر ہی مجرم قرار دیا گیا تھا۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ اس گروپ کے نزدیک کھڑا حسن سے باتیں کررہا تھا۔ جب اس نے سنا کہ سارہ نے ایک لڑکے کو ملکے سے دھکا دیتے ہوئے راسکل (بدمعاش) کہا۔ اس لڑکے نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر اسے انتہائی نامناسب القابات سے نوازا تھا۔

مہرز طنزیہ انداز میں مسکراتا ہوا ان کی لڑائی دیکھ رہا تھا۔ سارہ نے اپنی تضحیک کا بدلہ لینے کے لیے ان تمام لڑکوں کو شامل شکایت کرلیا جو اس وقت وہاں موجود تھے۔ باقی لڑکوں کو اس کارروائی سے اتنا فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ پہلے کون سا نیک نام مشہور تھے مگر مہرز کی ساکھ بہت متاثر ہوئی۔ یہ سب اس کے لیے تکلیف دہ تھا۔ اس کے والد اسی سال امریکہ شفٹ ہوگئے تھے اور اگلے تین سال تک ان کے آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ وہیں اپنا سارا بزنس سیٹ کرنے میں دن رات مصروف رہتے تھے۔ اپنی امی کو وہ یہ قصہ سنا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہاں وہ کس کس کو بتاتا کہ اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ بہت خاموش رہنے لگا تھا۔

اس واقعے کے تین دن بعد جب ایک صبح وہ حسب معمول ساڑھے سات بجے اسکول پہنچا اور اپنا بیگ سیٹ پر رکھنے کے لیے کلاس کے اندر جانے لگا تو دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر عائشہ، سمیرا، رامین اور فرح پر پڑی جو آپس میں اسی حوالے سے گفتگو کررہی تھیں۔ مہرز اپنا نام سن کر دروازے میں ہی رک گیا۔ ان سب کی پشت دروازے کی جانب تھی۔ اسی لیے وہ اسے آتا دیکھ نہیں پائی تھیں۔ عائشہ سارہ کے ساتھ دوستی کا حق ادا کررہی تھی، اس نے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے وہ سارہ سے فرینڈشپ کرنا چاہ رہا تھا۔ جب اس نے مہرز سے دوستی کرنے سے انکار کردیا تو وہ اسے تنگ کرنے لگا اور ان لڑکوں کو بھی وہی اکساتا تھا کہ اسے پریشان کریں۔"

"میں نہیں مانتی۔" مہرز کو رامین کی آواز سنائی دی۔ اس نے دروازہ تھوڑا اور کھول لیا۔ "مجھے بالکل بھی یقین نہیں ہے کہ مہرز ایسی گھٹیا حرکت کرسکتا ہے۔ وہ بہت ڈیسنٹ لڑکا ہے۔ ہم اسے دس سال سے دیکھ رہے ہیں۔ اس نے کبھی کوئی چیپ حرکت نہیں کی۔ نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا وہ لڑکیوں کی طرف، اتنی ریسپیکٹ کرتا ہے سب کی۔ تم لوگ سارہ کی بات کا یقین کرلوگی جو ابھی نئی آئی ہے۔ اس کی حرکتیں دیکھی ہیں؟ لڑکوں کے ساتھ بے تکلفی سے بیٹھ جاتی ہے۔ گپیں لگاتی ہے۔ ہاتھ پہ ہاتھ مار کے ہنستی ہے۔ چھٹی کے بعد ان کے ساتھ باسکٹ بال کھیل رہی ہوتی ہے۔ اتنا عجیب لگتا ہے۔ نو لڑکوں کے بیچ میں اکیلی لڑکی۔ سب اس سے ٹکراتے گزرتے ہیں۔ تب اسے برا نہیں لگتا۔ کم از کم میں تو اس کی بات پر یقین نہیں کرسکتی۔ یقیناً" وہ جھوٹ بول رہی ہے۔"

مہرز نے یہاں تک سن کر دروازہ آہستگی سے بند کردیا۔ رامین نے اس اسکینڈل میں مہرز کی ذات کو ہر الزام سے بری کردیا تھا۔ کوئی تو ہے جو اس پر بھروسا کرتا ہے۔ اور وہ ہستی پہلے ہی اس کے دل کے اتنے قریب تھی۔ اب کچھ اور اہم ہوگئی تھی۔

اس کے ساتھ بھی رامین کے رویے میں تھوڑی لچک پیدا ہوئی تھی۔ اس نے بات بے بات الجھنا اور

بحث کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اب ایک دم غصے میں بھی نہیں آتی تھی۔ اس کی بات کا سیدھا جواب دیا کرتی تھی۔ گو بچپن جیسی بے تکلفی نہیں تھی۔ پر مہرز کے لیے یہ بھی غنیمت تھا۔

رامین کے مزاج کی اس معمولی سی تبدیلی کو وہ کچھ زیادہ ہی اہمیت دے رہا تھا۔ یہ ان کا آخری سال تھا۔ دو مہینے بعد انہیں بورڈ کی تیاری کے لیے اسکول سے چھٹی مل جانی تھی۔ جہاں ٹیچرز جلد سے جلد سارا کورس مکمل کرنے کی کوشش تھے۔ وہیں ان کی جونیئر کلاسز انہیں فیرویل پارٹی دینے کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ جونیئر پریفیکٹس نے اپنے تمام سیکشنز میں پیسے جمع کرنا شروع کردیے۔ تمام ٹیچرز کو بھی مدعو کیا جانا تھا۔ ٹینتھ کلاس کے تین سیکشنز تھے۔ ان سب کے لیے ڈنر اور میوزک نائٹ کا اہتمام کیا جارہا تھا۔ جونیئر کلاسز چاہتی تھیں کہ اسکول ختم ہونے سے دو ہفتے پہلے ہی فیرویل پارٹی کا انعقاد ہو جائے' تاکہ تمام اسٹوڈنٹس کسی بھی قسم کی ٹینشن کے بغیر اپنی ریویژن کلاسز سے پہلے پارٹی انجوائے کرسکیں۔

اس کے علاوہ اسپورٹس ڈے کی بھی تیاریاں عروج پر تھیں۔ وہ سب یک دم بہت مصروف ہوگئے تھے۔ اس جوش خروش میں ایک دوسرے سے جدا ہو جانے کا ملال بھی شامل ہونے لگا تھا۔

مہرز نے ابھی تک رامین سے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کے خیال میں یہ مناسب نہیں تھا۔ ابھی اسے اپنا کیریر بنانا تھا۔ اس کے بعد دیکھی جاتی۔ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ رامین بھی اسے پسند کرتی ہے۔ اسے کبھی اندیشہ محسوس نہیں ہوا تھا کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور کی ہو جائے گی۔

فیرویل پارٹی کی شام اس نے اپنے سب کلاس فیلوز کے ساتھ تصویریں کھنچوا کر اپنے کیمرے میں محفوظ کیں۔ حالانکہ وہ رامین کے ساتھ اکیلے کھڑے ہو کر بھی ایک تصویر بنوانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ ناممکن تھا۔ رامین کبھی راضی نہ ہوتی۔ مہرز چاہتا تو اسے لاعلم رکھتے ہوئے حسن سے یہ کام لے سکتا تھا۔ مگر یہ اس کی فطرت کے خلاف ہوتا' دھوکا دینا اسے پسند نہیں تھا اور وہ رامین کی بہت عزت کرتا تھا۔

یہ خوب صورت شام ان کے دامن میں بہت سی خوب صورت یادیں بھرنے والی تھی۔ اسے یقین تھا۔ ڈنر کرتے ہوئے وہ سب لوگ ایک ہی ٹیبل کے گرد بیٹھے تھے۔ فرح' رامین' حسن اور مہرز... بیٹھے بیٹھے جانے حسن کو کیا ہوا کہ وہ بچوں کی طرح اپنی کرسی جھلانے لگا۔ اسی وقت فرح اپنے لیے سلاد لانے کے لیے اٹھی تو حسن نے گردن موڑ کر جاتی ہوئی فرح سے اپنے لیے کولڈ ڈرنک لانے کی فرمائش کردی۔ حسن کے یوں اچانک پیچھے دیکھنے سے کرسی کا بیلنس خراب ہوا۔ قریب تھا کہ حسن کرسی سمیت الٹ کر گرتا کہ مہرز نے سرعت سے کرسی کی پشت پر اپنا ہاتھ رکھ کر فوراً" اسے واپس دھکیل دیا۔

"کیا کررہے ہو حسن! تمیز سے بیٹھو گرنا ہے کیا؟"

"سوری..." حسن فوراً" شرمندہ سا ہو کر سیدھا ہوگیا اور اپنا کھانا کھانے لگا۔

رامین کو ہنسی آگئی۔ مہرز نے بھی اس کی طرف مسکرا کر دیکھا تو وہ کہنے لگی۔

"ویری گڈ۔ تو تم Muscleman بن ہی گئے۔" رامین نے اس کی برسوں پرانی خواہش کا ذکر ہنستے ہوئے کیا تو مہرز نے جواباً" اسے گہری نگاہوں سے دیکھا اور پھر کہا۔

"ہاں... لیکن تم مس نینسی سے زیادہ خوب صورت ہوگئی ہو۔" وہ ہنسنا بھول کر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ جبکہ مہرز یہ بات کہہ کر وہاں سے اٹھ گیا۔

اسے اندازہ نہیں ہوسکا کہ مہرز نے مذاق کیا تھا یا وہ سنجیدہ تھا۔ بہرحال وہ تھوڑی ڈسٹرب ہوگئی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ مہرز سے کوئی سوال کرتی' ساجد نے غزل گانا شروع کردی اور سب طرف خاموشی چھاگئی۔

تو اپنے دل کی جواں دھڑکنوں کو گن کے بتا
میری طرح تیرا دل بے قرار ہے کہ نہیں

رامین سر جھکائے غزل سن رہی تھی۔ اس شعر پر بے اختیار اس نے سر اٹھایا تو مہرز کو اپنی جانب متوجہ پایا۔ وہ جانے کب سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ رامین گڑبڑا سی گئی اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔ وہ بہت کنفیوز ہو رہی تھی۔

وہ پل کہ جس میں محبت جوان ہوتی ہے
اس ایک پل کا تجھے انتظار ہے کہ نہیں
دبا دبا سا ہی' دل میں پیار ہے کہ نہیں
جھکی جھکی سی نظر...

مہرز کو یقین سا ہو رہا تھا کہ رامین اس کے جذبات سے آگاہ ہو چکی ہے۔ اس خیال پر مہر ثبت ہوگئی جب رامین نے واپس جانے سے پہلے اپنی book Openion اسے گھر لے جانے کے لیے دی۔ کلاس کے کسی لڑکے نے ابھی تک رامین کی بک کو چھوا بھی نہیں تھا۔ یہ اعزاز صرف اسے ہی ملا تھا۔

تو کیا اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ مہرز پر اندھا اعتماد کرتی ہے اور اس اعتماد کی وجہ محبت کے علاوہ اور کیا ہوسکتی تھی؟

☼ ☼ ☼

فیرویل کے بعد ہفتہ اور اتوار بہت پریشانی میں گزرا۔ مہرز سے بے خیالی میں ایک بہت بڑی غلطی ہوگئی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ رامین کو خود ہی جاکر بتادے گا اور معافی بھی مانگ لے گا۔

پیر کی صبح وہ جیسے ہی اسکول پہنچا۔ اس کی نگاہیں رامین کو ڈھونڈنے لگیں۔ وہ کلاس میں نہیں تھی لیکن اس کا بیگ سیٹ کے پاس ہی رکھا ہوا تھا۔ اس نے کاریڈور میں آکر دیکھا تو رامین فرح کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ کافی بھیڑ تھی' آمنے سامنے کلاسز کے بہت سے اسٹوڈنٹس کاریڈور میں کھڑے باتیں کررہے تھے کہ اسمبلی شروع ہونے میں ابھی کافی وقت تھا۔ مہرز ان کے نزدیک پہنچا تو سب سے پہلے فرح کی نظر اس پر پڑی۔ اس کے کہنے پر رامین نے مڑ کر اسے دیکھا۔ مہرز کی صورت دیکھتے ہی وہ تیز تیز چلتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی۔ مہرز نے ابھی سوری کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ رامین اس پر برس پڑی۔

"کہاں ہے میری opinion book ۔" وہ بہت غصے میں نظر آرہی تھی اور اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"تم نے میرے گھر فون کیا تھا؟ میری ماما سے کہا کہ میں تمہاری گرل فرینڈ ہوں؟" وہ کیا کہہ رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آیا۔ مہرز ہکا بکا اس کی شکل دیکھنے لگا۔

مہرز سے رامین کی opinion book کھوگئی تھی اور وہ یہی بتانے کے لیے اس کے پاس آیا تھا لیکن وہ اس پر کچھ اور ہی الزام لگا رہی تھی۔ وہ بھی اس طرح بھرے مجمع میں... مہرز کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ اپنی آواز دبا کر بولا۔

"میں نے تمہارے گھر فون نہیں کیا۔ تمہاری بک کھوگئی ہے مجھ سے... آئی ایم سوری۔ لیکن فون میں نے نہیں کیا تھا۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" وہ اس کی بات کا یقین کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں سوج رہی تھیں' جیسے بہت زیادہ روتی رہی ہو۔ وہ پھر اسے لتاڑنے لگی۔ "میرے گھر کا نمبر اسی بک میں تھا اور وہ تمہارے پاس تھی۔ تم ہی نے فون کیا تھا میرے گھر اور میری ماما سے الٹی سیدھی باتیں کی تھیں۔"

فرح نے آگے بڑھ کر رامین کو روکنے کی کوشش کی لیکن اس نے ایک نہیں سنی اور جو منہ میں آیا کہتی رہی۔ اسے بالکل پروا نہیں تھی کہ بہت سے اسٹوڈنٹس ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے مگر مہرز کو تھی۔ رامین کو جو بھی غلط فہمی ہوئی تھی۔ اسے اکیلے میں دور کرنا چاہیے تھا۔ اس طرح تماشا بنا کر سب کو ہرزہ سرائی کا موقع دینا کوئی عقل مندی نہیں تھی۔ وہ کب تک برداشت کرتا رہتا۔ آخر وہ بھی غصے میں چلا اٹھا۔

"مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے ایسی گھٹیا حرکتیں کرنے کی' میں بہت پہلے سے تمہارا فون نمبر جانتا

ہوں۔ وہ کال میں نے نہیں کی اور اگر تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں تھا تو دی کیوں تھی اپنی book ـــــ نہ دیتیں' میں نے تمہاری مِنتیں نہیں کی تھیں۔"

رامین خاموش ہوگئی۔ معیز غصے میں پیر پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ معیز نے جواباً" اس پر غصہ نکالا تھا۔ اس نے بھی تو حد کردی تھی۔

ایک بار پھر وہ اسکول میں ہاٹ ٹاپک بن چکا تھا۔ رامین اس کے ساتھ اس طرح بات کرے گی۔ اسے یوں سب کے سامنے ذلیل کرے گی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ شدید غم و غصے کی حالت میں وہ اس دن اسکول سے نکلا تھا۔ اس دن کے بعد وہ دوبارہ وہاں نہیں گیا تھا۔ وہ رامین کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

اسٹوڈنٹس کی معنی خیز شک بھری نگاہوں کا سامنا کرنے کی اب اس میں ہمت نہیں تھی۔ وہ گھر پر رہ کر بھی اپنے ایگزام کی تیاری کرسکتا تھا۔ مشکل تو تھا' لیکن اس نے کوشش کرکے سب کچھ بھلا کر اپنا سارا دھیان پڑھائی کی طرف کرلیا۔

لڑکے' لڑکیوں کے امتحانی مرکز مختلف تھے۔ اس واقعے کے بعد ان دونوں کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔

بورڈ کا رزلٹ جاری ہوا تو معیز نے فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی اور فرح علیم فقط تین نمبروں کے فرق سے سیکنڈ آئی تھی۔ اپنی مارکس شیٹ لینے وہ حسن کے ساتھ اسکول گیا تھا۔ ایڈمنسٹریشن میں کوئی مسئلہ چل رہا تھا۔ جس کے باعث ان کی ایوارڈ سرمنی نہیں کی جارہی تھی۔ ٹیچرز اور پرنسپل سے آخری ملاقات کرکے وہ دونوں باہر آگئے۔ اسی وقت رامین اپنی گاڑی سے نکل رہی تھی۔ معیز کو دیکھ کر وہ اس کی طرف بڑھی۔ وہ بھی اسے دیکھ چکا تھا لیکن ملنا نہیں چاہتا تھا۔ حسن کے روکنے کے باوجود وہ تیزی سے اپنی گاڑی میں جاکر بیٹھ گیا اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔ رامین نم آنکھوں سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

جی سی کالج سے ایف ایس سی کرنے کے بعد معیز TOPI چلا گیا۔ اسے GIKI میں ایڈمیشن مل گیا تھا۔ اس کی رہائش کا بندوبست ہاسٹل میں ہوا اور وہ اپنا ضروری سامان لے کر اسلام آباد چلا گیا۔ جہاں سے انسٹی ٹیوٹ کی بس تمام اسٹوڈنٹس کو لے کر تربیلا سے آگے وسیع و عریض رقبے پر تعمیر شدہ خوب صورت عمارتوں کے جھرمٹ میں پہنچ گئی۔ غلام اسحاق خان انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرنگ شہری آبادی سے دور ہونے کے باعث اسٹوڈنٹس کو تمام سہولیات درس گاہ میں ہی فراہم کررہا تھا۔

معیز نے یہاں بھی غیر معمولی کارکردگی دکھائی اور ہر سمسٹر میں پوزیشن لیتا رہا۔ اسے دن رات پڑھائی کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا تھا۔ بیتا ہوا کل جیسے کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھا ہی نہیں۔ وہ اس طرح اپنے ماضی سے پیچھا چھڑا بیٹھا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر حسن سے بھی ہر قسم کا رابطہ توڑ رکھا تھا۔ حسن کے مختلف میسجز اکثر اس کے منتظر ہوتے۔ اس کے باوجود وہ نہ اسے فون کرتا' نہ ہی کوئی پیغام چھوڑتا تھا۔ پتا نہیں وہ اسے کیوں نظرانداز کررہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کے گریجویشن کا ابھی دوسرا سال تھا۔ وہ کچھ دنوں کے لیے لاہور آیا تھا۔ کچھ کپڑے خریدنے کے لیے وہ شاپنگ مال پہنچا۔ شاپ کے اندر وہ ہینگرز پر لگی شرٹس آگے پیچھے کررہا تھا کہ اپنے کندھوں پر اسے کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو وہ حسن تھا۔

"نئے دوست بنالیے تو پرانے دوستوں کو بالکل بھول گیا؟" حسن کے شکستہ لہجہ میں اس کے گزشتہ رویے کا شکوہ تھا۔ معیز نے کوئی جواب دیے بغیر آگے بڑھ کر اسے گلے لگالیا۔ حقیقتاً" اسے حسن کو دیکھ کر خوشی ہورہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں وہ دونوں کیفے میں ساتھ بیٹھے گپیں لگارہے تھے۔ کھانا آرڈر کرنے کے بعد حسن نے اپنی زندگی کے حوالے سے کچھ باتیں کیں اور معیز سے اس کے کام کے بارے میں پوچھتا رہا۔ مختصراً" اپنی اسٹڈیز کے بارے میں بتاتے ہوئے معیز کو اچانک خیال آیا۔

"کچھ معلوم ہے دوسرے کلاس فیلوز کہاں ہیں۔۔۔ کیا کررہے ہیں؟"

"چند ایک سے رابطہ ہے۔ فیصل اور فرح تو کنگ ایڈورڈ میں ہیں' باقی کا معلوم نہیں۔"

"تمہارا فرح سے رابطہ رہتا ہے۔"

"نہیں' اس سے اولڈ اسٹوڈنٹس گیٹ ٹوگیدر میں ملاقات ہوئی تھی چھ ماہ پہلے' وہیں بتایا تھا اس نے۔" ویٹر ان کے سامنے کھانا رکھ کر چلا گیا۔ کھانے کے دوران حسن بولا۔

"معیز! تمہیں رامین یاد ہے؟" اور معیز کا ہاتھ جہاں تھا' وہیں رک گیا۔ وہ بھلا اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ اس نے اپنا کانٹا پلیٹ میں واپس رکھا اور گلاس ہاتھ میں لے لیا۔ وہ حسن کی طرف دیکھنے سے دانستہ گریز کررہا تھا جو بغور اس کی ہر ہر حرکت کو نوٹ کررہا تھا۔ کافی دیر بعد اس نے حسن کو جواب دیا تھا۔

"کیوں۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" حسن کو محسوس ہوا کہ معیز اس ذکر سے ڈسٹرب ہوا ہے۔

"تم نے اس دن کے بعد اسکول آنا ہی چھوڑ دیا تھا' ورنہ۔۔۔"

"پلیز حسن۔۔۔ میں اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔" معیز کا ضبط جواب دے گیا۔

"تم ایک بار سن تو لو۔۔۔ کہ اسے یہ غلط فہمی کیوں ہوئی تھی۔"

"نہیں حسن۔۔۔ اسے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی تھی۔ میری تو شکل پہ لکھا ہے کہ میں آوارہ بدمعاش ہوں۔۔۔ اور مجھے لڑکیوں کے پیچھے بھاگنے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے۔" معیز نے زور سے اپنا گلاس میز پر پٹختے ہوئے غصے سے کہا۔

"تمہیں نہیں لگتا تم سارہ کا غصہ رامین پر نکال رہے ہو۔" حسن نے احساس دلانے کی کوشش کی' معیز بپھر گیا۔

"تو کیوں نہ نکالوں؟ اس نے بھی میرے ساتھ وہی کیا جو سارہ نے کیا تھا۔ بے عزت کردیا تھا مجھے سب کے سامنے۔" معیز کے سخت لہجے میں صرف شکوہ ہی نہیں' عزت نفس کی پامالی کا دکھ بھی بول رہا تھا۔

"نہیں معیز۔۔۔ سارہ نے تم پر جھوٹا الزام لگایا تھا جبکہ رامین۔۔۔" حسن کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ بدک گیا۔

"تمہارا مطلب ہے رامین کا مجھ پر اس طرح شک کرنا صحیح تھا۔ تم اس کی سائیڈ لے رہے ہو؟"

"میں کسی کی سائیڈ نہیں لے رہا ہوں۔۔۔ تم میری بات تو پوری ہونے دو۔" معیز گہری سانسیں لے کر اپنے آپ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں کرسی کی پشت پر سر ڈال کر دونوں ہاتھوں سے اپنا ماتھا سہلانے لگا۔ اضطراب اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہا تھا۔ حسن نے اسے کول ڈاؤن کرنے کے بعد دوبارہ وہیں سے سلسلہ کلام جوڑا۔

"دیکھو۔۔۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ سارہ نے جان بوجھ کر تم پر جھوٹا الزام لگایا تھا' لیکن رامین کو غلط فہمی ہوئی تھی اور وہ اس میں حق بجانب تھی۔" معیز نے کچھ کہنے کے بجائے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"مجھے معلوم ہے وہ فون تم نے نہیں کیا لیکن کسی نے تو کیا تھا نا۔" حسن نے اس کے غصے کی پروا کیے بغیر اپنی دلیل پیش کی تھی۔

"کسی لڑکے نے اس کے گھر فون کرکے اس کی ماما سے کہا کہ وہ رامین کا بوائے فرینڈ ہے۔ رامین اس کے پاس اپنی opinion book بھول گئی ہے۔ وہ گھبرائے نہیں۔ جب منڈے کو وہ اسکول آئے گی تو وہ اسے واپس کردے گا۔" حسن نے ساری گفتگو من و عن اس کے گوش گزار کردی۔

"تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟" معیز سیدھا ہو بیٹھا۔

"فرح نے گیٹ ٹوگیدر میں جب ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا۔۔۔ تم سوچو معیز۔۔۔ کلاس فور میں ہمارے سامنے اس کے پاپا نے کیا کیا تھا؟ اب جب اس طرح

کی کوئی کال موصول ہوئی ہوگی تو انہوں نے کیا کیا ہوگا؟" مہرز خاموش رہا۔ اس نے واقعی اس پہلو سے نہیں سوچا تھا۔

"ہمارا معاشرہ بہت عجیب ہے یار! میرے یا تمہارے گھر میں اس طرح کوئی لڑکی فون کرتی تو ہمارے گھر والے ہمیں برا بھلا نہ کہتے اس لڑکی کو آوارہ اور بدچلن کہا جاتا۔ لیکن کسی لڑکی کے گھر اس طرح کے فون آنے پر اس لڑکے کو موردِ الزام ٹھہرانے کے بجائے لوگ اپنی بیٹیوں پر شک کرتے ہیں۔" حسن نے تاسف سے سرہلایا۔

"تم یا میں اس پر ٹوٹنے والی مصیبت کو کم نہیں کرسکتے۔ لیکن کم از کم یہ انڈر اسٹینڈ تو کرسکتے ہیں کہ اس کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ اس نے اپنی بک تمہیں دی تھی۔ تمہاری لاپروائی۔۔۔ تم نے اسے سنبھال کر نہیں رکھا' جانے کس کے ہاتھ لگی تھی۔ کیا ہوا تھا۔ وہ تو یہی سمجھی تھی کہ یہ حرکت تمہاری ہے۔ میں اس کی جگہ ہوتا تو میں بھی یہی خیال کرتا۔"

"اسکول میں تمہاری بات ہوئی تھی رامین سے۔۔۔ کچھ کہا تھا اس نے؟" مہرز کا غصہ ٹھنڈا ہوچکا تھا۔

"نہیں۔" حسن نے ایک گہری سانس لی۔ "اس دن وہ بھی آخری دفعہ اسکول آئی تھی۔ اس کے بعد نہ تم آئے نہ وہ۔ فرح بھی اس سے رابطہ کرنے میں ناکام رہی تھی۔ اس کے گھر کا فون نمبر تبدیل ہوگیا تھا۔ پھر ایگزامز شروع ہوگئے۔ تب ملی تھیں وہ آپس میں۔ مجھے تو یہ سب ابھی چند ماہ پہلے معلوم ہوا ہے۔ فرح بتا رہی تھی کہ اس کے والدین بہت سختی کرتے ہیں اس پر۔ کہیں آنے جانے نہیں دیتے۔ کالج میں آنے کے باوجود اسے کسی قسم کی آزادی نہیں ہے۔"

رامین پر کیا گزر رہی ہے۔ حسن نے مقدور بھر کوشش کی تھی اسے سمجھانے کی۔ اسے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مہرز اس سے کہیں بہتر سمجھ سکتا تھا کہ رامین کیا محسوس کررہی ہوگی۔ وہ اپنے برہم دل کی پکاران سنی کرتا ایک بار پھر دل کے اس خانے کے پاس جا پہنچا تھا جہاں رامین کے لیے صرف محبت ہی محبت تھی۔ اپنے اس جذبے کو پروان چڑھانے کے لیے اسے کبھی کوئی تردد نہیں کرنا پڑا تھا۔ ایک خودرو پودے کی طرح وہ محبت بنا کسی دیکھ بھال کے دن بدن پھلتی پھولتی رہی تھی۔ مشکل تو اسے رامین سے خفا ہونے اور اس خفگی پر قائم رہنے میں پیش آئی تھی۔ اس سے دور رہنے میں ہوئی تھی۔

اب جبکہ وہ جان گیا تھا کہ وہ پریشان ہے۔ جس طرح وہ اس کے بغیر اداس اور پریشان رہتا ہے۔ وہ اس کے پاس جانا چاہتا تھا' اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔

بے کل' بے تاب۔ وہ اپنے گھر کے لان میں یہاں سے وہاں چکر لگاتا رہا۔ اسے چین ہی نہیں آرہا تھا۔ اسے رامین کی آواز سننی تھی۔ اس سے کہنا تھا کہ وہ اس سے خفا نہیں ہے۔ اسے رہ رہ کر افسوس ہورہا تھا کہ آخری بار جب وہ اس سے بات کرنے کے لیے آگے بڑھی تو وہ اس سے دور کیوں چلا گیا تھا۔ شاید تب وہ اسے جتانا چاہتا تھا کہ وہ ہرٹ ہوا ہے۔ رامین کے غلط سلوک پر ردعمل ظاہر کرتے وقت وہ یہ کیوں بھول گیا تھا کہ اسے تکلیف دے کر وہ خود بھی کبھی خوش نہیں رہ سکتا تھا۔

وہ لاکھ اس سے دور رہتی۔ دل سے بے حد قریب تھی۔ ہمیشہ سے تھی۔ اور ہمیشہ رہنے والی تھی۔

مہرز بے قرار ہوکر گھر کے اندر چلا آیا۔ فون اٹھایا اور رامین کا نمبر ملانے لگا۔ آخری ہندسہ دبانے سے پہلے اس کی انگلی ساکت ہوگئی۔ پورا نمبر نہ ملانے کی وجہ سے انگیج ٹون بجنے لگی تو وہ ہوش میں آیا۔ اس نے ڈس کنیکٹ کرنے کے بعد دوبارہ پورا نمبر ملانا شروع کیا۔ لیکن اس بار بھی وہی ہوا' آخری دو ہندسے ملانے سے پہلے اس کا ہاتھ جہاں کا تہاں رک گیا۔ آخر وہ کر کیا رہا تھا۔ ایک کال۔ فقط ایک کال ہی تو کرنے جارہا تھا۔ بھلا فون کرنے سے پہلے کوئی اتنا سوچتا ہے؟ لیکن وہ سوچ رہا تھا۔

ایک فون پہلے بھی رامین کے گھر آیا تھا جو اس نے نہیں کیا تھا۔ تب کیا ہوا تھا؟ وہ آج جان گیا تھا۔ لیکن یہ ایک فون جو وہ کرنے جارہا ہے۔ اس کے بعد رامین کے ساتھ کیا ہوتا۔ وہ زندگی بھر نہیں جان پائے گا۔ وہ ایک غلطی جو اس نے پہلے نہیں کی تھی۔ کیا اب کردیتا؟

"نہیں۔ وہ ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے فون کا ریسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا۔

لڑکے بلاسوچے سمجھے کچھ بھی کرگزرتے ہیں۔ بے لگام جذبوں کو مہار ڈالنا شرافت کا اولین تقاضا ہے لیکن اپنے نفس کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے بے تاب عاشق۔ اس لڑکی کا نہیں سوچتے جو بے جرم معتوب ٹھہرا دی جاتی ہے۔ محبت مجبور تو ہوسکتی ہے ظالم نہیں۔ اور وہ رامین سے محبت کرتا تھا اس لیے بے بس تھا۔ مجبور تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ فون نہیں کرسکا تھا۔ اس شام رامین کے گھر جا پہنچا تھا۔ شاید اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے۔ اس کی کار نزدیک آنے سے پہلے رامین کے پاپا آراستہ محل کا گیٹ کھلوا کر اپنی کار اندر داخل کررہے تھے' پھر گیٹ بند کردیا گیا تھا۔ مہرز لب بھینچے باہر سڑک پر اپنی کار میں بیٹھا اس محل کی طرف دیکھنے لگا' جہاں وہ شہزادی قید تھی۔ جس کے گیسو نہ تو اس قدر دراز تھے کہ اپنے محبوب کو چوری چھپے بے در مینار سے اوپر کھینچ لیتی۔ نہ ہی اس کی آہ و فغاں پر تڑپ کر کوئی پری جادو کی چھڑی سے کسی کدو کو بگھی میں تبدیل کرنے والی تھی کہ وہ اپنے راجکمار کے محل تک خود ہی پہنچ جاتی۔ اس کی تو ماں بھی سوتیلی نہیں تھی کہ شکاری کو جنگل میں اس کے ہمراہ بھیج کر اسے قتل کرنے کا حکم دیتی اور وہ بھاگ کر اپنی جان بچا کر بونوں کی مدد سے اس کے پاس پہنچ سکتی۔ اس کے باہر آنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ وہ فقط سوئے ہوئے محل کی سوئی ہوئی اس شہزادی کی مانند تھی جس کی محبت حاصل کرنے کے لیے شہزادے کو سو سال انتظار کرنا تھا۔ سو سال بعد ہی وہ خاردار جھاڑیوں سے گھرے اس محل کی حدود پار کرسکتا تھا۔

وہ بہت دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ اسے نہیں معلوم تھا وہ اور کتنی دیر یہاں بیٹھا رہے گا۔ شاید ساری رات بیٹھا رہتا۔ ساری عمر بیٹھا رہتا کہ سو سال پورے ہونے میں تو ابھی بہت وقت باقی تھا۔

☼ ☼ ☼

"ماجد کا فون آیا تھا۔" اس کی امی نے کافی کا مگ اس کے سرہانے رکھتے ہوئے اسے مطلع کیا۔ "انہیں امریکن شہریت مل گئی ہے۔ انہوں نے کچھ پیپرز منگوائے ہیں۔ پھر ہمیں بھی بلالیں گے اپنے پاس۔"

مہرز نے ٹی وی کی آواز بند کردی اور بستر پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ان کی بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا' بس خاموشی سے اپنا مگ اٹھا کر کافی کے گھونٹ بھرنے لگا۔ وہ یوں بھی کم بولتا تھا۔ اس کی امی کو عادت تھی۔ ان کی دس باتوں کے جواب میں ہوں ہاں کے علاوہ مہرز کے منہ سے کچھ اور بات نکلتی تو وہ فوراً" کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتیں کہ شاید سورج مغرب سے نکلا ہے۔ ویسے انہیں اس سے کوئی شکایت نہیں تھی اور نہ ہی اس نے اس نے موقع دیا تھا۔

"تمہارا گریجویشن مکمل ہونے میں ابھی دو سال ہیں۔ سوچتی ہوں اس کے بعد تمہاری شادی کردوں۔ پھر ہم سب امریکہ چلے جائیں گے۔"

"مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔" اپنی کافی ختم کرتے ہی اس نے مگ ایک طرف رکھا اور کمبل ہٹا کر بستر سے نکل کر کھڑا ہوگیا' اور الماری سے کپڑے نکالنے لگا۔

"ابھی نہیں ہوگی شادی۔" وہ اپنا رخ اس کی جانب کرتے ہوئے بولیں۔ "بس لڑکی ڈھونڈنا شروع کروں گی۔ اس میں تھوڑا ٹائم نکل جائے گا' پھر جیسے ہی میرے بیٹے کے لائق اچھی سی لڑکی ملی' منگنی یا نکاح وغیرہ کردیں گے اور اس کے بھی پیپرز بنوالیں گے۔ یوں جانے میں کس وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔"

وہ ان کی پلاننگ سن کر مسکرا دیا۔

"آپ تو بہت دور کا سوچ رہی ہیں۔ ویسے فی الحال میں اس جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا۔ جب گردن پھنسانی ہوگی۔ بتادوں گا آپ کو۔" وہ ساتھ ساتھ اپنے کپڑے پریس کر رہا تھا۔

امی نے ٹیبل سے مگ اٹھایا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے پلٹ کر مہرز کی طرف دیکھا اور اس کے نزدیک آکر پیار سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ مہرز پہلے تو حیران ہوا' پھر اس کے سنجیدہ چہرے پر نرم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"کیا ہوا ہے مہرز! مجھے تم خوش نہیں لگتے۔"

مہرز نے امی کو پریشان دیکھا تو اسے افسوس سا ہونے لگا۔ گو اس نے کبھی اپنے رویے سے ظاہر نہیں کیا تھا' پر ان سے چھپانا مشکل تھا۔

"آپ کو کیوں لگتا ہے کہ میں خوش نہیں ہوں۔"

وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر کرسی تک لے کر آیا اور آہستگی سے انہیں بٹھا کر اپنا سر ان کی گود میں رکھ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگیں۔

"مجھے ایسا لگتا ہے۔ باتونی تو تم پہلے بھی نہیں تھے' لیکن تمہاری آنکھیں جگمگاتی تھیں۔ مسکراتے رہتے تھے تم' اب مجھے تمہاری آنکھوں میں گہرا دکھ نظر آتا ہے۔ مجھے نہیں بتاؤ گے۔ ماں ہوں تمہاری۔" وہ دلار سے پوچھ رہی تھیں۔

"کچھ نہیں امی! پڑھائی کا اسٹریس زیادہ ہے۔ تھک جاتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ جب آپ کا بیٹا میکنیکل انجینئر بن جائے گا اور اچھی سی جاب حاصل کرلے گا نا۔ تب آپ مجھے ہمیشہ مسکراتا دیکھیں گی۔" ماں نے یقین کرلیا۔ مائیں بہت جلد یقین کرلیتی ہیں۔

مہرز ان سے کیا کہتا' جو اسے چاہیے تھا وہ دینا کسی کے بس میں نہ تھا۔ اس کی آنکھ سے بغیر اجازت چند آنسو ٹپکے اور اس کی ماں کے دامن میں جذب ہوگئے۔

کچھ دن پہلے اس نے رامین کو اس کے منگیتر کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ دونوں شاپنگ کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر خاتون بھی تھیں' جو شاید اس لڑکے کی والدہ تھیں۔ مہرز ان کی طرف اس وقت متوجہ ہوا 'جب اس شخص نے رامین کا نام لے کر اسے پکارا تھا۔ مہرز نے فوراً" مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ کتنے سالوں سے اسے دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ لیکن اس طرح؟ یوں کسی اور شخص کے ساتھ۔۔۔ ہرگز نہیں۔

وہ شخص کتنے استحقاق سے اس کا نام لے رہا تھا۔ مہرز کا دل دکھ سے بھر گیا۔ رامین کو تو اس نے چاہا تھا۔ وہ کسی اور کے ساتھ کیوں تھی؟ اسے مہرز کا نہیں ہونا تھا تو پھر۔ اس کے دل میں کیوں بس گئی تھی؟ رامین کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ فوراً" وہاں سے چلا آیا تھا۔

اپنے گھر آکر۔ اپنے کمرے میں بند ہو کر۔ وہ زندگی میں پہلی بار رویا تھا۔ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر۔ اسے صبر آکے نہیں دے رہا تھا۔ پھر۔۔۔ جانے کیوں اس نے وہ کام کیا۔ جو پہلے کبھی کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھادیے۔ بہت تڑپتے ہوئے' دل سے دعا مانگی۔

"یا اللہ! وہ شخص رامین کو چھوڑ کر چلا جائے۔ میں اس لڑکی کو اپنے لیے چاہتا ہوں۔ اسے میرا نصیب کردے۔ وہ مجھے مل جائے۔" وہ دعا مانگ کر رکا نہیں تھا۔ کافی دیر تک روتا رہا تھا۔

شام کو وہ رامین کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا تھا۔ اس کے دل کا سکون جانے کیوں اسے یقین دلا رہا تھا کہ اس کی دعا قبول ہوگئی ہے لیکن وہاں پہنچ کر اسے علم ہوا کہ وہ خالی ہاتھ لوٹا دیا گیا تھا۔ رامین کا شان دار گھر رنگ و نور کے سیلاب میں ڈوبا ہوا تھا۔ باہر گیٹ پر اپنی کار پارک کرکے جب وہ اندر داخل ہوا تھا تو کچھ انجان چہروں نے مہمان سمجھ کر اس کا استقبال کیا۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ کر اسٹیج کی طرف آیا' جہاں رامین نکاح کے بعد دلہن بنی اپنے شوہر کے ساتھ بیٹھی تھی اور مسکراتے ہوئے آنے والوں کی مبارک باد وصول کر رہی تھی۔ مہرز جس خاموشی سے وہاں آیا تھا' اسی طرح واپس ہولیا۔

☆ ☆ ☆

محسنہ نے ہلکے نیلے روغن شدہ لکڑی کے دروازے سے لٹکتی زنجیر کھڑکھڑائی۔ کچھ لمحوں کا انتظار بھی جان لیوا تھا۔ دروازہ کھل گیا۔

"اتنی دیر لگادی؟" گھر میں داخل ہوتے ہی محسنہ نے برقعہ اتار کر مہ جبیں کو پکڑایا۔ مہ جبیں نے سر پر تولیہ لپیٹ رکھا تھا' ماں کا برقعہ تہ کرتے ہوئے بولی۔

"بس امی جی' نہانے چلی گئی تھی۔"

"ہانڈی چڑھائی تو نے؟" محسنہ صحن میں رکھے موڑھے پر بیٹھ گئیں اور دستی پنکھا جھلاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں امی جی۔۔۔ اسکول کا کام ختم کرکے نہانے چلی گئی تھی۔"

"کیا؟ ابھی تک ہانڈی نہیں چڑھائی تو نے؟ ساڑھے چھ بج رہے ہیں' کب کرے گی؟" انہیں غصہ ہی آگیا۔

"میں آپ کرلوں گی۔۔۔ تو نہ آنا بورچی خانے ماں۔" وہ ناراض ہوتی اٹھنے لگیں کہ مہ جبیں نے منع کیا۔

"اوہو' امی جی' غصے نہ ہو۔ میں آلو چڑھادوں گی' جلدی پک جاویں گے۔"

"رہن دے۔۔۔ آلو چڑھاوے گی۔" محسنہ نے خفگی میں اس کی بات دہرائی۔ "ایک کم کیا سی۔۔۔ اودی نہ ہووے تجھ سے۔۔۔ میری ایسی حالت' رشتہ داریاں نبھاؤں' سودے لاؤں' بچے پالوں' کھانے پکاؤں۔۔۔ ہر وقت اپنی ہڈیاں ساڑھوں' تم بچیاں سے کوئی آسرا نہ ہووے' ماں تکی مرجائے۔" محسنہ اٹھ کر باورچی خانے میں پیڑھی پر بیٹھ کر پیاز چھیلنے لگیں۔

مہ جبیں نے زبردستی ان کے ہاتھ سے چھری لی اور انہیں کمرے میں چھوڑ کر آئی۔ ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ باورچی خانے میں پیڑھی پر بیٹھ کر کام کرسکتیں' محسنہ کے ہاں پانچویں بچے کی آمد نزدیک تھی۔ دائی نے متوقع دن مہینے کا آخر بتایا تھا۔ مہ جبیں ان کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔ اس کے بعد محسنہ کا ایک بچہ کوکھ میں ہی ضائع ہوگیا تھا۔ پھر ایک بیٹا طارق تھا۔ جو چھ سال کا ہوچکا تھا۔ طارق کے بعد ایک اور بیٹا ہوا تھا۔ جو ڈیڑھ سال کی عمر میں ہی انتقال کرگیا تھا۔ اب جبکہ مہ جبیں تیرہ سال کی ہو رہی تھی' محسنہ ایک بار پھر امید سے تھیں۔ مہ جبیں حتی المقدور ان کا خیال رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔

ہنڈیا چڑھا کر وہ ہاتھ دھو کر گیلے ہاتھ اپنے دوپٹے سے پونچھتی ماں کے پاس کمرے میں آئی۔

"لاؤ ماں جی! پیروں کی مالش کردوں۔۔۔ سوجن کم ہوجاوے گی۔" محسنہ نے خاموشی سے چارپائی پر پاؤں پھیلا دیے۔ سوجے ہوئے پاؤں پر نیلی رگیں پھول کر بہت نمایاں نظر آرہی تھیں۔ مہ جبیں نے تاسف سے ماں کی حالت دیکھی اور آہستہ آہستہ تیل ملنا شروع کردیا۔

"اس بار ابا جی آئیں تو انہیں جانے نہ دینا امی جی۔" اس نے کہا۔

"تو تو کیا سمجھے ہے' میں نے نہیں کہا' ہزار بار کہا پر وہ میری کہاں سنے۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔

☆ ☆ ☆

"السلام علیکم پروفیسر صاحب۔۔۔ کیسے مزاج ہیں آپ کے؟" انیس صاحب اسٹاف روم میں داخل ہوتے ہی شاکر علی کی جانب بڑھے اور ان سے ہاتھ ملا کر ان کی خیر خیریت دریافت کی اور مبارک باد دینے لگے "مبارک ہو' سنا ہے آپ کوئی کتاب لکھ رہے ہیں۔"

"جی! آپ کو ملنے والی اطلاع درست ہے۔" شاکر علی نے تصدیق کردی۔ انیس صاحب ان کے سامنے کرسی پر براجمان ہوگئے۔

"ویسے میں ابھی تک ورطہ حیرت میں ہوں کہ ہمارے ملک کو وجود میں آئے فقط دس گیارہ برس ہی گزرے ہیں۔ ابھی سے کیا لکھیں گے۔"

"اس پر بھی کتاب لکھوں گا' اگر زندگی نے وفا

کی۔ شاکر علی کا لہجہ یکایک ہی بدلا تھا۔ "ویسے میں آپ کی معلومات کے لیے یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں دراصل مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ سے کتاب کا آغاز کررہا ہوں اور اختتام کی طرف بڑھتے ہوئے اسے ملک کی موجود صورت حال تک لے کر آؤں گا۔"

وہ اپنے کام سے متعلق کسی قسم کی نکتہ چینی برداشت نہیں کرتے تھے۔

"تو بھی انگریزی میں کیوں لکھ رہے ہیں؟ یوں اس کتاب سے ہمارے عوام کی اکثریت استفادہ نہیں کرپائے گی۔"

پروفیسر شاکر علی اپنی چائے ختم کیے بغیر ہی جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"انیس صاحب! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں کتاب شائع ہونے کے بعد خصوصاً" آپ جیسے افراد کے لیے اس کا اردو ترجمہ کرواؤں گا اور آپ کے لیے آپ کے گاؤں والے گھر کے پتے پر ارسال کروں گا... آپ بھینسوں کے باڑے سے متصل اپنے مکان کے کچے صحن میں دھوتی باندھے چارپائی پر بیٹھ کر حقہ پیتے ہوئے میری کتاب کو پڑھئے گا اور استفادہ کرنے کی ناکام کوشش کیجئے گا۔" پروفیسر شاکر نے اپنی بھاری بھرکم کتابیں اوپر تلے رکھ کر ہاتھوں میں اٹھالیں۔ "معذرت چاہتا ہوں... میری کلاس کا وقت ہورہا ہے' اللہ حافظ۔"

انیس صاحب اس قدر حیران پریشان ہوئے کہ ان سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ جب شاکر علی اسٹاف روم سے باہر نکل گئے تو ساتھ والی کرسی پر موجود نذرالسلام سے مخاطب ہوئے۔ "یہ شاکر میاں تو نہایت بدلحاظ انسان ہیں' دیکھئے! کیسے ہمارے دیہاتی ہونے کا طعنہ دیا۔"

"آپ جانتے تو ہیں کہ وہ صرف تعریف سننا پسند فرماتے ہیں۔"

"ہاں میاں۔" انیس صاحب نے اپنی عینک اتار کر جیب سے رومال نکال لیا۔ "تھوڑے مغرور ہیں... لیکن... قابل بھی تو بہت ہیں۔" انہوں نے رومال سے اپنی عینک صاف کی۔ "اب یہی دیکھ لیں... ان کی تیسری کتاب چھپ کر آچکی ہے اور چوتھی تقریباً" مکمل ہے۔" انہوں نے دوبارہ اپنی عینک پہن لی۔

"تھوڑے نہیں' اچھے خاصے مغرور ہیں۔ آپ نے فقط اپنی رائے کا اظہار ہی تو کیا تھا۔ بھلے ہی عمل نہ کرتے اور قابل ہونے کی کیا بات ہے؟ وہ تو آپ بھی ہیں لیکن اپنی عاجزی اور انکساری کے سبب ذرا بے نیاز سے رہتے ہیں۔" انیس صاحب سر جھکا کر مسکرا دیے۔ نذرالاسلام نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

"ویسے سننے میں آیا ہے۔ ان کی اپنے گھر والوں سے بھی نہیں بنتی' خاندان والے لاہور میں رہتے ہیں۔ پرانی انارکلی میں اچھا خاصا مکان ہے۔ مگر انہوں نے یہاں ٹرانسفر کرالیا اور ہاسٹل میں قیام پذیر ہوگئے۔"

"اچھا... ایسا کیوں؟" تجسس کے مارے ان کی آنکھیں عینک کی اوٹ سے بھی جگمگاتی دکھائی دیں۔

"ان کی اپنی بیوی سے ناچاقی رہتی ہے۔ وہ انبالہ کی ہیں۔ وہاں کے حکیم صاحب کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ والدہ کی وفات کے باعث گھرداری میں مصروف ہوکر تعلیم حاصل نہ کرسکیں۔ شاکر صاحب کو شادی کے بعد تمام صورت حال کا علم ہوا تو بہت مایوس ہوئے۔ ان کی خودپسند طبیعت سے تو آپ واقف ہی ہیں۔ بے چاری بیوی کو تو اور زیادہ بھگتنا پڑتا ہوگا۔" انہوں نے انیس صاحب کو ہر تفصیل سے آگاہ کیا۔

"اب تو دو بچے بھی ہوگئے' لیکن یہ صرف لگی بندھی رقم بھجوانے کے علاوہ اور کسی چیز کا تردد نہیں کرتے... یہیں رہتے ہیں' کتابیں لکھتے ہیں اور تاریخ کھنگالتے ہیں۔"

"ارے واہ... نذرالسلام صاحب! کیا کہنے... آپ کی معلومات تو قابل رشک ہیں۔"

"مجھے بھی یوں ہی اتفاقاً" معلوم ہوا تھا۔ ان کی بیوی کا کوئی رشتہ دار ان کے پاس پیغام لے کر آیا تھا۔ بے چارہ دو ڈھائی گھنٹہ باہر دھوپ میں سڑتا رہا۔ انہوں نے مصروفیت کا بہانہ کرکے ملنے سے ہی انکار کردیا۔ میں سائیکل سے گھر واپس جارہا تھا تو اسے پانی کے دو گھونٹ پلادیے اور بس اسٹینڈ تک چھوڑ دیا۔ اسی نے مجھے یہ سب کچھ بتایا تھا۔ اللہ جانے سچ ہے یا جھوٹ۔" تب ہی کلاس شروع ہونے کی اطلاع دیتی گھنٹی بجتی چلی گئی اور وہ دونوں بھی اپنی اپنی کلاس لینے چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

صرف ان پڑھ ہونا ہی محسنہ کا واحد جرم نہیں تھا۔ شاکر علی کے مقابلے میں محسنہ کا رنگ و روپ بھی واجبی سا تھا۔ وہ بدصورت تو نہیں تھیں۔ چہرے پر نمک تھا اور نین نقش تیکھے تھے لیکن اپنے شوہر کے ساتھ کھڑے ہوکر ان کی شخصیت دب سی جاتی۔ شاکر علی دراز قد' خوش شکل اور خوش لباس تھے۔ پر خوش مزاج ہرگز نہیں تھے۔ شاکر علی ان سے محبت نہیں کرتے تھے اور نہ ہی ان کی رائے کو اہمیت دیتے تھے۔ اوپر سے محسنہ انبالے کی زبان میں گفتگو کرتی انہیں زچ کردیتی تھیں۔ اب محلے داروں سے بول چال بڑھتے' ان کی انبالوی گفتگو میں پنجابی زبان کا بے دھڑک لہجہ بھی آسمایا تھا۔ یوں سر سے پاؤں تک وہ شاکر علی کے لیے ناقابل برداشت ہوچکی تھیں۔ ان کا توہین آمیز رویہ مہ جبیں کی پیدائش کے بعد بھی نہیں بدلا تھا۔ محسنہ نے بھی خاموش رہنا چھوڑ دیا۔ یوں گھر میں آئے دن جھگڑا بڑھنے لگا۔ شاکر صاحب سکون سے اپنا کام نہیں کرپاتے تھے۔ کالج میں بھی ان کی کارکردگی متاثر ہورہی تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنا تبادلہ دوسرے شہر کے گورنمنٹ کالج میں کروالیا اور اپنا سامان لے کر وہاں ہاسٹل میں منتقل ہوگئے۔ شاکر علی مہینہ ڈیڑھ مہینہ بعد چکر لگاتے اور پیسے کبھی خود اور کبھی ڈاک سے بھجوادیتے۔

ہاسٹل میں رہتے ہوئے ان کی تنخواہ کا زیادہ حصہ اپنی ذات کے لیے مختص تھا۔ کچھ ہفتہ وار غیر ملکی جریدے باقاعدگی سے خریدا کرتے تھے۔ اچھے سے اچھا لباس پہنتے اور بے فکری سے زندگی گزارتے۔ وہاں لاہور میں محسنہ کس طرح بچوں کو پال رہی تھیں یا انہیں کن مسائل کا سامنا تھا۔ شاکر علی نے کبھی سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

ازدواجی زندگی کے تیرہ سال گزر جانے کے بعد ان کی توجہ گھر کی جانب مبذول ہونے لگی۔ جس کی وجہ ان کی بیٹی نازنین کی پیدائش تھی۔ ان دنوں وہ اتفاق سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ دائی نے محسنہ کے کمرے سے باہر آکر صحن میں اخبار کا مطالعہ کرتے شاکر علی کو متوجہ کیا اور کپڑے میں لپٹی سرخ و سفید بچی ان کے سامنے کرتے ہوئے مبارک باد دی۔ شاکر علی بچی کی صورت دیکھ کر بے اختیار اس کی جانب کھنچے چلے آئے۔ بچی بے حد خوب صورت تھی۔ شاکر صاحب کو اس میں اپنی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ ان ہی کی طرح صاف شفاف رنگت' کشادہ پیشانی اور بڑی بڑی آنکھیں... وہ ہوبہو باپ کی طرح تھی۔ انہوں نے فوراً" اسے اپنی گود میں لے کر سینے سے لگالیا۔ اس کا نام بھی انہوں نے ہی رکھا تھا۔ نازنین... وہ اس لحاظ سے خوش قسمت تھی کہ باقی بچوں کے مقابلے میں اسے باپ کی محبت اور توجہ زیادہ ملی۔ شاکر علی اب ہر ہفتے گھر کا چکر لگانے لگے۔

جب نازنین تین سال کی ہوئی تو محسنہ ایک بار پھر امید سے ہوگئیں۔ اب بھی بیٹی ہی پیدا ہوئی۔ تابندہ... لیکن اس کے حصے میں بھی باپ کی وہ محبت نہ آئی' جو خاص نازنین کے لیے امڈ آئی تھی۔ شاکر علی اسے ہردم اپنے ساتھ رکھتے' اس سے اردو اور انگریزی میں باتیں کرتے اور بولنا سکھاتے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بڑے بچوں کی دیکھا دیکھی نازنین بھی پنجابی لہجے میں انبالہ کی زبان بولے۔ وہ اس کے لیے خصوصی طور پر اردو اور انگریزی کے قاعدے اور کہانیاں لاتے تھے اور اپنے ساتھ بٹھا کر اسے پڑھاتے تھے۔ ان کا لاڈ پیار صرف کتابوں تک محدود نہیں تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ بازار لے کر جاتے اور اسے بہترین لباس اور جوتے خرید کردیتے۔ اسے ہر وہ چیز میسر تھی' جو دوسرے بچوں کے نہیں تھی۔ ان کا غیر منصفانہ

رویے طارق کو بہت کھلتا تھا۔ وہ ماں سے جب بھی شکایت کرتا۔ وہ اسے اپنے طور پر سمجھا بجھا کر چپ کروا دیتی تھیں۔ ان کے لیے یہی کافی تھا کہ اتنے سالوں بعد ہی سہی، شاکر علی نے گھر میں ٹکنا تو شروع کیا۔ شاکر علی صرف ناز کی خاطر گھر آنے لگے تھے۔ پھر گھر کے معمولات پر بھی اعتراض کرنے لگے تھے۔

"تمہارے بہنوئی کس خوشی میں تشریف لائے تھے۔ بڑا لہک لہک کر باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو دروازے سے ہی بھاگ لیے۔" محسنہ نے ناگواری سے انہیں دیکھا۔ انہیں اندازہ ہی نہیں تھا۔ وہ کتنی بے ہودہ بات کر رہے تھے۔

"گاؤں سے پھل آئے تھے وہ دینے آیا تھا الیاس۔"

"اونہہ!" انہوں نے پھلوں کی ٹوکری کو لات ماری اور پاؤں پٹختے ہوئے چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

نازنین نے صرف شکل و صورت ہی نہیں، مزاج بھی شاکر علی جیسا ہی پایا تھا۔ ضدی، خود پسند، خود غرض اور بے حد مغرور۔ شاکر صاحب نے ہر دم اپنے سلوک سے اسے یہی احساس دلایا تھا کہ وہ اپنے بھائی، بہنوں سے برتر ہے اور باپ کی شفقت اور پیسے کے ساتھ ساتھ ہر بہترین چیز پر صرف اسی کا حق ہے۔ یہ شاکر صاحب کی محبت کا ہی اثر تھا کہ نازنین اپنے سوا کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ جس طرح وہ اس کے علاوہ اپنے کسی بچے سے پیار نہیں کرتے تھے اسی طرح نازنین نے بھی اپنے بھائی، بہنوں کو کبھی اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ تو اپنی ماں کو بھی باپ کے نظریے سے پرکھتی تھی۔

"جوتھے بول دی اے۔۔۔ جو تھیے آکاش وانی اے۔" طارق لہک لہک کر گاتا جا رہا تھا۔

65ء کی جنگ ختم ہوئے تین سال گزر گئے تھے، پر ان دنوں ریڈیو پر تواتر سے چلنے والے گیت بچے بچے کو منہ زبانی یاد ہو گئے تھے۔ طارق اپنی سائیکل کے پہیے رگڑ رگڑ کر دھوتا یہ گیت گا رہا تھا۔ شاکر علی کہیں باہر سے آ رہے تھے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی ان کی نظر اپنے اکلوتے بیٹے پر پڑی اور ان کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ طارق کی مسیں بھیگنے لگی تھیں۔ چہرے سے بچپنا غائب ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ جوان ہوتے بیٹے کو دیکھ کر بھی شاکر علی کی پدرانہ محبت نہیں جاگی تھی۔۔۔ وہ اپنے بیٹے کا حلیہ اور حرکتیں سخت ناپسند کرتے تھے۔ نہ تو وہ پڑھنے لکھنے کا شوقین تھا، نہ ہی اس نے کبھی باپ کی خوشامد کی تھی۔ اس کا تعلق صرف ماں سے تھا۔ نازنین سے زیادہ وہ تابندہ کا خیال رکھتا تھا۔ اسے گود میں اٹھاتا، پیار کرتا تھا اور اپنی سائیکل پر سیر بھی کرواتا تھا۔ باپ کی بے اعتنائی پر۔۔۔ جلنے کڑھنے کے بجائے تینوں نے اسے خاموشی سے قبول کر لیا تھا۔ مہ جبیں، طارق اور تابندہ، انہوں نے باپ سے کوئی امید نہیں باندھی تھی، نہ ہی کوئی مطالبہ کیا تھا۔ نازنین کے ساتھ ان کے خصوصی رویے کو دیکھ، اگر کبھی کوئی احساس محرومی پیدا ہوا بھی تھا تو بھی اس کا شکوہ انہوں نے شاکر علی سے کبھی نہیں کیا تھا۔

شاکر علی نازنین کو پڑھا رہے تھے۔ تب ہی اس نے اپنی اردو کی نوٹ بک کھول کر انہیں دکھائی۔ "یہ دیکھیے ابا جی! میں نے نظم لکھی ہے۔۔۔ پوری کلاس کو سنائی۔۔۔ مجھے انعام بھی ملا تھا۔" شاکر صاحب نے اسے شاباش دیتے ہوئے نوٹ بک ہاتھ میں لے لی۔

"71ء کا المیہ" عنوان پڑھتے ہی وہ چونک کر سیدھے بیٹھ گئے۔

اور پوری توجہ سے دو صفحوں پر مشتمل وہ نظم پڑھنے لگے۔ اس نظم میں ایک ایسے شخص کا احوال تھا، جس کا پورا خاندان بنگلہ دیش میں رہ گیا تھا۔ وہ اپنے پیاروں کو یاد کرتے ہوئے اپنے دکھ کا اظہار کر رہا تھا۔ سندر بن کے جنگل، بنگال کے سیاہ لمبے بالوں والی سانولی سلونی لڑکیاں اور ڈھاکے کی ململ۔۔۔ اس نظم میں ہر چیز کا ذکر تھا۔ شاکر علی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ نازنین ان کا فخر تھی اور انہوں نے اس پر جتنی محنت کی تھی، اس کا اثر صاف نظر آنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

محسنہ، نازنین کی چھٹی کے وقت اسکول اسے لینے آئیں تو وہ اپنی سہیلیوں کے جمگھٹے میں گھری باتوں میں مصروف تھی۔ اس نے ماں کو نہیں دیکھا تھا۔ پیچھے سے اس کی ہم جماعت نے آ کر اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"ناز! تمہاری امی تمہیں ڈھونڈ رہی ہیں۔۔۔ وہ وہاں درخت کے پاس کھڑی ہیں۔"

اس کی ایک دوست نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ تمہاری امی ہیں؟ لگتی تو نہیں۔۔۔ تم اتنی پیاری ہو، تمہارا رنگ بھی گورا ہے، مگر یہ تو۔۔۔" اتنے میں محسنہ کو بھی ناز نظر آ گئی۔

"ہاں۔۔۔ مجھے ہر کوئی یہی کہتا ہے، مجھے بھی لگتا ہے، یہ میری سوتیلی ماں ہیں۔" وہ ہنستے ہوئی مڑی تو ٹھٹک گئی۔ محسنہ کا فق چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اس کا فقرہ سن چکی ہیں۔ نازنین کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

وہ نازنین تھی۔۔۔ جس کی تربیت شاکر علی نے کی تھی اور ورثے میں ذہانت اور خوب صورتی کے ساتھ بے حسی اور تکبر بھی منتقل کیا تھا۔ اس تکبر نے نازنین کو جہاں اعتماد سے نوازا تھا۔ وہیں تھوڑا بہت تنہا بھی کر دیا تھا۔ اس کی ماں، بہنوں اور بھائی سے کسی قسم کی جذباتی وابستگی نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

مہ جبیں کے لیے اس کی سہیلی کے سسرال سے رشتہ آیا تھا۔ لڑکے والے آئے تو شاکر صاحب ان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ اچھے سلجھے ہوئے لوگ تھے، پڑھا لکھا خاندان تھا۔ اس رشتے میں بظاہر کوئی خامی نہیں تھی۔ اگلا مرحلہ لڑکے کے گھر جانے کا تھا۔ جسے شاکر علی نے اکیلے ہی طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ محسنہ جیسی سادی عورت کی رائے کی ویسے بھی ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ محسنہ کو ان کے اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہ ہوا، اچھا تھا، وہ مہ جبیں کو بھی اپنی ذمہ داری سمجھ رہے تھے، بھلے دیر سے ہی سہی۔

شاکر صاحب کو لڑکا پسند آیا تھا۔ اس نے امریکا میں امیگریشن کے لیے اپلائی کر رکھا تھا۔ خاصا پڑھا لکھا اور قابل لڑکا تھا اور نہایت پر امید بھی کہ اسے ضرور بلوا لیا جائے گا۔ رشتہ طے ہو گیا اور شادی بھی جلد کر دی گئی۔ محسنہ بڑی بیٹی کی رخصتی پر بہت روئی تھیں۔ اس نے ہمیشہ ماں کا احساس کیا تھا اور دعائیں سمیٹی تھیں۔ مہ جبیں کے شوہر نے شادی ہوتے ہی اس کے کاغذات بھی جمع کروا دیے۔ اب یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ شوہر کے ساتھ اس کا بھی ویزا لگ گیا اور وہ دونوں امریکا چلے گئے۔

ان کی دیکھا دیکھی شاکر صاحب کو بھی شوق چرایا اور کچھ دوستوں سے مشورے کے بعد انہوں نے امریکن یونیورسٹی میں جاب کے لیے اپلائی کر دیا۔ تین مہینے بعد ان کا بلاوا آ گیا۔ پیسوں کا انتظام ہوتے ہی شاکر علی امریکا سدھار گئے۔ جاتے ہوئے ان کا دل محسنہ سے زیادہ نازنین کے لیے پریشان تھا۔ لیکن آفراتنی پرکشش تھی کہ انہیں جانا پڑا۔ سو ہر ذمہ داری کو پس پشت ڈال کر شاکر علی امریکا کے ہو گئے۔ وہاں سے ہر مہینے محسنہ کے نام ایک مناسب رقم کا ڈرافٹ نازنین کے لیے خط ہوا کرتا تھا۔ شاکر صاحب نے وہاں بھی کتابیں لکھنا جاری رکھا تھا۔ اضافی آمدنی سے وہ ناز کے لیے کپڑے، جیولری اور کتابیں بھجوایا کرتے تھے اور ہر وہ چیز جس کا نازنین اپنے خط میں مطالبہ کیا کرتی تھی۔

"ہائے امی جی! کتنے پیارے کلپ ہیں، یہ میں لے لوں۔" تابندہ پارسل کھلتے ہی رنگا رنگ کلپس دیکھ کر مچل گئی۔

"نا۔۔۔ رہن دے۔۔۔" محسنہ نے حقارت سے وہ پیکٹ پرے کیا۔ "یہ تیرے ابا جی نے اپنی لاڈلی کے لیے بھجوائے ہیں گے۔ تو حرص نہ کر۔۔۔ پرے کر دے۔" محسنہ چاہ کر بھی آنے والی سوغات میں سے تابندہ کے لیے کچھ نکال نہیں سکتی تھیں۔ نازنین کا شاکر علی سے رابطہ رہتا تھا۔ اگر وہ باپ سے شکایت کر دیتی تو محسنہ کو ملنے والے ماہانہ خرچ میں کمی بیشی کا دھڑکا تھا۔

"پر امی جی! میرے پاس تو ایسا ایک بھی کلپ نہیں

ہے۔ نازباجی کی تو پوری دراز بھری پڑی ہے۔" تابندہ کے لہجے میں حسرت تھی۔

"میری بیٹی اللہ سے دعا کر' وہ تجھے ہور چنگی چیز دیوے گا۔ اسے واپس ڈال دے۔ فضول میں لڑے گی بجھ سے۔"

"ساری چیزاں نازباجی کو ملتی ہیں۔ ہمارے لیے کچھ نہیں بھیجتے ابا جی۔" دس سال کی معصوم بچی روتے ہوئے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ محسنہ دکھی دل سے اسے جاتا دیکھتی رہیں۔ دوسرے کمرے میں بیٹھے طارق نے یہ سب باتیں سنی تھیں اور روتی ہوئی تابندہ کو گلے لگا کر تسلی دی تھی۔

"میری گڑیا! روؤ نہیں' جب میں باہر جاؤں گا تو صرف تمہارے لیے چیزیں بھیجوں گا۔"

طارق نے مہ جبیں سے اسپانسر شپ کے لیے کہہ رکھا تھا۔ اس کے کاغذات بن رہے تھے۔ وہ اپنے باپ کی ناانصافی بچپن سے دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی ماں' بہنوں کا احساس تھا۔ وہ امریکا جا کر پیسے کمانا چاہتا تھا۔ تاکہ ماں کو باپ کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے منع کر سکے۔ مہ جبیں کے شوہر نے طارق کو اسپانسر کیا اور پھر ایک دن طارق بھی ماں' بہنوں کو چھوڑ کر امریکا چلا گیا۔ لیکن وہ اپنے ابا جی کے پاس نہیں گیا تھا اور نہ ہی شاکر علی نے اسے بلانے کی کوشش کی تھی۔ طارق نے تعلیم مکمل نہیں کی تھی۔ اس نے بہن کے گھر رہتے ہوئے مختلف کام کرنے شروع کیے۔ ورک پرمٹ کی بدولت اسے کام حاصل میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ لیکن بہن کے گھر ٹھہرنا بھی اسے گوارا نہ تھا۔ وہ نیو جرسی چلا گیا اور ٹیکسی ڈرائیور بن گیا۔ کچھ پاکستانی لوگوں کے ساتھ ایک اپارٹمنٹ شیئر کیا' پھر ایک جنرل اسٹور میں سیلز مین کی نوکری حاصل کرلی۔ ہر روز گاہکوں سے بات چیت کرتے اسے امریکن انگلش بولنا آگئی۔ یہ پیشہ اسے راس آگیا تھا۔ اب وہ گھنٹوں کے حساب سے ڈالر کمانے لگا۔

محسنہ کو ملنے والی رقم میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ گھر کے حالات بہتر ہونے لگے۔ اب وہ بیٹیوں کی شادی کے لیے جوڑ رہی تھیں۔

نازنین اے گریڈ کے ساتھ ایف اے کر چکی تھی اور اب میو اسکول آف آرٹ میں داخلے کے لیے اپلائی کر رکھا تھا۔ داخلے کے ڈرائنگ' انگلش اور میتھس کے ٹیسٹ اس نے با آسانی کلیئر کرلیے اور اسے اپنے من پسند کالج میں داخلہ مل گیا۔ جہاں بھیجنے کے لیے محسنہ ہرگز راضی نہ تھیں۔ اس نے باپ کو خط لکھ کر اجازت لے لی اور وہی کیا' جو وہ چاہتی تھی۔

کالج بھیجتے ہوئے جب محسنہ نے اسے چادر اوڑھنے کا کہا تو اس نے صاف انکار کردیا۔ محسنہ سوائے سر پیٹنے کے اور کیا کرسکتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"یہ سامان کس نے بھجوایا ہے؟" ناز کالج سے واپس آئی تو دیکھا تابندہ صحن میں رکھے تخت پر کچھ امپورٹڈ چیزیں لے کر بیٹھی تھی۔

"طارق بھائی نے بھجوایا ہے۔" تابندہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ نازنین اس کی طرف توجہ دینے کے بجائے سامان کی طرف لپکی۔

"اچھا۔ کیا کیا بھیجا ہے' دکھاؤ۔" اس نے جھٹ پٹ تمام چیزیں الٹ پلٹ کردیں۔ "یہ کلپس اور سلیپرز تو میں لوں گی۔" وہ اپنی پسند کی چیزیں اٹھانے لگی تھی۔ اسی لمحے محسنہ باورچی خانے سے باہر آئیں۔

"یہ سامان طارق نے تابندہ کے واسطے بھجوایا ہے' واپس رکھ۔" نازنین نے ان کی بات سن کر خشمگیں نگاہوں سے تابندہ کو دیکھا جو ہاتھ میں کچھ خوش رنگ ربنز اور مصنوعی پھولوں سے سجے کلپس اور کیچرز پکڑے بیٹھی تھی اور رو رہی تھی کہ طارق نے اس کی معصوم خواہش یاد رکھی تھی اور کس محبت سے اپنا وعدہ نبھایا تھا۔

"بڑا بے دید ہے' میرے لیے کچھ نہیں بھیج سکتا تھا۔" ناز کا پارہ چڑھ چکا تھا۔ مگر تابندہ نے فوراً" ناز کے آگے چیزیں رکھ دیں۔ "امی جی! نہ ڈانٹو نازباجی کو۔ لے لو باجی تمہیں جو اچھا لگے' لے لو۔"

"مجھے نہیں چاہیے۔ ایویں فقیروں والی' ہونہہ۔ ایک بھی چیز میرے ابا جی کی بھیجی چیزوں کے پاسنگ نہیں ہے' یہ تو اپنے پاس ہی رکھ۔ دو ٹکے کا سامان' ہونہہ۔" وہ حقارت سے کہتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کمرے میں جا کر بھی اس کے دل میں ابال اٹھتے رہے۔ اسے ان چیزوں کو نہ ملنے کا اتنا افسوس نہیں تھا' جتنا خود کو نظرانداز کیے جانے پر تھا۔

اگلی صبح تابندہ نے اسکول جانے سے پہلے کلپس والا تھیلا کھولا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ تمام کلپس ٹوٹے ہوئے تھے اور ربنز قینچی سے کتر دیے گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

ناز کے سامنے کچھ پرانے میگزین کھلے پڑے تھے۔ اس نے 67ء کا LIFE میگزین اٹھایا۔ جس کے سرورق پر الزبتھ ٹیلر کی تصویر کے نیچے اس کے شوہر رچرڈ برٹن کے تاثرات شہ سرخیوں میں نمایاں تھے۔

Liz— my nagging scherning seductive honest wife (لز۔ میری نکتہ چیں' سازشی مرغوب اور ایمان دار بیوی) اندرونی صفحات میں اس حسین جوڑے کی کچھ تصاویر دی گئی تھیں۔ ناز نے وہ صفحات اپنے سامنے رکھے اور آئینے کے روبرو کھڑے ہو کر خود کو دیکھنے لگی۔ ہر زاویے سے خود کو دیکھنے کے بعد اس کی گردن تفاخر سے اکڑ چکی تھی۔ کچھ اثر عالیہ کی تعریف کا بھی تھا۔ جس کے ساتھ وہ آج پورا دن گزار کر آئی تھی۔

عالیہ اس کی نئی سہیلی تھی۔ نازنین نے فائن آرٹس لے رکھا تھا' جبکہ عالیہ مجسمہ سازی کی کلاس میں تھی۔ مزاجاً" کافی بے حجاب اور منہ پھٹ لڑکی تھی۔ سرعام اپنے دوستوں کے ساتھ سگریٹ پھونکتی نظر آتی تھی۔ اس کا تعلق نہایت امیر خاندان سے تھا اور بڑی سی کوٹھی میں رہتی تھی۔

شاکر علی کے چلے جانے کے بعد نازنین کو گھر میں سراہنے والا کوئی نہیں تھا۔

نازنین اکثر عالیہ کے ساتھ بازار جاتی تھی۔ عالیہ کے پاس اپنی کار تھی۔ وہ خود ڈرائیو کرتی تھی۔ اس دن وہ ناز کو کالج کے بعد اپنے گھر لے گئی تھی۔ نازنین اس کے ٹھاٹ باٹ رشک سے دیکھتی اس کے بیڈ روم میں داخل ہوئی۔ "تمہارا گھر بہت خوب صورت ہے' کاش میرا گھر بھی ایسا ہوتا۔" اس نے تعریف کے ساتھ اپنی حسرت کا اظہار بھی کردیا۔

"فکر نہ کرو ڈارلنگ۔ کسی امیر آدمی سے شادی کرکے تم بھی لاکھوں کی مالک بن سکتی ہو۔ پھر تم بھی ٹھاٹ سے رہنا۔"

"یار ہم جیسوں میں کوئی ہم جیسا ہی آئے گا نا۔" ناز نے اپنی حیثیت کو خود ہی طعنہ دیا۔

"ارے نہیں۔ تم جیسی حسین و جمیل لڑکی کو حاصل کرنے کے لیے تو شہزادے لائن میں لگ کر آتے ہیں۔ سوالی بن کر۔ تم دیکھنا تو سہی۔ کیسے کیسے طلب گاروں کا **جمگھٹا** لگتا ہے۔" اس کی بات سن کر نازنین اٹھلا کر آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

"تم نے کیا خود کو کبھی غور سے نہیں دیکھا۔ قیامت لگتی ہو' قسم خدا کی' جو بھی دیکھے دیوانہ ہوجائے' اپنا گریبان چاک کرکے گلیوں میں ناز ناز پکارتا پھرے۔" ناز کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

عالیہ کے منہ سے اپنی تعریف سن کر ایک نشہ جیسے دل و دماغ پر چڑھ رہا تھا۔ خمار چھاتے چھاتے رک سا گیا۔ جب محسنہ نے اس کے دروازے پر دستک دی۔

"کیا ہے؟" وہ جھلا کر پیر پٹختی دروازے کے پاس آئی۔

"آہستہ بول" محسنہ نے فوراً" گھرکا۔ "ادھر مہمان آئے ہیں گے' چل چائے لے کر آجا۔"

تابندہ نے باورچی خانے سے باہر آکر ٹرے اس کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ ناچار اسے ماں کی بات پر عمل کرنا ہی پڑا۔

مہمانوں کو رخصت کرکے محسنہ نے اسے آنے والے رشتے کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ "بھلے لوگ ہیں

گے۔ لڑکا بینک میں ملازم ہووے' پانچ ہزار روپے تنخواہ ہے۔" ماں کے مزید کچھ کہنے سے قبل ہی اس نے تڑخ کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"مجھے نہیں کرنی ایسے پھٹیچر لوگوں میں شادی اور شکل دیکھی تھی ماں' بہنوں کی۔ لڑکا بھی کالے کوے جیسا ہوگا... ہونہہ... اتنا ہی شوق ہو رہا ہے تو اپنی لاڈلی کو بیاہ دو... وہی جچے گی ایسے لوگوں میں۔" ناز نے اپنے کپڑے نکالے اور غسل خانے میں چلی گئی۔

محسنہ افسوس سے گردن ہلاتی اس کے کمرے سے باہر نکل آئیں۔ شاکر علی نے امریکا جانے کے بعد دوبارہ واپسی کا راستہ نہیں دیکھا تھا۔ چار سال پہلے اطلاع بھجوائی تھی کہ دل کا دورہ پڑا ہے۔ جس کے بعد اب ان کا اتنا لمبا سفر کرنا ناممکن ہے۔ ڈاکٹر اجازت نہیں دے رہے۔ دونوں بیٹیوں کی ذمہ داری محسنہ کی تھی۔ نازنین دن بدن بے لگام ہوتی جا رہی تھی۔ باپ نے بگاڑنے میں تو کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ منہ زور' لاڈلی کو سنبھالنے کے لیے' خود موجود نہ تھے۔ محسنہ کی تو راتوں کی نیند اڑ چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

نازنین کی سہیلی آسیہ کی شادی تھی۔ محسنہ نے اس شرط پر اجازت دی کہ ہمسائی خالہ رشیدہ اس کے ساتھ جائیں گی۔ واپسی کا انتظام آسیہ کی طرف سے تھا۔ وہ اپنے بھائی کی وین میں سب سہیلیوں کو ان کے گھر بھجوانے کا وعدہ کر چکی تھی۔ نازنین کو خالہ رشیدہ کے ساتھ چلنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ خالہ رشیدہ کو اس کے سر پر سوار رہنے کا قطعی شوق نہیں تھا۔ وہ رونق میلہ اور پلاؤ قورمہ کی دعوت پر ہی راضی تھیں۔

مہندی کی شام چھ بجے وہ خوب بن ٹھن کر رکشے میں سوار ہوئی اور آسیہ کے گھر جا پہنچی۔ نازنین ہمیشہ کی طرح خوب دل لگا کر تیار ہوئی تھی۔ سرخ چوڑی دار پائجامہ اور سبز پشواز کے ساتھ چنا ہوا دوپٹا' کانوں میں کندن کے آویزے' چوڑیوں سے بھرے ہاتھ اور سونے جیسے پاؤں میں چاندی کی پازیب چھنک رہی تھی۔ طیبہ نے پیلا جوڑا پہن رکھا تھا۔ اس کا میک اپ ناز نے کیا تھا۔ وہ بھی اچھی لگ رہی تھی۔ پر ناز کے سامنے کسی کا ٹھہرنا ذرا مشکل ہی تھا۔ خالہ رشیدہ اپنی سونف سپاری کی مخملی پوٹلی اٹھائے ان کے پیچھے چل رہی تھیں۔ مکان کی دیواروں اور باغیچہ کی سبز جھاڑیوں پر سرخ اور سبز قمقمے جگمگا رہے تھے۔

ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ نوعمر لڑکیوں کی باریک اور بے سری آوازیں گھر کی چوکھٹ پار کر چکی تھیں۔ ہر طرف چہل پہل اور کھلکھلاہٹیں تھیں۔ ناز اور طیبہ نے خالہ رشیدہ کو مہندی کے تھال سجاتی ایک بوا کے ساتھ پنڈال میں بٹھایا اور باورچی خانے میں آسیہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ تمام لڑکیاں بالیاں فی الحال وہیں گانوں کی مشق کر رہی تھیں۔ ناز اور طیبہ بھی ان ہی میں شامل ہو گئیں۔

کچھ دیر بعد صبیحہ بیگم نے آسیہ کے کمرے میں آکر تمام لڑکیوں کو متوجہ کیا۔

"چلو لڑکیو... لڑکے والے آگئے ہیں' پھولوں والی پلیٹیں لے کر نیچے آجاؤ۔" یہ کہنے کے بعد جیسے وہ ہی پلٹیں انہیں۔ اپنے پیچھے ایک آواز سنائی دی۔

"چلو بھئی... پولیٹیں لے کر نیچے آجاؤ۔" ایک لڑکی ان کی آواز اور لہجے کی نقل اتارتے ہوئے تمسخر اڑا رہی تھی۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک نظر میں انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ لڑکی کون ہے۔ وہ فوراً اس لڑکی کے مقابل آکھڑی ہوئیں۔

"میں نے پلیٹیں کہا ہے۔ پولیٹیں نہیں۔ زیادہ شوخی میں آنے کی ضرورت نہیں ہے لڑکی!"

صبیحہ بیگم کی ڈانٹ سن کر سب لڑکیاں تھوڑی سی شرمندہ ہو گئی تھیں کہ پولیٹیں والے مذاق پر سب کے جان دار قہقہے برآمد ہو گئے تھے لیکن اس لڑکی پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ نہایت اعتماد سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"آپ نے پولیٹیں ہی کہا تھا۔ کان خراب نہیں ہیں میرے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ اٹھا کر انہیں راستہ دینے کا کہا۔ "نیچے جانا ہے ہمیں' راستے سے ہٹ جائیں۔" صبیحہ بیگم تیورا کر وہاں سے جانے کے لیے مڑیں۔

"ہونہہ... بڈھی مائی کو بڑا شوق ہو رہا تھا رعب جھاڑنے کا۔"

یہ جملہ بھی صبیحہ بیگم کی سماعتوں سے محفوظ نہیں رہ پایا تھا لیکن وہ چپ چاپ آگے بڑھ گئیں۔ آسیہ کے سب گھر والوں کو وہ اچھی طرح جانتی تھیں اور رشتہ داروں میں بھی ان کی سب سے جان پہچان تھی۔ یہ لڑکی یا تو پڑوس کی تھی یا پھر کوئی سہیلی' جو بھی تھی اچھی خاصی بدلحاظ اور بدتمیز تھی۔ صبیحہ بیگم نے اس سے مزید الجھنا مناسب نہیں سمجھا۔

☼ ☼ ☼

دولہا والوں کے استقبال میں لائن سے کھڑی لڑکیاں پرشوق نگاہوں سے گلی کے نکڑ سے آگے بڑھتے مہمانوں کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ قدسیہ بھی ان میں شامل تھیں۔ سب کے ہاتھ میں پھولوں کی پتیوں سے بھری پلیٹیں تھیں۔ آتش بازی جاری تھی۔ زمین پر دھم دھا دھم ڈھول بجاتے رقص کرتے میراثی مہندی لاتے دولہا والوں سے آگے آگے ان کی آمد کا اعلان کرتے جا رہے تھے۔

قدسیہ نے ساتھ کھڑی ایک انجان لڑکی سے یوں ہی پوچھ لیا۔

"سنیں... میری لپ اسٹک ٹھیک ہے۔" وہ اپنی لپ اسٹک کے پھیل جانے کا اندیشہ کر رہی تھی۔ تب ہی پوچھ بیٹھی' لیکن بہت جلد اسے اندازہ ہو گیا کہ اس نے غلط لڑکی سے پوچھ لیا تھا۔ اس لڑکی نے پہلے سر سے پاؤں تک قدسیہ کا معائنہ کیا' پھر اس کی لپ اسٹک کو غور سے دیکھتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں گویا ہوئی۔

"آپ نے شاکنگ پنک کپڑوں کے ساتھ ریڈ لپ اسٹک لگا رکھی ہے اور سینڈلز پیلے رنگ کے پہنے ہوئے ہیں۔ بہتر تھا آپ کسی سے پوچھ کر بناؤ سنگھار کرتیں۔"

اس بے لاگ تبصرے نے قدسیہ کی پوری شام غارت کر دی تھی۔ باقی محفل میں وہ اپنے دوپٹے کا پلو جوتوں پر ڈال کر انہیں چھپانے کی کوشش کرتی رہی اور لپ اسٹک تو اس نے فوراً ہی پونچھ ڈالی تھی۔ اس کے باوجود وہ لڑکی ہر تھوڑی دیر میں اسے حقارت بھری نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

کھانے کے بعد دولہا والے چلے گئے۔ آسیہ کے کمرے میں کزنز اور قریبی سہیلیاں ڈیرہ جما کر بیٹھ گئیں۔ کیسٹ پلیئر آن کیا اور گانے لگا کر رقص کیا جانے لگا۔ سب لڑکیاں ہنسی کھیل میں فلمی گانوں پر الٹا سیدھا ناچ کر خوش ہو رہی تھیں۔

صبیحہ بیگم نے قدسیہ کو نیچے بلوانے کے لیے عبید میاں کو گھر کے اندر بھیجا۔ وہ جانتی تھیں کہ آسیہ کے کمرے میں وہ بدلحاظ لڑکی ابھی تک موجود ہے اور انہیں دوبارہ اس کی شکل دیکھنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔

عبید نے سیڑھیوں کی طرف بڑھتے فضلو کے ہاتھ سے شربت کی ٹرے زبردستی لے لی۔ آسیہ کے کمرے سے ملے گلے کی آوازیں نیچے تک آرہی تھیں۔ یوں ہی عبید کو شوق ہوا کہ ایک نظر ناچتی گاتی حسیناؤں کا دیدار کیا جائے۔ وہ سنبھل کر سیڑھیاں چڑھتے آسیہ کے کمرے کے باہر کھڑا ہو گیا اور ٹرے زمین پر رکھ دی۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ انہوں نے ہلکا سا دباؤ ڈال کر جھری سے اندر دیکھنے کی کوشش کی۔ اچھل کود کر لڑکیاں خوب دل خوش کر لینے کے بعد تھک کر بیٹھتی جا رہی تھیں۔ تب ہی آسیہ نے ہاتھ اٹھا کر مطالبہ کیا۔

"چلو طیبہ! اب تم ڈانس کرو' تمہیں اچھا آتا ہے۔"

طیبہ کا سانس پھول رہا تھا۔ اس نے آسیہ سے کہا۔

"میں تھک گئی ہوں' میری جگہ نازنین تمہیں اچھا سا ڈانس کر کے دکھائے گی۔" پھر وہ ساتھ بیٹھی نازنین سے مخاطب ہوئی۔

"چلو اٹھو... اتنی دیر سے بیٹھی ہمارا ریکارڈ لگا رہی ہو۔ اب تمہاری باری ہے۔ چلو شاباش..."

اور ناز کو اٹھتے ہی بنی۔ عبید نے تھوڑی دیر کے لیے دروازہ مکمل بند کرلیا۔ کچھ لمحوں بعد کھولا تو وہ لڑکی جس کا نام ناز تھا' سب لڑکیوں کے درمیان کھڑی دوپٹے کو گانٹھ لگا رہی تھی۔ عبید کو ابھی تک اس کا چہرہ نظر نہیں آیا تھا۔ اس کے لیے اسے دروازے کا پٹ تھوڑا اور کھولنا پڑتا' جس میں لازما" اس کے اپنے دیکھے جانے کا خطرہ تھا۔ "تو بس جتنا ہے کافی ہے' کے مصداق وہ خاموش کھڑا نظارہ کرتا رہا۔ کیسٹ آن ہوا۔

چلتے چلتے یونہی کوئی مل گیا تھا۔

بڑی ادا سے وہ بل کھا کر پلٹی اور رقص شروع کردیا۔ عبید اس حسین لڑکی کو دیکھتا رہ گیا۔

ناز کے بدن میں لوچ تھا۔ انتہائی خوبی سے ہر لے پر اپنے اعضا کی شاعری کرتی وہ حاضرین پر سحر طاری کرنے لگی۔

گانا کب شروع ہوا اور کب ختم۔ عبید کو معلوم نہ ہوسکا۔ وہ تالیوں کی آواز سن کر ہوش میں آیا تھا۔ سب لڑکیاں نازنین کو تالیاں بجا کر داد دے رہی تھیں۔ جب ذرا شور تھما تو عبید نے زمین پر رکھی ٹرے اٹھائی اور آسیہ کو آواز دے ڈالی۔ پیلے جوڑے میں ملبوس آسیہ فورا" دروازے پر آئی اور عبیدالرحمان کو سامنے دیکھ کر پرجوش ہوگئی۔ پہلے شربت کی ٹرے اس کے ہاتھوں سے لے کر اندر پکڑائی' اسے بھی زبردستی اپنے ساتھ اندر لانا چاہا تو وہ گڑبڑا گیا۔

"نہیں آسیہ! امی بیگم نے قدسیہ کو بلوایا ہے' اسے بھیج دو' بس۔"

آسیہ نے ایک نہ سنی' کہنے لگی۔ "قدسیہ آپ کے ساتھ بعد میں جائے گی' پہلے ہمیں ایک اچھا سا گانا سنا دیں۔" عبید کے لاکھ 'نہ نہ' کرنے کے باوجود وہ اسے کھینچ کر اندر لے ہی آئی اور پکڑ کر بٹھا دیا۔

"یہ لیں... شربت پئیں اور ہمیں گانا سنائیں۔" آسیہ نے شربت کا گلاس تھما کر فرمائش کی۔

وہ کئی سال تک پڑوسی رہ چکے تھے۔ آسیہ اس کے شوق سے بخوبی آگاہ تھی۔ عبید کی آواز خوب صورت بھی تھی اور اسے سر تال کی بھی اچھی سمجھ تھی۔ ہر نئی فلم کے گانے اسے زبانی یاد ہوجایا کرتے تھے۔ آسیہ کی شادی تھی' پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اس اہم موقع پر وہ اس سے گانا نہ سنتی۔ عبید نے بھی اپنی پرانی سامع کو مایوس کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔

اس کی نگاہوں کے عین سامنے نازنین فرش پر بچھی چاندنی پر آکر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ سب لڑکیوں کی طرح وہ بھی ایک خوب صورت گیت کی منتظر تھی مگر عبید کا گیت ناز کے لیے تھا۔

جان بہاراں' رشک چمن
غنچہ دہن' سیمیں بدن
اے جان من...!
اے ناز پرور' ناز آفریں
لاکھوں حسیں ہیں' تجھ سا نہیں
رنگیں ادا' توبہ شکن' اے جان من!

نازنین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ یہ بول گاتے ہوئے عبید کی فریفتہ نگاہیں ناز کے چہرے پر مرکوز رہیں۔ حتیٰ کہ اسے یقین ہوگیا کہ وہ اس کی شان میں قصیدہ پڑھ رہا ہے۔ تعریف کا یہ انداز اس کے دل کو چھو گیا تھا۔ عبید اپنے دل کی بات کہہ کر مطمئن ہوگیا۔ جو پیغام اس کی آنکھوں نے نازنین کو دیا تھا' وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔

کب محفل برخاست ہوئی اور کب سب اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔ ان دونوں نے محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ جس لمحے کی قید میں تھے۔ وہ انہیں دنیا و ما فیہا سے بے خبر کر گیا تھا۔ اپنے اپنے گھروں کو پہنچ کر بھی وہ دونوں ایک دوسرے کے ہمراہ تھے۔ وہ رات نازنین اور عبید کی زندگیوں کی پہلی خوب صورت رات تھی۔

☼ ☼ ☼

"آپ کہاں رہتے ہیں؟ ہمیں اپنا گھر نہیں دکھائیں گے؟" دہی بڑوں کی پلیٹ ہاتھ میں لیے ناز نے عبید سے کچھ عجیب سی فرمائش کر ڈالی۔ عبید کو اس کے اعتماد پر ذرا کی ذرا حیرت ہوئی' پھر وہ سنبھل کر بولا۔

"آپ ہمارے گھر والوں سے ابھی ملنا چاہتی ہیں؟"

"نہیں... میں صرف آپ کا گھر دیکھنا چاہتی ہوں۔" وہ دونوں گاڑی میں نیلا گنبد تک آئے تھے۔ عبید نے نازنین کو اس کے کالج سے پک کیا تھا۔ اپنی کلاس ختم ہونے کے بعد جب وہ گیٹ کے پاس پہنچی تو عالیہ اس کی طرف لپک کر آئی تھی اور اسے بتایا۔ "وہ گیٹ سے باہر میرون کرولا کھڑی ہے نا' اس میں جو شخص بیٹھا ہے وہ ابھی میرے پاس آکر تمہارا پوچھ رہا تھا۔"

ناز کو حیرت ہوئی۔ اس نے عالیہ کو ساتھ لیا اور گیٹ سے باہر نکل آئی۔ گاڑی میں عبید تھا۔

عالیہ کے ہمت دلانے پر نازنین اس کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی تھی اور اب وہ دونوں دہی بڑے کھا رہے تھے کہ ناز نے اس کا گھر دیکھنے کی فرمائش کر ڈالی۔

عبید نے گاڑی اپنے گھر کی طرف لے لی تھی۔ راستے بھر نازنین اس سے مختلف سوال کرتی رہی۔ تعلیم اور کاروبار کے حوالے سے وہ اس کے تمام سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ عبید جان گیا تھا کہ وہ اس کے اسٹیٹس کے بارے میں تفصیل جاننا چاہتی ہے۔ اس نے کار اور فیکٹری کا ذکر کرتے ہوئے اسے اپنی ملکیت کہا۔ ناز تھوڑا مطمئن ہورہی تھی۔ اسے کنگلے عاشق بہت ملے تھے' جو اس قابل بھی نہیں تھے کہ ناز انہیں پلٹ کر دیکھتی' لیکن عبید کا معاملہ کچھ اور تھا۔ وہ خوبرو تھا اور سب سے اہم بات مالی طور پر مستحکم تھا۔

اب گاڑی اس کے گھر سے ذرا فاصلے پر کھڑی تھی۔ عبید نہیں چاہتا تھا کوئی جان پہچان والا اسے ناز کے ساتھ دیکھے۔ نازنین کو اس کا گھر بھی پسند آیا تھا۔ کافی بڑی سی کوٹھی تھی۔ اپنے طور پر اسے سب کچھ ٹھیک ہی نظر آرہا تھا۔ واپسی میں عبید نے اسے کالج ہی ڈراپ کیا اور اگلی ملاقات کا وعدہ لے کر چلا گیا۔ نازنین کا گھر کالج سے نزدیک تھا۔ وہ پیدل آیا جایا کرتی تھی۔ راستے بھر اس کا ذہن مستقبل کے تانے بانے بنتا رہا۔

اس ایک ملاقات کے بعد ان کی اور بہت ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ ہر ملاقات عبید کے شوق میں اضافہ کررہی تھی اور پھر عبید نے نازنین کو پرپوز کردیا۔

☼ ☼ ☼

قدسیہ چائے دینے مطیع الرحمٰن کے کمرے میں آئی تو اسے صبیحہ بیگم کی آواز سنائی دی جو دادی بیگم اور لاڈلی بیگم کو عبید اور گلناز کے رشتے کی بابت تفصیل بتا رہی تھیں۔ انہیں مطیع الرحمان کی حمایت حاصل تھی۔ طے یہ پا رہا تھا کہ عبید کے بزرگوں کی حیثیت سے اماں بیگم اور لاڈلی بیگم گلناز کا رشتہ مانگنے ان کے ساتھ چلیں۔ قدسیہ نے آواز دے کر اندر آنے کی اجازت مانگی اور سب کو چائے دے کر واپس ہولی۔ جوش و جذبات میں اس کے قدم زمین پر نہیں ٹھہر رہے تھے۔ وہ بھاگتی ہوئی گلناز کے پاس پہنچی اور اسے بازوؤں سے پکڑ کر پورا گھما ڈالا۔ گلناز بے چاری اپنی الماری ٹھیک کررہی تھی۔ اس افتاد سے گڑبڑا کر رہ گئی۔

"بس آج سے تم میری ناز بھابھی ہو... ٹھیک ہے گل باجی۔" گلناز اس کی بات سن کر شرما گئی اور سر جھکا لیا۔ قدسیہ کو اس کے حیران نہ ہونے پر حیرت ہوئی۔

"اچھا! تو تم پہلے سے جانتی تھیں۔ ہائے گل باجی! تم کتنی خراب ہو' مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" قدسیہ منہ بنا کر اس سے مصنوعی خفگی کا اظہار کرتی رہی اور گلناز... اسے تو بس ہنسی آئے جارہی تھی۔

صالحہ نے رشتہ فورا" ہی منظور کرلیا تھا۔ دونوں گھرانوں میں مٹھائی کا تبادلہ ہوا اور بات پکی ہوگئی۔ عبید کو شام میں جب اس واقعے کی خبر ملی تو وہ پریشان ہوگیا۔ گھر کے بڑوں نے اسے آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ مبارک بادیں وصول کرتے وہ صبیحہ بیگم کو اپنے کمرے میں لے گیا اور گلناز سے شادی سے انکار کردیا۔

صبیحہ بیگم کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ گھر میں جشن کا سا سماں تھا اور عبید میاں ان کے سر میں خاک ڈلوانے کا انتظام کررہے تھے۔ مطیع الرحمان کے

لاکھ کھنے پر بھی انہوں نے عبید سے پوچھنا ضروری نہ سمجھا تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ عبید اپنی شادی کے لیے خود لڑکی ڈھونڈ لے گا۔ انہوں نے پیار محبت سے عبید کو سمجھانے کی کوشش کی' پر وہ نہ مانا۔ صبیحہ بیگم نے ناراضی دکھائی تو عبید پریشان ہو کر گھر سے باہر نکل گیا۔ جب تین دن تک وہ گھر واپس نہیں آیا ــــ تو صبیحہ بیگم نے مطیع الرحمان کے سامنے روتے ہوئے اپنے مان کی شکست کا اعتراف کرلیا۔ انہیں بیٹے کی جدائی برداشت نہ ہوئی۔ اب سوائے اس کی ضد مان لینے کے ان کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

"بہو بیگم! دیکھ آئیں عبید میاں کی پسند۔" اماں بیگم پان چباتے ہوئے صبیحہ بیگم کے سلام کا جواب دے کر پوچھ رہی تھیں۔ صبیحہ بیگم ان کے ساتھ مسہری پر بیٹھ گئیں۔ ان کے چہرے پر شدید تھکن کے آثار تھے۔ اماں بیگم کے سوال کے جواب میں فقط "جی" ہی کہہ پائیں اور ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہو گئیں۔ پر لاڈلی بیگم خاموش نہ رہ سکیں۔

"ارے اماں بیگم! کیا کہیں' کیا خوب حسن و جمال پایا ہے لڑکی نے۔۔۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔۔۔ عبید میاں یوں ہی دیوانے نہیں ہوئے ہیں۔ اسے تو کوئی بھی دیکھے' ریجھ جائے۔"

صبیحہ بیگم نے کلس کر لاڈلی آپا کی طرف دیکھا۔ اس سارے قصے میں ابتدا ہی سے وہ بے حد جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ مطیع الرحمان کو عبید کے حق میں انہوں نے راضی کیا تھا اور اب اس لڑکی کو دیکھ کر آنے کے بعد وہ محض صبیحہ بیگم کا دل جلانے کے لیے اس کی تعریف کیے جا رہی تھیں۔

"اماں بیگم! فقط حسن و جمال کو کیا کرنا ہے۔ نہ طور طریقہ' نہ رہن سہن اور نہ ہی بول چال' کچھ بھی ہمارے معیار کا نہیں۔" صبیحہ بیگم کہے بغیر رہ نہ سکیں۔ اماں بیگم ان کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھیں کہ لڑکی انہیں پسند نہیں آئی تھی۔

"تو کیا اب رشتہ نہیں کرو گی؟" اماں بیگم نے پوچھا تو صبیحہ بیگم سے تھا' لیکن ان کے کچھ بھی کہنے سے قبل ہی لاڈلی بیگم ٹھٹھا لگا کر بولیں۔

"آپ بھی کمال کرتی ہیں اماں بیگم! پسند نہ کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ بھابھی بیگم تو مجبور ہیں۔ اس کے علاوہ عبید میاں کسی اور لڑکی سے بیاہ کرنے کو تیار ہی نہیں۔" وہ تاک تاک کر صبیحہ بیگم کی بے بسی کو نشانہ بنا رہی تھیں اور ہر تیر نشانے پر لگ بھی رہا تھا۔ اماں بیگم نے انہیں خاموش کروایا۔

"اے ہائے لاڈلی بیگم! تم دو گھڑی کو خاموشی اختیار کرو تو ہم بہو بیگم کی بھی سنیں' وہ کیا کہتی ہیں۔" ساس کی حمایت صبیحہ بیگم کے دل کی بات زبان پر لے آئی۔

"میں کیا کہوں اماں بیگم! عبید نے کوئی گنجائش ہی کہاں چھوڑی۔ کہہ چکا ہے کہ اس معاملے میں کسی کی نہیں سنے گا۔ رشتے کی بات کر آئی ہوں' دیکھیں کب جواب آتا ہے۔"

"کب تک جواب دیں گے؟"

"والدہ صاحبہ فرما رہی تھیں کہ لڑکی کے والد امریکا میں ہوتے ہیں۔ ان سے مشورہ کر کے بتائیں گی۔ دوسرے لڑکی اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد شادی کرنا چاہتی ہے' جس پر عبید کو اعتراض ہے۔ وہ ایک دن بھی انتظار نہیں کر سکتا' فوراً شادی کرنا چاہتا ہے۔ کہہ رہا ہے شادی کے بعد پڑھنے بھیج دوں گا۔" صبیحہ بیگم تفصیل سنا چکیں تو اماں بیگم نے سر پیٹ لیا۔

"اوئی اللہ! کیا بالکل عقل سے پیدل ہو گیا ہے۔ ایک تو غیر خاندان میں شادی کرنے جا رہا ہے' دوسرا اپنی ریت روایت سب بھول گیا۔ اسے سمجھا دو' ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔"

"میں کیا سمجھاؤں؟" صبیحہ بیگم آپ تنگ آئی بیٹھی تھیں۔ "اولاد کچھ سنے تو والدین کہیں بھی' اب تو زمانہ ہی بدل گیا ہے۔"

"اب ایسی کیا ضروری پڑھائی پڑھ رہی ہے وہ لڑکی۔ کیا ڈاکٹر بن رہی ہے؟" ان کا رخ لاڈلی بیگم کی طرف

ہوچکا تھا کہ باقی تفصیل وہ گوش گزار کریں۔

"نہیں اماں بیگم! ڈاکٹری نہیں' فنون لطیفہ کی تعلیم حاصل کررہی ہے۔ تصویریں بناتی ہے' مجسمے بناتی ہے اور بھی جانے کیا الٹا سیدھا ہنر سیکھ رہی ہے۔" لاڈلی بیگم نے طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے بھابھی بیگم کی طرف دیکھا۔

"اور وہ بھی لڑکوں کے کالج میں۔" جہاں صبیحہ بیگم نے پہلو بدلا' وہیں اماں بیگم حق دق رہ گئیں۔

"اے سچ کہہ رہی ہو؟" لاڈلی بیگم نے مسکرا کر گردن ہلادی۔

اور اماں بیگم کلمے پیٹنے لگیں۔ "توبہ توبہ! آثار قیامت ہیں' کیسی بے حیائی پھیل رہی ہے' اللہ معاف کرے۔"

"اماں بیگم! کچھ بھی کہیں' پر نازنین بے حد حسین ہے۔ بالکل پری چہرہ۔ عبید میاں کے جوڑ کی ہے' لانبا قد' دودھ ملائی رنگت' نرگسی آنکھیں اور ایسی طرح دار' واہ واہ کیا کہنے۔ بھلا گل جیسی عام سی لڑکی کہاں جچتی ہمارے عبید میاں کے ساتھ۔"

لاڈلی بیگم بظاہر اپنی والدہ ماجدہ سے مخاطب تھیں۔ عبید میاں نے گلناز کو ٹھکرا کر ان کے سینے میں ٹھنڈ ڈال دی تھی۔ "اگر میری طوبیٰ نہیں تو تمہاری گلناز بھی نہیں صبیحہ بیگم!" دل ہی دل میں خوب خوش ہوتی لاڈلی آپا کی نظریں اپنی بھابھی کے چہرے پر گڑی تھیں۔ حساب بے باق ہوچکا تھا۔

صبیحہ بیگم میں اور حوصلہ نہیں تھا۔ وہ کام کا بہانہ بنا کر اٹھ گئیں اور اماں بیگم کمرے سے باہر نکل آئیں۔ عبدالرحمان کی ضد نے انہیں سر اٹھا کر بات کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

عبید کی خوشی سمجھ کر وہ نازنین کے گھر رشتہ لے جانے پر رضامندی ہوئیں تو وہاں انہیں ایک اور دھچکا لگا۔ نازنین وہی بدلحاظ لڑکی تھی جس نے آسیہ کی مہندی کی تقریب میں صبیحہ بیگم کے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ چونکہ تو نازنین بھی تھی لیکن پھر اس نے ایسے ظاہر کیا جیسے وہ ان سے پہلی بار مل رہی ہو۔ صبیحہ بیگم کو نازمیں حسن کے سوا اور کوئی خوبی نظر نہیں آئی تھی۔

عبید سے اس معاملے پر مزید کوئی بات کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ نہایت بے دلی سے رشتے کی بات کرکے واپس آگئیں۔

صالحہ اور گلناز تمام صورت حال سے واقف تھیں۔ سب کچھ ان کے سامنے ہوا تھا۔ یوں صالحہ کو بہن سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ اگر عبید ہی راضی نہیں تھا تو وہ بے چاری کیا کرسکتی تھیں۔ انہوں نے صبیحہ سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ گلناز بھی ماں کی طرح صابر تھی۔ اس نے قسمت کے لکھے کو چپ چاپ قبول کرلیا تھا۔ نہ کسی سے کچھ کہا' نہ ظاہر کیا' لیکن اس کی روئی روئی آنکھیں قدسیہ سے اس کے دل کا حال کہتی رہیں۔ صبیحہ بیگم کے ساتھ وہ بھی اپنے بھائی کی پسند دیکھ کر آئی تھی اور اسے سخت افسوس ہورہا تھا۔ ناز جیسی مغرور لڑکی جس نے اس کی ذات کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ آسیہ کی مہندی میں وہ اس کے طنز کا نشانہ بن چکی تھی۔ بھلا اس قابل کہاں تھی کہ گلناز کے مقابلے میں اسے ترجیح دی جاتی۔ اس نے عبید کو بھی سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ جس پر عبید نے کہا تھا۔

"مجھے حسین بیوی چاہیے۔۔۔ عادتیں کیسی بھی ہوں' بدلی جاسکتی ہیں' صورت بدلنا میرے بس میں نہیں ہوگا۔"

نازنین کے ساتھ چند ملاقاتوں نے عبید کو اس کے مزاج سے تھوڑا بہت تو آگاہ کر ہی دیا تھا مگر وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ شادی طے ہوجانے کے بعد بھی وہ دونوں ملتے رہے۔ ناز اپنی تعلیم ادھوری چھوڑنا نہیں چاہتی تھی اور عبید سے صبر نہیں ہورہا تھا۔ اس نے ناز کو یقین دلایا کہ شادی کے بعد وہ ضرور اس کی تعلیم مکمل کروائے گا۔

یوں دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں شروع ہونے لگیں۔ جس میں صرف پندرہ دن بچے تھے۔

عام دنوں میں ہی ناز کی فرمائشی لسٹ کافی لمبی ہوا کرتی تھی۔ جسے شاکر علی ہمیشہ پوری کرتے آئے تھے۔ اب تو نازنین کی شادی ہونے والی تھی۔ اس نے دنیا جہان کی بہترین چیزیں اپنے جہیز کے لیے جمع کرنی

تھیں۔ فوراً" شاکر علی کو خط لکھ ڈالا۔ طارق اور مہ جبیں وقار کے ساتھ اس کی شادی کے لیے لاہور پہنچ گئے تھے۔ شاکر علی نے طارق کے ہاتھ ناز کا فرمائشی سامان بھجوایا تھا۔ جسے دیکھ کر ناز کو شدید جھٹکا لگا تھا۔ جو کچھ اس نے لکھ کر بھیجا تھا۔ یہ اس کا آدھا بھی نہیں تھا۔ نہ ہی کپڑوں' جوتوں اور میک اپ کی وہ برانڈ تھی جو اس نے منگوائی تھی۔ پہلے تو اسے طارق پر شک ہوا کہ شاید اس نے اباجی کا دیا ہوا اصل سامان اس تک پہنچایا ہی نہیں ہے۔ اس نے عالیہ کے گھر جاکر ان کی ایمرجنسی ٹرنک کال ملوائی اور خود شاکر علی سے بات کی۔ وہ یہ سمجھے کہ ناز ان سے شادی میں شرکت نہ کرنے پر ناراضی کا اظہار کرنا چاہتی ہے لیکن ناز نے جب اپنی چیزوں کے متعلق سوال کیا تو ایک لمحے کو وہ خاموش ہوگئے۔ بیٹی کو باپ سے زیادہ چیزوں کی فکر تھی۔

انہوں نے نرمی سے سمجھانا چاہا کہ اب وہ ہارٹ پیشنٹ ہیں۔ کالج کی جاب چھوٹ جانے کے بعد وہ زیادہ تر گھر میں رہتے ہیں۔ گورنمنٹ کی جانب سے الاؤنس کے طور پر کچھ رقم ملتی ہے۔ ناز کی فرمائشی لسٹ پوری کرنا اب ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ سو جتنا ہوسکا اتنا بھیج دیا۔

ناز اس عذر کو تسلیم کرنے سے انکاری تھی۔ اس نے پھر اصرار کیا کہ "اباجی! آپ کے پاس بینک میں تو کچھ رقم ضرور ہوگی۔ وہی بھجوادیں' میں اپنی پسند سے خریداری کرلوں گی۔"

ناز جو مطالبہ ایک بار زبان سے کرتی اسے منوایا کرتی تھی۔ جیسا جہیز وہ لے جانا چاہتی تھی' طارق اور محسنہ اس کی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ اور اب شاکر صاحب بھی نہیں رکھتے تھے۔ ناز نے باپ کا انکار سن کر غصے میں باپ کی پوری بات سنے بغیر ہی فون پٹخ دیا۔

✲ ✲ ✲

شاکر علی سے صاف انکار سننے کے بعد نازنین نے محسنہ کے سامنے رونا دھونا شروع کردیا۔ وہ آنسو بہاتی باپ کو برا بھلا کہتی جارہی تھی اور محسنہ کو مظلوم۔۔۔

پہلے پہل تو محسنہ کو یقین ہی نہ آیا کہ ناز ان کی طرف داری میں باپ کو برا کہہ رہی ہے مگر وہ ماں تھیں' ناز کو نادم دیکھ کر انہوں نے بھی اپنا دل صاف کرلیا۔

ماں کو منالینے کے بعد اگلے ہی دن وہ اپنا فرمائشی پروگرام لے کر ان کے پاس پہنچ گئی۔ طارق بھی وہیں موجود تھا۔ محسنہ شاید بھائی سے کہہ کر اس کے لیے وہ سب کچھ ضرور خرید لیتیں' جو وہ لینا چاہ رہی تھی۔ مگر طارق نے اس کی لسٹ پڑھ کر صاف انکار کردیا۔

"یہ تمام چیزیں لے کر تم کیا کروگی؟ جتنا سامان لیا جاچکا ہے کافی ہے۔ ابھی ہمیں کھانے اور جگہ کا انتظام بھی کروانا ہے۔ اس پر تمہارے سسرال والوں کے ہاں کچھ رسم و رواج بھی ایسے ہیں۔ جن کو پورا کرنے کے لیے پیسے کی ضرورت پڑے گی۔" وہ اسے مناسب لفظوں میں سمجھا رہا تھا۔

"تمہارے سسرال والے ولیمہ سے اگلے دن کسی چوتھی کی رسم کا کہہ گئے ہیں اور ان سب کو پہناونیاں بھی دینی ہیں۔ اس کے علاوہ تمہارے ساس اور نندوں کو سونے کی کوئی چیز بھی دینی پڑے گی۔ ہزاروں خرچے اور ہیں۔۔۔ ہمارے حساب سے تمہارا سب کچھ مکمل ہے۔ اب امی جی کو اور پریشان مت کرو' یہ لسٹ لے جاؤ۔"

نازنین کا چہرہ اتر گیا تو محسنہ' طارق سے بولیں۔

"دے تھوڑی سی چیزاں دلا دے۔۔۔" طارق نوٹ بک پر سر جھکائے حساب کتاب جوڑتا رہا۔ اس نے ماں کو بھی صاف منع کردیا۔ "امی جی! تابندہ کی بھی شادی کرنی ہے آگے' اس کے لیے بھی یہی سب لاکے رکھنا ہوگا۔ اتنا ہی کرو جتنی حیثیت ہے۔"

نازنین پیر پٹختی وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ ہمیشہ وہ اپنی پسند' اپنی خواہش کے حساب سے جیتی آئی تھی۔ لیکن اب سب کچھ بدلنے والا تھا۔ جس کے لیے وہ ذہنی طور پر قطعی تیار نہیں تھی۔

آمنہ بیگم نے اپنی چھوٹی بھابھی کا میک اپ کرنے کے بعد داد طلب نظروں سے اس کی سہیلی عالیہ کی طرف دیکھا جو پہلے ہی انہیں تمسخرانہ نگاہوں سے دیکھ

رہی تھی۔ آمنہ کا سارا جوش و خروش ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔ انہوں نے خاموشی سے دلہن کو زیور پہنائے اور خدا حافظ کہہ کر اپنا پرس اٹھاتے ہی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

"اس نے تمہیں کیا بنا دیا ہے؟ قسم سے ہونق لگ رہی ہو۔ سارا کاجل آنکھ سے باہر پھیلا دیا ہے۔ بڑی میک اپ کرنے آئی تھیں... چہرہ بگاڑ کر چلی گئیں۔"

آمنہ کے باہر جاتے ہی عالیہ نے نازنین سے کہا' جو اس کے تبصرے سے پریشان ہو کر آئینے میں اپنا جائزہ لے رہی تھی۔ صحیح معنوں میں اسے شدید رنج ہوا۔

"اس سے اچھا میک اپ تو میں خود کر لیتی۔" اس نے کہا۔

"اب ٹھیک کر لوں؟" عالیہ نے فوراً" اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے پرس میں سے ایک ٹشو نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ "اس سے آئی میک اپ صاف کرو' میں کاٹن بھگو کر لاتی ہوں۔ ابھی تمہارا میک اپ دوبارہ کر دیں گے۔"

"کوئی ضرورت نہ ہے۔" محسنہ کی آواز سنائی دی۔ وہ ان کی گفتگو کمرے میں داخل ہوتے سن چکی تھیں۔ ڈپٹ کر بولیں۔ "خبردار... کچھ بدلنے کی ضرورت نہیں ہے گی' جیسا کر گئے ہیں' ٹھیک ہے گا... او عالیہ سر ڈھانپ لے' مولوی صاحب آ رہے ہیں۔"

عالیہ نے نہایت بے دلی سے اپنے چنے ہوئے رسی نما دوپٹا کو سر پر رکھا۔ پھر دروازے پر دستک کے ساتھ ہی نکاح خواں اور چند قریبی رشتہ داروں کو طارق کے ساتھ اندر آتے دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔ محسنہ نے ناز کو پلنگ پر بٹھا دیا تھا۔ نکاح خواں نے نازنین سے اس کی مرضی معلوم کی تو وہ اپنے مہر کی رقم سن کر بجھ سی گئی "قبول ہے؟" پوچھے جانے پر چند لمحوں کے لیے کچھ بول ہی نہ پائی۔ مولوی صاحب نے دوبارہ پوچھا تو محسنہ نے اس کا کندھا پکڑ کر ذرا سا ہلایا۔ چونک کر نازنین نے اپنے سامنے بیٹھے بھائی کو دیکھا' جو اس کے جواب کا منتظر تھا۔ سر کو خفیف سی جنبش دے کر نازنین نے قبول ہے کا عندیہ دے دیا۔

تین بار ایجاب و قبول کروانے کے بعد مولوی صاحب اور گواہان باہر نکل گئے۔ محسنہ روتے ہوئے نازنین سے لپٹ گئیں۔ عالیہ بھی سوں سوں کرتی جھوٹ موٹ کا رونا رو رہی تھی۔ جبکہ نازنین اسے تو اپنی استانی یاد آ رہی تھیں' جنہوں نے ایک بار حقوق نسواں پر کلاس میں نہایت پرجوش تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اری نامراد لڑکیو! شوہروں کی محبت میں اپنے حق مہر معاف نہ کیا کرو' بہلاووں میں نہ آنا' یہ حق مہر ہی تو لڑکی کی قدر و قیمت ہوتا ہے۔" اور یہاں تو ایسا کچھ تھا ہی نہیں جو اسے وصول کرنے میں مشکل پیش آتی۔

☼ ☼ ☼

عبید نے پھولوں کا سہرا چہرے سے ہٹا کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے تھے۔ ان کے ساتھ بیٹھے شفیق الرحمان اور سب دوست احباب نکاح کے ایجاب و قبول انجام بخیر پانے کے بعد ان کی خوشگوار ازدواجی زندگی کے لیے دعاگو تھے۔

"کہاں رہ گئی تھی مہ جبیں۔" محسنہ نے کمرے میں تابندہ کے ساتھ داخل ہوتی مہ جبیں سے پوچھا۔ تو وہ بولی۔

"کیا کہوں امی جی! نازنین کی ساس کو ہر گلاس میں سے بو آ رہی تھی' گھر میں آ کر کانچ کا گلاس اچھی طرح مانجھ کر انہیں برف ڈال کے ٹھنڈا پانی دے کر آئی ہوں' اف... بڑے غصے والی ہیں اس کی ساس۔"

"اچھا رہن دے... ایس ویلے ایہو جی گلاں نہ کریے تے چنگا اے... اس کو لے کر باہر جاوے ہیں گے۔" محسنہ نے پیار سے نازنین کا گھونگھٹ ہٹا کر اسے محبت سے پیشانی پر چومتے ہوئے ہمیشہ خوش رہنے کی دعا دی اور اپنی آنکھوں میں امڈتے آنسو سب سے چھپانے کی کوشش میں سر جھکا کر جلدی سے باہر چلی گئیں۔

تھوڑی دیر میں اس کی سہیلیاں اور بہنیں اسے تھامے ہوئے کمرے سے باہر لے کر آئیں اور اسے

چھیڑتی ہوئی ہنستی کھلکھلاتی پنڈال کی طرف چلنے لگیں۔ چلتے چلتے طیبہ نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"بڑے بے چین ہیں دولہا بھائی تمہارے دیدار کے لیے۔" اور کھل کھل کرنے لگی۔

"ہاں بھئی' محبت سے بیاہ کر لے جا رہے ہیں' بڑی قدر کریں گے۔" تابندہ بھی شامل گفتگو ہوئی۔

"ہونہہ۔۔۔ کیا خاک قدر کریں گے۔" عالیہ تپ کر بولی۔ "کچھ معلوم بھی ہے' سوا تیس روپے تو حق مہر لکھوایا ہے انہوں نے۔"

مہ جبیں نے عالیہ کی بات سن کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اشارہ کیا کہ خاموش رہے۔ وہ لوگ پنڈال میں داخل ہونے والی تھیں۔ اگر یہ باتیں نازنین کے سسرال والے سن لیتے تو اس کے لیے مسائل پیدا ہونے کا اندیشہ تھا لیکن عالیہ پر مہ جبیں کے اشاروں کا خاک اثر نہ ہوا اور وہ جو منہ میں آیا بولتی رہی' بنا سوچے سمجھے۔

"ہماری نازنین تو لاکھوں میں ایک ہے' اتنی خوب صورت' ایسی حسین کہ لاکھوں اس پر وار دیے جائیں اور افسوس نہ ہو اور ان کی محبت؟ ایسی کنجوس نکلی کہ فقط سوا تیس روپے مول طے کیا۔ بے چاری! کیسے ناقدروں میں جان پھنسی ہے۔ بھئی ناز! مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے۔"

آخری جملہ عالیہ نے نہایت بناوٹی انداز میں ہمدردی جتاتے ہوئے ادا کیا۔ جسے سن کر ساتھ چلتی تمام لڑکیاں ہنسنے لگیں۔ نازنین کو اپنی ہتک کا احساس جلائے دے رہا تھا۔ کیا کیا ارمان تھے اس کے' کیا کیا نہیں سوچا تھا اس نے۔ لیکن یہاں تو ابتدا ہی کچھ ایسی ہوئی تھی کہ دل کھٹا ہو رہا تھا۔ پہلے چہرے کا ستیاناس ہوا فضول میک اپ سے اور اب حق مہر کی رقم کو لے کر سہیلیوں کی ہرزہ سرائی۔

عبید سے اسے ہرگز یہ امید نہیں تھی۔ حجلہ عروسی میں اس کا اظہار بھی کر دیا۔ اس کا شکوہ سن کر عبید لمحہ بھر کو چپ سا ہوا تھا۔ پھر سنبھل کر بولا۔

"یہ معاملات میرے والدین نے طے کیے ہیں۔ میں اس میں دخل نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن ہاں! اتنا وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ میرے ساتھ رہتے ہوئے تمہاری کوئی خواہش' کوئی آرزو تشنہ نہیں رہے گی۔ میں مقدور بھر تمہاری ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔ ہمیشہ تم سے محبت کروں گا اسی شدت اور دیوانگی کے ساتھ۔"

عبید کے وعدے وعید اور خوب صورت باتیں سن کر وہ اپنے سارے شکوے شکایتیں بھول گئی کہ اس رات محبت نے اپنے خواب کی تعبیر پالی تھی۔

☼ ☼ ☼

"عبید میاں۔۔۔ دروازہ کھولیں۔"

آمنہ کے بار بار دستک دینے پر عبید کی آنکھ کھلی۔ نازنین باتھ روم میں تھی۔ اسی وقت وہ بھی باہر نکل آئی اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہی آمنہ کھڑی مسکرا رہی تھیں اور ان کے پیچھے گلناز اور قدسیہ ہاتھ میں ناشتا کی ٹرے تھامے ہوئے تھیں۔ نازنین نے ایک طرف ہو کر انہیں سلام کرتے ہوئے کمرے میں آنے کا رستہ دیا۔ تب تک عبید بھی بستر سے اتر کر کھڑا ہو گیا تھا۔ آمنہ نے پیار سے بھائی کی پیشانی چومی۔

"تمہیں ابا میاں بلا رہے ہیں' پہلے ان کی بات سن آؤ پھر آ کر ناشتا کر لینا۔"

عبید سر ہلا کر منہ ہاتھ دھونے باتھ روم میں چلا گیا۔

"گلناز! یہ ناشتے کی ٹرے یہاں چھوٹی میز پر رکھ دو اور قدسیہ! تم ذرا یہ کمرا سمیٹو۔" ان دونوں سے کہنے کے بعد پھر وہ ناز کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"آپ ناشتا کر لیجیے' میں نے خود بنایا ہے آپ کے لیے' امی بیگم تو کہہ رہی تھیں کہ رہنے دو' دلہن کے گھر والے بھیج دیں گے' میں نے کہا' دس تو بجنے والے ہیں' اب کہاں آئے گا' میں ہی بنا دیتی ہوں۔"

نئی نویلی دلہن نازنین شرمندہ سی ہو گئی۔ "وہ دراصل ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہاں کون کون سی رسمیں ہوتی ہیں' اس لیے۔"

"کوئی بات نہیں۔" آمنہ میٹھے لہجے میں بولیں۔ "اچھا ہوا آپ نے غسل کر لیا۔ اب جلدی سے ناشتا کر لیجیے۔ پھر میں آپ کو نیچے لے چلوں گی۔ سب بزرگوں کو سلام کرنا ہے نا۔۔۔ منہ دکھائی بھی وہیں ملے گی۔" تب ہی گلناز اور قدسیہ کسی بات پر ہنسنے لگیں تو آمنہ نے ان کی طرف دیکھا۔

"کیا ہوا؟ تم لوگوں کی ہنسی نہیں رک رہی۔"

"ہاں آپا بیگم۔۔۔ یہ دیکھیں! امی بیگم جو کہانی سنایا کرتی تھیں' ہماری چھٹپن میں۔۔۔ وہ آج سچ ثابت ہو گئی۔" قدسیہ نے بدستور ہنستے ہوئے کہا تو آمنہ کے بجائے عبید نے سوال کیا' جو اسی وقت باتھ روم سے باہر آیا تھا۔

"کون سی کہانی۔۔۔ ذرا ہمیں بھی تو بتاؤ۔" دلچسپی تو نازنین کو بھی ہو رہی تھی۔ قدسیہ نے کہا۔

"وہی کہانی جس میں شہزادی ایک مرد کے بھیس میں شہزادے کے محل میں داخل ہوتی ہے اور ملکہ کو شک ہو جاتا ہے۔ وہ رات کو اس کے سرہانے پھول رکھ دیتی ہے' جو صبح ہونے تک بالکل مرجھا جاتے ہیں اور یوں شہزادی پکڑی جاتی ہے۔ کیونکہ مرد کے بجائے عورت کے پاس پھول جلد مرجھا جاتے ہیں۔ اب یہ دیکھیں۔" قدسیہ نے ایک طرف ہو کر سب کی توجہ دلائی۔

"یہاں چھوٹی بھابھی کی چوڑیوں کے پاس رکھے پھول قدرے مرجھا چکے ہیں۔ جبکہ عبید بھائی۔۔۔ آپ کے سرہانے رکھے پھولوں کے ہار ابھی تک تر و تازہ ہیں۔ دیکھا آپ نے۔" قدسیہ کی تفصیل سن کر یک بارگی سب ہی ہنسنے لگے تھے سوائے نازنین کے' جسے قدسیہ کا انداز بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ وہ منہ بناتی صوفے پر بیٹھ گئی۔ آمنہ نے فوراً" ناشتے کی ٹرے اس کے سامنے میز پر رکھ دی۔ نازنین نے عبید کی طرف دیکھا۔

"تم شروع کرو' میں ابا میاں کی بات سن کر آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور آمنہ بھی ان کے پیچھے چلی گئیں۔

"ناز بھابھی۔۔۔ اوہ سوری۔۔۔ میرا مطلب ہے ناز باجی! تم بھی لو نا۔۔۔ تم نے بھی ناشتا نہیں کیا۔" قدسیہ نے جب کہا تو پہلے نازنین یہی سمجھی کہ اسے مخاطب کیا گیا ہے۔ لیکن اسے حیرت ہوئی کیونکہ قدسیہ نے ایک بار بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ یعنی وہ گلناز کو ناز بھابھی کہہ رہی تھی؟ اور گڑبڑائی تو گلناز بھی تھی۔ بات سنبھالنے کی غرض سے بولی۔

"آپ کا اور میرا نام دراصل ملتا جلتا ہے نا۔ اس لیے قدسیہ کے منہ سے نکل گیا۔ آپ برا مت مانیے گا۔" اس کی وضاحت پر نازنین کوشش کے باوجود مسکرا نہیں سکی تھی۔ وجہ قدسیہ کے تاثرات تھے۔ وہ دانتوں تلے مسکراہٹ دبائے گلناز کی ناشتے کی پلیٹ میں روغنی روٹی اٹھا کر رکھ رہی تھی۔ اس کے انداز سے نازنین کو یقین ہو گیا کہ اس نے جان بوجھ کر گلناز کو بھابھی کہا تھا' لیکن کیوں؟

وہ چھوٹے چھوٹے لقمے لیتی رہی اور عبید کی آمد کا انتظار بھی کرتی رہی۔ آدھے گھنٹے بعد آمنہ اس کے پاس آئیں اور اپنے ساتھ نیچے چلنے کا کہا تو بالآخر وہ ہمت کر کے پوچھ بیٹھی۔

"عبید کہاں ہیں۔ انہوں نے ناشتا بھی نہیں کیا۔"

آمنہ اس کے سر پر دوپٹے میں پنیں اٹکا رہی تھیں۔ منہ میں دابی پن نکال کر بولیں۔

"آپ فکر نہ کریں' انہوں نے ابا میاں کے ساتھ ناشتا کر لیا ہے۔ اب جلدی چلیں' سب آپ کے منتظر ہیں۔"

آمنہ اسے کندھوں سے تھام کر کمرے سے باہر لے آئیں اور وہ حیران پریشان سوچ میں گم۔

"عبید نے میرے بغیر ہی۔۔۔" سختی سے لب بھینچ کر وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم ابا میاں!" عبید نے مطیع الرحمان کو سلام کیا۔ مطیع الرحمان نے ان کے سلام کا جواب دے کر اپنے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے کہا۔ ”بیٹھ جایئے عبید میاں! ہم آپ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔“

پورے گھر میں مہمان بھرے ہوئے تھے۔ شادی والا گھر تھا۔ قریبی عزیز رشتہ دار ابھی جمع تھے۔ اس لیے مطیع الرحمان گھر کے پچھلے صحن میں کرسی پر اخبار پڑھتے ہوئے عبید کے منتظر تھے۔ ان کے سامنے لوہے کی میز پر ان کا ناشتا بھی رکھا ہوا تھا۔ انہیں عبید سے اکیلے میں بات کرنی تھی۔ اس لیے انہیں یہیں بلوا بھیجا تھا۔ وہ اخبار لپیٹ کر سیدھے ہو کر بیٹھے۔ ”آپ نے ناشتا کرلیا۔“

”جی نہیں۔ میں بعد میں ناشتا لوں گا۔ آپ کہیے ابا میاں! آپ مجھ سے کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔“

”ہوں۔“ مطیع الرحمان نے ایک لمبی گہری سانس لی اور کہنا شروع کیا۔ ”دیکھئے بھئی عبید! اب آپ ماشاء اللہ سے شادی شدہ ہیں اور اس صورت حال میں آپ پر کچھ اہم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔“ وہ پل بھر کو رکے۔ عبید پوری طرح ان کی طرف ہی متوجہ تھے۔ اس اطمینان کے بعد وہ گویا ہوئے۔

”آپ کی ماں گلناز سے آپ کی شادی کرنا چاہتی تھیں لیکن آپ کے انکار سے انہیں بے حد دکھ پہنچا تھا۔“ عبید نے شرمندگی سے سر جھکا لیا' ابا میاں کہتے رہے۔

”انہوں نے آپ سے اپنی شدید محبت کا ثبوت دیتے ہوئے آپ کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ حالانکہ نازنین کا خاندان اور ان کا رہن سہن ہرگز ہمارے معیار کا نہیں' اس کے باوجود ہم آپ کی خوشی کی خاطر اسے بیاہ کر اس گھر میں لائے ہیں۔ اب وہ آپ کی ذمہ داری ہے۔ نئے ماحول میں آئی ہے۔ اسے ہمارے طور طریقوں کا علم نہیں ہے۔ یہ سب آپ کو سمجھانا ہوگا۔ اس گھر میں بزرگوں کا احترام کیا جاتا ہے اور چھوٹوں سے پیار۔ آپ کی ماں کو اندیشہ ہے کہ شادی کے بعد آپ بدل جائیں گے اور میں آپ سے یقین دہانی چاہتا ہوں کہ آپ زندگی بھر اپنی ماں کے سامنے سر نہیں اٹھائیں گے۔ خود بھی ان کی عزت پہلے سے زیادہ کریں گے' اور اپنی بیوی سے بھی کروائیں گے۔ انہوں نے آپ کی خوشی پوری کردی۔ اب آپ کی باری ہے۔“ ان کی بات ختم ہونے پر عبید نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔

”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں ابا میاں! آپ کو یا امی بیگم کو مجھ سے اور نازنین سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“

”ہمیں آپ سے یہی امید تھی۔“ ابا میاں مسکرائے۔ ”چلیے ناشتا شروع کریں۔“

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

آمایہ خان

ناولٹ

کیلی فورنیا ہائی وے پر "مہرز خان" نامی ایک نوجوان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ آفیسرز کے مطابق اس نوجوان کے زندہ بچنے کے امکانات کم ہیں۔

مہرز خان اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ روڈ ایکسیڈنٹ میں اس کے والدین کی وفات ہو چکی ہے۔ اب وہ کیلی فورنیا میں اپنے پرانے اور با اعتماد ملازم جیری کے ساتھ رہتا ہے۔ رضا اس کا دوست ہے۔ مہرز کا اس کے گھر بھی آنا جانا ہے۔ رضا کی چھوٹی بہن عنبر کو وہ بھی اپنی بہن سمجھتا ہے۔

رامین ایک مغموم و معصوم لڑکی ہے۔ ماں کے ظلم کی وجہ سے ہر وقت وحشت زدہ رہتی ہے۔ ماں کے انتقال پر اس کی پھوپھیاں آمنہ بیگم اور قدسیہ بیگم اسے سنبھالتی ہیں۔ تایا شفیق الرحمان اسے اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کرتے ہیں مگر وہ منع کردیتی ہے۔

رامین اور مہرز کے درمیان اسکول کے پہلے دن سے ہی خوب اچھی دوستی ہو جاتی ہے۔ پھر حسن بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے مگر ایک دن رامین کے والد اسے مہرز اور حسن کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ کر بہت سختی کرتے ہیں۔ اس دن کے بعد سے رامین ان دونوں سے کھنچ جاتی ہے۔ میٹرک تک آتے آتے رامین کی سرد مہری کے باوجود مہرز اس کو پسند کرنے لگتا ہے۔

مطیع الرحمان اور صبیحہ بیگم کے دو بیٹے شفیق الرحمان اور عبید الرحمان اور بیٹیاں آمنہ بیگم اور قدسیہ بیگم ہیں۔ لاڈلی بیگم، مطیع الرحمان کی چھوٹی بہن ہیں اور صالحہ بیگم، صبیحہ بیگم کی چھوٹی بہن ہیں، جو بیوہ اور تین بچوں کی ماں ہیں۔ صبیحہ بیگم اپنے میاں کی رضامندی سے انہیں اپنے ساتھ رکھ لیتی ہیں۔ ان کی بہت سلگھڑ، مگر قدرے عام صورت بیٹی گل ناز کو صبیحہ بیگم عبید الرحمان کے لیے لینے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ گل ناز بھی عبید الرحمان کو پسند کرتی ہے۔ دوسری طرف لاڈلی بیگم کی خواہش ہے کہ عبید الرحمان کے لیے ان کی بیٹی طوبیٰ کو لیا جائے۔ صبیحہ بیگم بہت ہوشیاری سے مطیع الرحمان اور اپنی ساس کو گل ناز کے حق میں راضی کر لیتی ہیں۔

لیکن عبید الرحمان کسی شادی میں نازنین کو پسند کر لیتے ہیں، جو محسنہ اور شاکر علی کی سب سے چھوٹی اور نہایت حسین بیٹی ہے۔ شاکر علی کی ہی طرح مغرور بھی۔ محسنہ انبالہ سے تعلق رکھنے والی ایک سادہ، ان پڑھ اور کم صورت خاتون تھیں۔ جبکہ شاکر علی خوش شکل، خوش لباس پروفیسر تھے۔ انہوں نے محسنہ اور بچوں کی کفالت کے علاوہ کبھی بیوی بچوں میں دلچسپی نہ لی مگر نازنین پر انہوں نے خوب توجہ دی جس کے باعث وہ مزید مغرور اور خودسر ہو گئی۔

عبید الرحمان بہت مشکل سے اپنے گھر والوں کو نازنین کے لیے راضی کر پاتے ہیں۔

تیسری قسط

"سلام آلیکم۔" نازنین نے دادی بیگم کے سامنے کھڑے ہو کر انہیں سلام کیا۔ جس کے جواب میں دادی بیگم نے اپنی عینک کو تین انگلیوں میں تھام کر سر سے پیر تک پہلے تو اس کا معائنہ کیا، پھر جھٹک کر بولیں۔

"اے بی، یہ سلام آلیکم کیا ہوتا ہے، تمہیں کسی نے سلام کرنا نہیں سکھایا۔ السلام علیکم کہا جاتا ہے۔ چلو۔۔۔ پھر سلام کرو۔"

دادی بیگم کے پے در پے حملوں سے گڑبڑا کر ناز نے آمنہ بیگم کی طرف دیکھا تو وہ نرمی سے مسکرا کر بولیں۔

"دوبارہ سلام کر لیجیے۔ جیسے دادی بیگم کہہ رہی ہیں۔" اور نازنین نے مریل سی آواز میں دوبارہ سلام کیا اور اب کی بار وہ ہر حرف کو واضح ادا کر رہی تھی۔ یوں اس کا سلام قبول کر لیا گیا۔ دادی بیگم اسے شاباش دیتے ہوئے بولیں۔

"ہاں شاباش! اب ہمیشہ اسی طرح سلام کیا کرنا، سمجھیں!" ناز نے جلدی جلدی ہاں میں سر ہلا کر انہیں اپنی فرماں برداری کا یقین دلایا تو منہ دکھائی کے طور پر گیارہ روپے بھی عنایت کر دیے گئے۔

اس کے بعد گھر میں موجود باقی بزرگوں سے تعارف حاصل ہوا۔ صبیحہ بیگم نے نہایت روکھے انداز میں اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔ لاڈلی بیگم تو یوں صدقے واری جا رہی تھیں جیسے وہ بچپن سے ان کی گود میں کھیلتی رہی ہو۔ گھر بھرا ہوا تھا۔ بھانت بھانت کی آوازیں، چھوٹے بڑے بچوں کی بھیڑ، محلے دار بھی نویلی دلہن کو دیکھنے کے لیے جمع تھے۔ ناز چکرا کر رہ گئی۔

آمنہ نے اس کی حالت دیکھ کر آرام سے صوفے پر بٹھایا تو اسی وقت جانے کہاں سے ایک دبلا پتلا لڑکا بھاگتا ہوا آیا اور ناز کی گود میں زبردستی چڑھ کر بیٹھ گیا۔

"یہ ٹیپو ہے۔ آپ کا دیور۔" آمنہ نے اس کا تعارف کروایا۔ "یہ گلناز کا چھوٹا بھائی ہے۔ پر عبید اسے بہت چاہتے ہیں بہت لاڈلا ہے ان کا۔"

انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے ناز کی گود سے اترنے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا۔

"نہیں، پہلے بھابھی مجھے پیسے دیں گی، پھر اتروں گا۔" اور ناز جو گود میں اتنے بڑے بچے کے بیٹھنے سے اپنے کپڑوں کے مسکنے کا افسوس کر رہی تھی۔ ہاتھ میں دبے گیارہ روپے اسے تھما کر اپنی جان چھڑائی۔ پیسے ملتے ہی وہ اچھل کر گود سے اترا اور کھیلنے کے لیے باہر چلا گیا۔ جی تو نازنین کا بھی یہی چاہ رہا تھا کہ اٹھے اور یہاں سے بھاگ جائے۔ لیکن شاید پہلی دفعہ اپنی خواہش پر فوراً" عمل کرنا اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

ساڑھے بارہ بجے کے بعد وہ اوپر اپنے کمرے تک پہنچ پائی تھی۔ عبید ذرا دیر کو اس کے پاس آئے تھے اور پھر اپنے رشتہ داروں کے پاس جا کر بیٹھ گئے تھے اس کا کمرا صاف کر دیا گیا تھا۔ آمنہ نے اسے دو گھڑی آرام کرنے کا مشورہ دیا تو فوراً" بستر پر دراز ہو گئی اور آمنہ ولیمہ کا جوڑا استری کرنے لگیں۔ نازنین فقط آدھا گھنٹہ ہی سوئی تھی کہ آمنہ نے پھر سے جگا دیا۔

"اٹھ جائیے ناز! یہ جوڑا پہن لیں، پھر میں آپ کا میک اپ کر دوں گی۔"

یہ آفر سنتے ہی اس کا ذہن پوری طرح بیدار ہو گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"آمنہ آپا! اگر آپ کو برا نہ لگے تو آج میں خود تیار ہو جاؤں۔" اس نے رسانیت سے پوچھا۔

اس کا سوال سن کر کپڑوں سے میچنگ چوڑیاں ڈبے سے نکالتی آمنہ یکدم چوڑیاں ہاتھ سے رکھ کر اس کی شکل دیکھنے لگیں۔ پھر سمجھ گئیں کہ چھوٹی بھابھی کو شادی والے دن ان کا ہنر پسند نہیں آیا۔ مگر بات بڑھانے کا فائدہ؟ انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے آگے بڑھ کر دروازہ بند کیا اور اندر سے چٹخنی چڑھا دی۔ پھر نازنین کو ولیمہ کا جوڑا پکڑاتے ہوئے کہا۔

"آپ کپڑے بدل کر آئیں اور پھر جیسے چاہیں تیار ہو جائیں۔ بس کسی کو کچھ بتائیے گا نہیں، ورنہ امی بیگم سن کر مجھے سو جوتے لگائیں گی۔" ناز نے خوش ہو کر اثبات میں سر ہلایا اور کپڑے بدلنے کے لیے باتھ روم میں چلی گئی۔

باہر نکل کر اس نے اپنے جہیز کا میک اپ بکس کھولا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گئی۔ آمنہ ایک طرف بیٹھی اس ایک دن کی دلہن کو اعتماد کے ساتھ خود کو سجاتے سنوارتے دیکھتی رہیں۔ میک اپ کے بعد اس نے آمنہ کی طرف دیکھا تو وہ مسکراتے ہوئے خاموشی کے ساتھ اٹھ کر اسے زیور پہنانے لگیں، پھر بالوں میں بیلے کی کلیاں سجا کر دوپٹا اوڑھا دیا۔

"لگتا ہے عبید کی شادی کا صدمہ گلناز نے دل پر لے لیا ہے۔ دیکھو تو کیسی کمزور ہو رہی ہے، آنکھوں کے گرد حلقے بھی پڑ گئے ہیں۔ نیندیں ہی اڑ گئی ہوں گی بے چاری کی۔" دبی دبی سرگوشیاں آس پاس ہی کہیں سنائی دی تھیں۔ نازنین اور لاڈلی بیگم دونوں کو۔۔۔

ناز نے چونک کر ان دو عورتوں کی جانب دیکھا جو ٹرے میں چائے کے کپ پیش کرتی گلناز کو دیکھ کر آپس میں بات کر رہی تھیں۔ لاڈلی بیگم نے غور سے نازنین کے چہرے کو دیکھا۔ بلاشبہ وہ ان عورتوں کی گفتگو سے کچھ الجھی الجھی نظر آ رہی تھی۔ موقع اچھا تھا۔ جسے لاڈلی بیگم نے گنوانا ہرگز مناسب نہیں سمجھا۔

"گلناز سے ہوشیار رہنا۔" لاڈلی بیگم ناز کے ذرا سا نزدیک ہو کر کہنے لگیں۔

ناز نے حیران ہو کر گردن موڑی۔ "کیوں؟"

"دیکھنے میں بہت معصوم نظر آتی ہے، پر گنوں کی پوری ہے۔ بھابھی بیگم پر تو یوں مانو جیسے جادو کر رکھا ہے۔ اطاعت گزاری، خدمت اور فرماں برداری کے ڈھونگ رچاتے نہیں تھکتی۔ بچپن سے اسی گھر میں رہتی ہے۔ ایسا قابو کیا بھابھی بیگم کو کہ انہوں نے عبید سے بات بھی پکی کر دی۔" ناز پے در پے انکشافات سنتی جا رہی تھی۔

"لیکن عبید میاں نے عین وقت پر انکار کر دیا اور بھئی اچھا ہی کیا۔ بھلا تمہاری جیسی حسین لڑکی کے سامنے اس کی اوقات ہی کیا ہے؟ میں تو بے حد خوش ہوں تم دونوں کی شادی سے۔ عبید نے بالکل صحیح

فیصلہ کیا۔" نازنین نے پہلے دن سے ہی لاڈلی بیگم کا جوش و خروش ملاحظہ کر رکھا تھا۔ حقیقتاً" وہ اس شادی میں بے حد خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

"گلناز شروع دن سے عبید کو پسند کرتی ہے۔ اب بھی ایک ہی گھر میں رہنا سہنا ہوگا۔ ہر روز سامنا بھی ہوگا۔ بس تم عبید کو ذرا لگام ڈال کر رکھنا اور گلناز پر بھی نگاہ رکھنا۔ ویسے تو میں کسی کے ذاتی معاملات میں دخل نہیں دیتی، لیکن تم میری بیٹی جیسی ہو اور اس گھر میں نئی ہو۔ اس لیے تمہیں نصیحت کرنے لگی ہوں تم برا نہ ماننا۔"

لہجے کی شیرینی اور لاڈلی بیگم کا مشفقانہ رویہ... نازنین فوراً" ہی ان کی کہی گئی ہر بات پر ایمان لے آئی۔ ویسے بھی اس نے بیاہ کر آنے کے بعد اپنے سسرال والوں میں صرف آمنہ بیگم اور لاڈلی بیگم کا سلوک بہتر پایا تھا۔ باقی خواتین خصوصاً" صبیحہ بیگم اور قدسیہ کی تو اسے دیکھ کر ہی تیوریاں چڑھ جایا کرتی تھیں۔ رہی گلناز، تو اس ایک ہفتہ میں اس نے گلناز کو صرف کاموں میں مصروف دیکھا تھا۔

مہمانوں سے بھرے گھر میں وہ پھرکی کی طرح گھومتی ہر ایک کو اس کی ضرورت کی چیز پہنچاتی نظر آتی تھی۔ صبیحہ بیگم تو ہر دم اسی کے نام کا کلمہ پڑھتی رہتیں۔

ڈیڑھ ہفتے تک سب مہمان اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ لاڈلی بیگم واپس ہندوستان روانہ ہوئیں۔ شفیق الرحمان اور آمنہ بیگم ابوظہبی چلے گئے۔ گھر میں شادی کے ہنگامے اختتام پا چکے تھے۔ مہمانوں کے چلے جانے کے بعد نئے سرے سے گھر کی صفائی ستھرائی کی گئی۔ عبید اور نازنین کے لیے گھر کی بالائی منزل پر کمرا دیا گیا تھا۔ اول دن سے نازنین کا معمول یہی رکھا گیا تھا کہ نندوں میں سے کوئی ایک اسے اپنے ساتھ نیچے لے کر آتا اور پھر سہ پہر تک وہ نیچے ہی رہا کرتی تھی۔

آج دو ہفتے کے بعد عبید فیکٹری جا رہے تھے۔ قدسیہ اس کے لیے ناشتا بنا رہی تھی کہ صبیحہ بیگم کچن میں آئیں۔ قدسیہ کو عبید کے لیے ناشتا بناتے دیکھا تو بہت غصہ آیا۔

جب میز پر ناشتے کے انتظار میں بیٹھے اخبار پڑھتے عبید کے پاس آئیں تو خود پر کسی حد تک قابو پا چکی تھیں۔ دلار سے ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"بیٹا دلہن نیچے نہیں آئیں۔ طبیعت ٹھیک ہے اس کی؟" انتہائی محبت سے پوچھے گئے سوال پر عبید تھوڑا شرمندہ ہوئے۔

"مجھے اسے جگانے کا خیال نہیں آیا تھا امی بیگم! ابھی بلا لاتا ہوں۔" وہ کرسی سے اٹھنے لگے تو صبیحہ نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا۔

"رہنے دو... ویسے تو انہیں خود ہی آجانا چاہیے تھا۔" پھر انہوں نے میز پر ناشتے کی پلیٹیں رکھتی کمسن ملازمہ چھمو سے کہا۔

"تم جاؤ اور چھوٹی بھابھی کو نیچے بلا لاؤ۔"

عبید نے اخبار چھوڑ کر ناشتا شروع کر دیا۔

کچھ دیر بعد چھمو اکیلی ہی نیچے واپس آگئی۔ صبیحہ نے دیکھتے ہی سوال کیا۔

"کیا ہوا؟ نازنین کو ساتھ نہیں لائیں تم۔"

"امی بیگم! چھوٹی بھابھی کو بہت نیند آرہی ہے میں نے جگایا تو کہنے لگی۔ سونے دو پلیز، ایک تو رات کو تمہارے بھائی نہیں سونے دیتے اور اب تم جگا رہی ہو۔" چھمو بھولپن سے نازنین کے الفاظ بول گئی۔

عبید ماں کے سامنے نازنین کا جواب سن کر پانی پانی ہوگئے اور صبیحہ بیگم... انہوں نے فوراً" چھمو کو باورچی خانے میں جانے کا حکم دیا اور عبید سے کہا۔

"غلطی نازنین کی نہیں، تمہاری ہے۔ تم نے اسے بتایا نہیں کہ اس گھر کے طور طریقے کیا ہیں؟ فجر کے بعد تو اس گھر میں کوئی بھی بستر پر نہیں لیٹتا۔ ہم تو یوں چپ ہیں کہیں تم نہ سمجھو کہ خوامخواہ ہی تمہاری بیوی کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔"

"میں آج اس سے بات کروں گا۔" عبید ناشتا ختم کر کے اٹھنے لگے۔ صبیحہ بیگم اس کا ارادہ بھانپ کر جلدی سے بولیں۔

"ہاں ابھی تم فیکٹری جاؤ، اپنا کام دیکھو اس کے بعد بات ہوگی۔" سلام کرنے کے بعد گاڑی لے کر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

"نازنین! تم اگر مجھے خوش دیکھنا چاہتی ہو تو میرے گھر والوں کو خوش رکھو۔"

عبید کا یہ جملہ نازنین پر بہت کچھ واضح کر گیا۔ شادی کے بعد ویسے بھی کچھ عجیب و غریب قسم کے تجربات ہوئے چلے جا رہے تھے۔ جس نے کبھی اپنے علاوہ کسی کو اہمیت نہیں دی تھی۔ اس پر یکدم ہی پورے خاندان کی خوشنودی حاصل کرنے کی ذمہ داری ڈالی جا رہی تھی۔ اس کا ناز نخرہ نخرو غرور بس اس کے کمرے تک ہی محدود رہ گیا تھا۔ کیونکہ عبید اسے بے حد چاہتے تھے۔ وہ ہر شام اس کے لیے بج سنور کر تیار رہا کرتی اور وہ اسے لے کر گھومنے نکل جاتا تھا۔ کبھی سینما تو کبھی کسی ریسٹورنٹ میں شام گزرتی۔

شادی کے فوراً" بعد ناز کو ہنی مون پر جانے کی خواہش تھی۔ لیکن عبید نے اسے یوں سمجھایا کہ جاب میں تو چھٹی ملنا آسان ہوتا ہے۔ میں اپنے بزنس کو اتنے دنوں تک کس کے حوالے کر جاؤں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں، جہاں کہو گی لے کر جاؤں گا، بس کچھ دن ٹھہر جاؤ۔

ناز خوش دلی سے مان گئی۔ لیکن... صبیحہ بیگم سے بات کرنے کے بعد جب عبید نے نازنین کو ان کے پاس بھیجا اور انہوں نے صبح کا ناشتا اور دوپہر کا کھانا تیار کرنے کی ڈیوٹی اسے سونپنا چاہی تو وہ گھبرا گئی۔ اسے تو اپنا کالج دوبارہ جوائن کرنا تھا اور یہی بات جب اس نے اپنی ساس کے سامنے کہی تو وہ خوب تلملائیں اور اگلی صبح عبید میاں کی شامت آگئی۔

اور عبید ایک بار پھر نازنین کو سمجھانے بیٹھ گئے کہ امی بیگم کی خوشنودی حاصل کیے بغیر تمہارا کالج جوائن کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ اگر وہ اجازت نہیں دیں گی تو میں

مجبور ہوں۔ نازنین بادل نخواستہ اگلے دن صبح سویرے کچن میں پہنچ گئی۔

زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ یہ کام کروں گی، پھر صاف صاف کہہ دوں گی عبید سے کہ اپنا وعدہ پورا کریں، پہلے ہی میری پڑھائی کا اتنا حرج ہو چکا ہے۔" وہ سوچتی ہوئی ناشتا بنانے لگی۔

ایک دن پہلے ہی اس نے کھیر بنا کر کھلائی تھی سب کو۔۔۔ جو اس کے حساب سے تو ٹھیک ٹھاک تھی لیکن میز پر بیٹھے گھر کے تمام افراد ایک چمچہ کھاتے ہی کچھ چپ سے ہو گئے۔ چینی تھوڑی زیادہ ہے۔ دودھ سے گاڑھا نہیں کیا۔ میوہ باریک نہیں کترا، صحیح کھولی نہیں گئی۔۔۔ بظاہر قدسیہ، صبیحہ بیگم اور دادی بیگم کے آپس میں کیے جانے تبصرے کا ہدف اصل میں کون تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔

ابا میاں نے دو چمچے کھا کر اٹھتے ہوئے رسماً اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور انعام میں کچھ روپے بھی اس کے حوالے کیے لیکن ان کے رویے میں بھی وہ گرم جوشی مفقود تھی جس کی وہ توقع کر رہی تھی۔ بہت محنت کی تھی اس نے اور یہ سب لوگ کھا بھی رہے تھے اور برائی بھی کر رہے تھے۔ اپنے گھر میں ہوتی تو اب تک کھیر کا پیالہ اٹھا کر کھانے والوں کے سر پر انڈیل چکی ہوتی لیکن اب وہ میکے میں نہیں سسرال میں تھی۔ اپنی توہین کرنے والوں کا منہ توڑ دینا اتنا بھی آسان نہیں ہوتا اب اسے سمجھ میں آنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبیحہ بیگم کو اس کی ہر بات پر اعتراض ہوا کرتا تھا۔

"تڑکا نہیں بگھار کہا کیجیے۔"

"دوپٹا سر سے اترنا نہیں چاہیے۔"

"اتنا زیور پہن کر گھومنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"لباس باریک مت پہنا کریں۔"

"کھانے میں نمک زیادہ ہے۔"

"چائے زیادہ ابال دی آپ نے۔"

"میٹھو سے تو کہہ کر بات مت کیا کریں۔"

"دودھ والے سے ہنس ہنس کر بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"قدسیہ کنواری بچی ہے، اپنے لطیفوں کو اپنے تک ہی رکھیں۔"

"گھنگھرو والی پائل اتار دیجیے۔"

"روٹی کا کنارہ موٹا رہ جاتا ہے، صحیح سے بیلیں۔"

"سبزی کے چھلکے باریک کاٹیں۔"

"زور سے مت ہنسیں، آہستہ قدم اٹھائیں۔"

نازنین ہدایتیں سن سن کر پاگل ہوتی جا رہی تھی۔ ہر روز ایک نئی بات، وہ کیا کرتی کیا نہ کرتی۔ بظاہر آپ جناب کہہ کر تمیز سے بات کرتی ساس کے لہجے میں دانت پیسنے کی آواز واضح طور پر سنائی دیا کرتی تھی۔ اوپر سے ہر دم گلناز سے اس کا مقابلہ کیا جاتا۔ جس نے اس کی موجودگی میں خالہ کے پاس آنا جانا بھی ترک کر دیا تھا۔

ایک، دو بار شروع میں جب اس کے ہوتے ہوئے گلناز صبیحہ بیگم کے پاس آکر بیٹھی تو ان کی ذو معنی گفتگو سن کر بے حد گھبرائی۔ اس کی تعریف کرتے ہوئے نازنین کو اس کی مثالیں دیتے ہوئے بلاشبہ وہ اپنی بہو کو نیچا دکھا رہی تھیں اور گلناز کو یہ سب اچھا نہیں لگا تھا۔

نازنین جو فقط ایک ہفتے سے زیادہ سارے کام کرنے کا ہرگز ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ ایک مہینہ گزر جانے کے باوجود بھی ساس کے منہ سے تعریفی کلمات سننے کی حسرت لیے بیٹھی تھی۔ وہ تنگ آگئی اور اس نے عبید کو صاف الفاظ میں جتا دیا کہ اب وہ مزید نہیں رکے گی اور دو دن بعد ہر صورت اپنی پڑھائی دوبارہ شروع کرنے کالج جائے گی۔ عبید کے پاس اب اور کوئی بہانہ نہیں بچا تھا۔ انہوں نے ناز سے وعدہ کر لیا کہ اگلے دن امی بیگم سے اجازت ضرور حاصل کریں گے۔ لیکن ایسا ہو نہ سکا۔

اگلی صبح نازنین کی طبیعت تھوڑی خراب ہوئی۔ ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے عبدالرحمان کو باپ بننے کی خوش خبری دے دی۔ خوش تو نازنین بھی ہوئی تھی اور گھر والے بھی۔ ناز کے دوبارہ یاد دلانے پر عبید نے بھی

موقع غنیمت جانا اور صبیحہ بیگم سے نازنین کے دوبارہ پڑھائی شروع کرنے کی اجازت مانگی۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں عبید میاں! پہلا بچہ ہے، ہر طرح کی احتیاط لازم ہے۔ ارے ہم تو اپنی پیاری بہو کو ہرگز اپنی نظروں سے دور نہیں ہونے دیں گے۔ بس ہماری گود میں پوتا آجائے، پھر آپ جہاں چاہیں بھیج دیجیے گا انہیں۔"

ماں کی محبت دیکھ کر عبید آگے سے ایک لفظ بولنے کی ہمت نہ کر سکے اور ناز کو بھی منع کر دیا کہ وہ بھی کچھ نہ کہے۔ نازنین خاموش رہ گئی۔ لیکن۔۔۔ آخر کب تک چپ رہتی۔

☼ ☼ ☼

نازنین کی سالگرہ تھی۔ عبید نے ایک رات پہلے ہی گولڈ کے خوب صورت سے ٹاپس خرید کر پہلے امی بیگم کو دکھائے کہ ناز کو تحفتاً دینا چاہتا ہوں۔

"اچھے ہیں عبید میاں! بے حد خوب صورت ہیں، مگر ابھی سے دینے کی کیا ضرورت ہے؟ سونے کی چیز تو بیوی کو بچے کی پیدائش پر دی جائے گی۔ ایسے دو اور خرید لائیے گا۔ بھلے ہی ڈیزائن مختلف ہو، پر ہم وزن ہوں۔ آپ کے بچے کی پیدائش پر دونوں بہنوں کو بھی سونے کی چیز دی جائے گی کہ یہی رواج ہے۔"

عبید کچھ نہ کہہ سکے۔ اس گھر میں یہی طریقہ رائج تھا۔ جس کسی کو آپس میں تحفے تحائف دینا ہوتے وہ صبیحہ بیگم کے ذریعے دیا کرتا تھا۔ انہیں دکھائے بغیر ان سے پوچھے بغیر کچھ نہ ہوتا تھا اور وہی فیصلہ کیا کرتی تھیں کہ کیا دینا مناسب ہے اور کیا نہیں۔ عبید نازنین کی فرمائش پر ہی وہ گولڈ کے ٹاپس خرید کر لائے تھے لیکن اب دے نہیں سکتے تھے، کوئی بات نہیں، کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں ڈنر کراؤں گا اور کچھ شاپنگ بھی۔۔۔ وہ دل ہی دل میں ارادہ کرتے اپنے کمرے میں واپس آگئے۔

اگلی شام نازنین نے اپنا پسندیدہ سرخ رنگ کا لباس پہنا۔ ابھی تیسرا مہینہ چل رہا تھا۔ لیکن اسے ہیلز پہننے سے منع کر دیا گیا تھا۔ اس نے اسٹائلش سے بلیک سلیپرز نکال کر پہنے۔ وہ نہایت دل لگا کر تیار ہوئی اور عبید کا انتظار کرنے لگی۔ جس نے صبح اسے پھولوں کا بوکے دے کر وش کیا تھا اور رات کو اس کے پسندیدہ چائنیز ریسٹورنٹ میں ڈنر کرانے کا وعدہ بھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ کمرے کی کھڑکی سے لگ کر وہ عبید کا انتظار کر رہی تھی۔ جیسے ہی ان کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ وہ فوراً" اٹھی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر لپ اسٹک کا ایک اور کوٹ لگانے لگی۔

"مجھے خود ہی نیچے چلے جانا چاہیے۔"

اس نے سوچتے ہوئے جلدی سے اپنا کمرا بند کیا اور سنبھل کر سیڑھیاں اترنے لگی۔ سیڑھیوں کے آخر میں عبید۔۔۔ نظر آگئے۔ اسے یوں سجا سنوار دیکھ کر تو جیسے فدا ہی ہو گیا۔ وہ مسکرائی، آنکھوں ہی آنکھوں میں کیے گئے عبید کے محبت بھرے اشارے اسے گدگدا گئے تھے۔ قدسیہ دروازہ کھولنے کے بعد اب تک وہیں کھڑی تھی۔ شاید اسی لیے عبید نے کچھ کہنے کے بجائے صرف دیکھنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

"میں امی بیگم کو بتا کر آتا ہوں۔" عبید نے ہاتھ میں پکڑی گاڑی کی چابی کو انگلی پر گھماتے ہوئے کہا اور قدسیہ کے سر پر ہلکی سی چپت لگا کر صبیحہ بیگم کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

نازنین ساس کے کمرے کی جانب بڑھی۔ "اتنی دیر لگا دی عبید نے۔ ماں کے گھٹنے پکڑ کر بیٹھنے کا بڑا شوق ہے۔ سیدھے جاتے اور بتا کر باہر آجاتے۔ وہ جز بز ہوتی کمرے کے نزدیک پہنچی اور دروازے پر ہی رک گئی۔

"نہیں عبید میاں! آج رات ہم نازنین کو گھر تو کیا کمرے سے بھی باہر نکلنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ ان سے کہیے اپنے بستر پر پاؤں سیدھے کر کے آرام سے لیٹ جائیں۔ بالکل بھی اٹھنے کی ضرورت نہیں۔ آج رات چاند گرہن ہو گا۔ جو عورتیں امید سے ہوں انہیں احتیاط کرنی پڑتی ہے۔"

"لیکن امی بیگم! چاند گرہن تو سات بجے ہی

ختم۔" عبید کی منمناتی آواز میں کیا جانے والا بے ضرر سا احتجاج مطیع الرحمان کو بے حد گراں گزرا۔

"بحث مت کیجیے عبید میاں! جیسے آپ کی والدہ کہہ رہی ہیں۔ ویسا ہی کیجیے۔" انہوں نے عبید کی بات کاٹ دی اور انہیں مزید کچھ بھی کہنے سے منع کردیا۔

ناز نے تھوڑا اور آگے ہو کر کمرے میں جھانکا۔ اس کے ساس، سسر اپنی مسہری پر براجمان تھے۔ مطیع الرحمان تو کسی کتاب کو ہاتھ میں لیے بیٹھے تھے۔ جبکہ صبیحہ بیگم اپنے سامنے بیٹھے عبید سے مخاطب تھیں۔

"ان کی سالگرہ منانے کو اتنا ہی دل چاہ رہا ہے تو تم جاؤ اور بازار سے کیک اور سیخ کباب لے آؤ۔ قدسیہ بھی خوش ہو رہی تھی کہ بھابھی کی سالگرہ ہے۔ بھائی ضرور ہمیں دعوت دیں گے لیکن تم شادی کے بعد اس بہن کو بالکل ہی بھول گئے ہو، جو تمہیں ہنستا دیکھ کر تمہاری نظر اتارنے لگ جاتی ہے۔ کچھ اس کے دل کا بھی خیال کرو۔ تم دونوں میاں، بیوی اکیلے گھومنے جاتے ہو ہم تو خیر بوڑھے ہو رہے ہیں۔ ہمیں تم نہ بھی پوچھو تو برا نہیں مانیں گے، حالانکہ تمہارا فرض بنتا ہے کہ کسی طور اپنے ماں، باپ، دادی بیگم اور چھوٹی بہن کی دل آزاری نہ ہونے دو۔ کتنے دن گزر گئے تم نے اپنی صالحہ خالہ کی شکل نہیں دیکھی۔ گلناز کا حال نہیں پوچھا۔ ٹیپو کی خیر خیریت معلوم نہیں کی۔ اے میاں! میں پوچھتی ہوں شادی ہو کر وہ یہاں آئی ہیں یا تم بیاہ کر ان کے یہاں چلے گئے۔ جو اپنے پیاروں کو یوں فراموش کردیا، جواب دو۔"

اور عبید الرحمان کی زبان پر تالا تو والد صاحب کی گھوریاں ڈال ہی چکی تھیں۔ امی بیگم بے کار ہی بات کو طول دیے جا رہی تھیں نازنین یہ سب دیکھ کر واپس پلٹ گئی۔ عبید خاموش کیوں تھا؟ یہ ادب تھا، لحاظ تھا، مصلحت تھی یا فرماں برداری؟ ناز کو اس سے ہرگز مطلب نہیں تھا۔ غرض تھی تو بس اتنی کہ عبید اس سے کیے وعدے نبھانے میں مسلسل ناکام ہو رہا تھا۔ اگر وہ اتنا ہی بے اختیار تھا تو شادی سے پہلے ایسے دعوے نہ کیے ہوتے۔ وہ کون سا اس کے عشق میں مری جا رہی تھی۔

غصے میں کھولتی وہ اپنے کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی لیکن عبید ایک گھنٹہ گزرنے کے باوجود ابھی تک اوپر نہیں آیا تھا۔ وہ قدسیہ کو اپنے ساتھ کہیں لے کر گیا تھا۔ جب واپس آیا تو اسے بلانے کے لیے کمرے میں آئے۔ نازنین کپڑے تبدیل کرچکی تھی اور میک اپ بھی صاف کرلیا تھا۔

"چلو نازنین! نیچے سب گھر والے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ میں کیک اور سیخ کباب وغیرہ لایا ہوں۔ تمہارا برتھ ڈے سلیبریٹ کرتے ہیں۔ چلو۔"

"تنگ آگئی ہوں میں آپ کے گھر والوں کے ڈراموں سے۔ یہ لوگ مجھے کبھی خوش نہیں دیکھ سکتے۔ ہمیشہ میری ہر خواہش کے آگے دیوار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور آپ ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر ناچ رہے ہیں۔ کیسے مرد ہیں آپ؟"

یہ پہلا موقع تھا کہ عبید، نازنین کا اصل روپ دیکھ رہا تھا۔ وہ نخریلی تھی، مغرور تھی، یہ تو معلوم تھا، لیکن اس درجہ بدتمیز بھی ہے یہ آج معلوم ہو رہا تھا۔

"یہ تم کس لہجے میں بات کر رہی ہو مجھ سے، اور آہستہ بولو نیچے آواز پہنچ رہی ہوگی۔ کیوں تماشا بنا رہی ہو۔"

"بناؤں گی میں تماشا۔ ضرور بناؤں گی۔ تنگ آگئی ہوں میں دن رات سب کی خدمتیں کر کر کے۔ یہ کرو، یہ نہ کرو، یہ پہنو، یہ نہ پہنو، ایسے بولو، ایسے اٹھو، یہ کھاؤ، وہ مت کھاؤ، کیا مصیبت ہے۔ کان پک گئے ہیں میرے یہ بکواس سن سن کر۔ سب کچھ ان کی مرضی کا کرتے رہو، تب بھی یہ لوگ خوش نہیں ہوتے۔ کتنی کوشش کی ہے میں نے سب کا دل جیتنے کی اور یہاں کسی کو میری قدر نہیں ہے۔ ہر وقت مجھ میں کیڑے نکالتے رہتے ہیں۔ اور آپ کی ماں۔"

"بس ایک لفظ مت کہنا اور۔ نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ تمہیں مجھ پر غصہ ہے تو صرف مجھ تک محدود رہو۔ میری ماں کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" عبید مزید کچھ نہیں سن سکتا تھا۔ اس نے غصے میں نازنین کا بازو کھینچتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہ کہوں۔ سارا فساد ہی اس بڑھیا کا پھیلایا ہوا ہے۔" نازنین بھی آسانی سے چپ ہو جانے والوں میں سے نہیں تھی۔

"میں کہتا ہوں چپ ہو جاؤ، خاموش ہو جاؤ۔" عبید نے نازنین کو غصے میں زور سے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر صوفے پر گر گئی۔ عبید کمرے سے باہر نکل گیا کچھ منٹوں بعد ناز نے اس کی گاڑی کی آواز سنی۔ کھڑکی کے پاس آکر اس نے دیکھا تو عبید اپنی گاڑی نکال کر لے جا رہا تھا۔ اس رات یہ ان کا پہلا جھگڑا تھا۔

پہلا جھگڑا، پہلی لڑائی، پہلا اختلاف دونوں میاں، بیوی کبھی نہیں بھولتے لیکن ناز اور عبید جلد اس لڑائی کو بھول گئے۔ اس لیے نہیں کہ ان دونوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور ایک دوسرے کو معاف کر کے وہ پھر سے شیر و شکر ہو گئے تھے۔ اس لیے بھی نہیں کہ وہ ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے اور محبت میں ایسی لڑائیاں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ بلکہ اس لیے کہ ــــ اس کے بعد تو ان کی ہر بات پر ہی لڑائی ہونے لگی تھی۔

دوسری لڑائی اس سے اگلے ہی دن ہو گئی تھی۔ نازنین اپنے طور پر عبید سے ناراضی میں خود کو حق بجانب سمجھ رہی تھی اور عبید اپنے آپ کو۔ دونوں کو انتظار تھا کہ منانے میں دوسرا پہل کرے۔ اگلی رات عبید نے فیکٹری سے واپس آکر ناز سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ ان کی خاموشی ان کی خفگی کا اظہار تھی۔

وہ کھانا کھا کر اوپر کمرے میں آئے، کپڑے تبدیل کیے اور پھر اپنی گاڑی لے کر باہر نکل گئے۔ پھر واپسی رات ڈیڑھ بجے کے قریب ہوئی۔ نازنین ان کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ اس نے ناز کو صوفے پر بیٹھے دیکھا مگر اسے مخاطب کیے بغیر باتھ روم میں لباس تبدیل کرنے چلے گئے۔ پھر آکر اپنے بستر پر لیٹا اور لحاف کو سر تک اوڑھ لیا۔ نازنین پہلے یوں ہی بیٹھی رہی، پھر ایک جھٹکے سے اٹھی اور عبید کے اوپر سے لحاف کھینچ کر اتار کے زمین پر پھینک دیا۔

عبید اس کی جرأت پر حیران پریشان سا ہو کر اٹھ بیٹھے۔ انہوں نے کب ایسی حرکتیں دیکھی تھیں۔ "کیا بدتمیزی ہے؟"

غصے میں لال پیلی نازنین لحاف پھینک کر اسے کینہ توز نظروں سے گھور رہی تھی۔ "کہاں گئے تھے؟"

اس کا لہجہ بے حد سخت اور بے لحاظ تھا۔ عبید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ناز اب کی بار ذرا زور سے چلا کر بولی۔

"میں پوچھ رہی ہوں کہاں چلے گئے تھے؟" عبید تیزی سے بیڈ سے نیچے اترے اور اس کے مقابل کھڑے ہوئے۔ "دیکھو نازنین! اس گھر میں ایسی چیخم دھاڑ کبھی نہیں ہوئی، تمہیں جو بات کرنی ہے آرام سے کرو۔ میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔"

انہوں نے خود پر ضبط کرتے ہوئے دبی آواز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"نہیں کروں گی میں آرام سے بات۔" وہ اور زور سے چیخی۔ "مجھے میرے سوال کا جواب چاہیے، بولیں، کہاں رات گزار کر آ رہے ہیں۔ عیاشی کرنے گئے تھے نا، بولیں جواب دیں۔"

اور عبید کا ہاتھ اس تیزی سے گھوما تھا کہ نازنین کو اپنا جبڑا ٹوٹتا محسوس ہوا۔

"ہاں گیا تھا میں عیاشی کرنے اور اب ہر رات جایا کروں گا اور کان کھول کر سن لو! آئندہ اگر تم نے مجھ سے اس لہجے میں بات کی یا حلق سے اونچی آواز نکالی تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔"

نازنین تکلیف کی شدت سے اپنے گال پہ ہاتھ رکھے رو پڑی۔ عبید نے اسے روتا چھوڑ کر زمین پر گرا لحاف اٹھایا اور دوبارہ اوڑھ کر بستر پر لیٹ گئے۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن صبح الماری کے بار بار کھلنے اور بند ہونے کی آواز نے عبید کو بیدار کیا۔ آنکھ کھلنے کے کچھ لمحوں تک تو کچھ سمجھ ہی نہ آیا کہ یہ شور کیسا ہے؟ پھر انہوں نے لحاف سرکا کر ذرا سی گردن اٹھائی تو سامنے

ہی نازنین الماری سے کپڑے نکال کر سوٹ کیس میں رکھتی دکھائی دی۔ اس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں اور یہ بھی یاد آگیا کہ رات کو کیا ہوا تھا۔ فوراً" اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"یہ کیا کررہی ہو؟" وہ بستر سے نکل کر اس کے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔

اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ "اتنی سی بات پر گھر چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟"

نازنین نے نہایت غصے سے اسے دیکھا۔ معافی تلافی شرمندگی' کچھ بھی نہیں' الٹا اس سے کہا جارہا تھا کہ اتنی سی بات پر گھر چھوڑ کر جانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس نے اپنا ہاتھ جھٹک کر اس کی گرفت سے آزاد کیا۔

"اتنی سی بات ہے تو اٹھ کر کیوں آگئے ہیں؟ جائیں جاکر سو جائیں۔"

اس کا لہجہ اس کے موڈ کی طرح بے حد خراب تھا۔ عبید ایک گہری سانس لے کر رہ گئے۔ رات کو بھی ناز کی بدتمیزی نے اسے غصہ نہ دلایا ہوتا تو وہ کبھی اس پر ہاتھ نہ اٹھاتے اور اتنی سخت تنبیہہ کے باوجود وہ ان سے دوبارہ اسی لہجے میں بات کررہی تھی۔

"دیکھو ناز! تم ذرا تمیز سے بات کیا کرو' مجھے اس لہجے کی عادت نہیں ہے۔ ہم نے کبھی اپنے گھر میں عورتوں کی اونچی آواز نہیں سنی۔"

ناز نے ہاتھ میں پکڑی ساڑھی گول مول کرکے زمین پر پھینک دی۔ "مجھے بھی عادت نہیں ہے ایسے سلوک کی جو آپ اور آپ کے گھر والے میرے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ کبھی میری ماں کی ہمت نہیں ہوئی کہ مجھے کسی کام پر ٹوک سکے اور یہاں دن رات چوبیس گھنٹوں کے ایک ایک لمحے میں آپ کی ماں کی چخ چخ برداشت کرتی ہوں۔ اپنے گھر میں کبھی کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا اور یہاں گدھوں کی طرح کام کروایا جاتا ہے مجھ سے۔ کھانا تیار ہونے میں پانچ منٹ کی دیر ہوجائے تو امی بیگم آسمان سر پر اٹھالیتی ہیں۔ اوپر سے آپ کے کان الگ بھرے جاتے ہیں ہروقت میری برائیاں کرکرکے۔ آپ کے دل میں میری محبت کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں سب لوگ۔۔۔ اور آپ کاٹھ کے الو بن کر سب سن رہے ہیں۔ مان رہے ہیں' مجھے نہیں رہنا آپ کے ساتھ۔ میں جارہی ہوں یہاں سے۔"

"مت جاؤ ناز۔۔۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔ میں امی بیگم سے بات کروں گا۔ قدسیہ کو بھی سمجھادوں گا' کوئی تمہیں تنگ نہیں کرے گا۔ پلیز تم یہاں بیٹھ جاؤ۔" وہ ناز کو زبردستی پکڑ کر صوفے پر بٹھاتے ہوئے اس کے پاس زمین پر وہیں بیٹھ گئے۔

"نازنین! دیکھو۔۔۔ ہم جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتے ہیں۔ بھائی جان کے جانے کے بعد ساری ذمہ داری مجھ پر آتی ہے۔ مجھے سب کی سننی ہے۔ سب کو خوش رکھنا ہے۔ یہ میری مجبوری بھی ہے اور میرا فرض بھی۔ بیٹا ہوں میں اس گھر کا۔ اگر میرے ماں' باپ کو میری بیوی سے کوئی شکایت ہوگی تو ہر الزام میری ذات پر ہی آئے گا نا کہ میں نے اسے کنٹرول نہیں کیا۔"

"میں کوئی گائے یا بکری نہیں ہوں' جسے ہانک کر کھونٹے سے باندھ دیں گے آپ۔ بیوی ہوں آپ کی۔ میرے بھی حقوق ہیں۔"

"صرف بیوی نہیں محبوبہ بھی ہو۔" عبید اس کے غصہ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنی چاہت کا اظہار کرنے لگے۔ "بہت محبت کرتا ہوں میں تم سے۔"

"ہاں بہت زیادہ۔" ناز نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اسی لیے رات کو میرے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔" اپنی بات مکمل کرتے ہوئے اس کا گلا رندھ گیا اور عبید کو پچھتاوے نے گھیر لیا۔ کندھے جھکا کر انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ پھر نرم لہجے میں اس سے پوچھا۔

"اچھا بتاؤ کیا چاہتی ہو؟ کیسے ختم ہوگا یہ جھگڑا؟ مجھ سے غلطی ہوئی۔ مجھے آرام سے بات کرنا چاہیے تھی۔ تم پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ آئی ایم سوری اب مان جاؤ نا۔"

ناز نے سر جھٹک کر دوسری طرف دیکھنا شروع کردیا لیکن اب اس کے انداز میں وہ پہلے جیسی تیزی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ عبید اس کی خفگی کا یہ انداز دیکھ کر مسکرادیے۔

"اچھا چلو' میں نے غلطی کی۔ سزا بھی مجھے ہی ملے گی۔ آج شام کو جلدی گھر آکر تمہیں ساتھ ڈنر کراؤں گا اور پھر۔ ہم کبنی جیولرز کے پاس جائیں گے۔"

ناز نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا۔ "پھر سے وعدہ خلافی تو نہیں کریں گے۔" عبید نے معصومانہ انداز میں فوراً" نفی میں سرہلاتے ہوئے اپنے وعدہ کی سچائی کا یقین دلایا۔ ناز تھوڑا سا مسکرائی۔

"اور آئندہ۔ مجھ پر ہاتھ اٹھائیں گے۔" عبید نے فوراً" کان پکڑلیے۔

"ہرگز نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔۔۔ تمہاری قسم۔۔۔ اب کبھی نہیں لڑوں گا۔" ناز کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

مرد کا ہاتھ ایک بار اٹھ جائے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی۔ عبید نے اگر صرف اپنی غلطی سمجھ کر یہ وعدہ کیا ہوتا تو شاید نباہ ہوجاتا' ان کا خیال تو یہ تھا کہ ناز کی بدلحاظی نے انہیں ہاتھ اٹھانے پر مجبور کیا تھا۔ حقیقت بھی یہی تھی۔

لیکن صرف چند ہی مہینوں بعد پھر ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ۔۔۔ عبید نے نازنین پر ہاتھ اٹھایا اور پھر۔۔۔ مارتے ہی چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

"اٹلانٹے (Atlantai) دیوی آرٹیمیس کی چہیتی' آرکیڈین شکاری تھی۔ جسے اس کا باپ گھنے جنگل میں مرنے کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ وہاں اس کی پرورش ایک مادہ ریچھ نے کی۔ جس کا اپنا بچہ شکاریوں کے ہاتھوں ہلاک ہوچکا تھا۔ اس مادہ ریچھ کا پیچھا کرتے شکاری چند ماہ بعد اس کے غار تک پہنچے تو وہاں اس شیرخوار بچی کو زندہ سلامت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہوں نے اٹلانٹے کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اسے بیٹی بنا کر پالا۔ وہ بڑی ہوئی تو شکاریوں نے اسے اپنے گروہ میں شامل کرلیا اور اس کی تربیت شروع کردی۔

اپنے شکاری ٹولہ کے ساتھ اس نے کیلیڈونین بور کو تلاش کرکے مارنے کی مہم میں حصہ لیا اور اس جنگلی سور کو مارنے کے بعد اس کی کھال انعام کے طور پر حاصل کی۔ یوں اس کی شہرت شہنشاہ تک جا پہنچی' جو اس کا باپ تھا اور اب نہایت فخر سے اسے اپنی بیٹی تسلیم کرنا چاہتا تھا۔ اسی غرض سے وہ اٹلانٹے کو زبردستی اپنے ساتھ محل میں واپس لے آیا۔

اٹلانٹے جنگل کی آزاد فضا میں پلی بڑھی تھی۔ اسے محل کی پابندیاں اداس کرنے لگیں۔ شہنشاہ آئیوسیس نے اس کی شادی کا ارادہ کیا تو اٹیلانٹے نے عجیب و غریب شرط پیش کرکے باپ کو حیران کردیا۔

اس نے مطالبہ کیا کہ اس سے شادی کا خواہش مند ہر امیدوار اس سے فرداً" فرداً" ریس میں مقابلہ کرے' جو اسے ہرانے میں کامیاب ہوا۔ وہ اسی سے شادی کرے گی۔ ورنہ اسے قتل کردے گی۔ اٹلانٹے کو ریس میں ہرانا ناممکن تھا۔ کیونکہ وہ بہت تیز رفتار تھی۔ شہنشاہ آئیوسیس کے پاس سوائے اس شرط کو تسلیم کرنے کے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ مقابلہ شروع ہوا اور چند دنوں میں بہت سے نوجوان اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اٹلانٹے پہلے انہیں ریس میں ہراتی' پھر موت کے گھاٹ اتار دیتی۔ اس خون ریز مقابلے نے بہت سے نوجوانوں کو اس ارادے سے دستبردار کردیا اور وہ پیچھے ہٹتے گئے۔

میلانیون' اٹلانٹے کو دیکھتے ہی اس کی محبت میں گرفتار ہوگیا تھا۔ وہ خود بھی ایک خوبرو نوجوان تھا اور اٹلانٹے کے حسن نے گویا اسے مبہوت کردیا تھا۔ وہ دیوی Aphrodites کے پاس مدد کی درخواست لے کر پہنچا تو دیوی نے اسے تین سونے کے سیب مرحمت فرمائے اور ریس میں کامیابی کا گر بھی سمجھادیا۔

ریس شروع ہوئی۔ ہمیشہ کی طرح اٹلانٹے اس بار بھی اپنے مقابل سے چند لمحوں میں آگے نکل گئی تھی کہ اچانک اسے اپنے سامنے سونے کا سیب زمین پر لڑھکتا نظر آیا۔ اٹلانٹے عورت تھی' سونے کا سیب دیکھ کر خود پر قابو نہ رکھ سکی اور رک کر اسے اٹھالیا۔

اسی دوران میلانیون اس سے آگے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

مگر بہت جلد اٹلانٹے دوبارہ اسے پیچھے چھوڑ گئی۔ وہ میلانیون سے دو قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ اس نے پھر ایک سیب اچھال دیا جسے اٹھانے کے لیے وہ جھکی اور میلانیون آگے بڑھ گیا۔

اب وہ دونوں اختتام کے قریب تھے۔ تماشائیوں کو نظر آرہا تھا کہ اٹلانٹے ایک بار پھر میلانیون کو پیچھے چھوڑ جائے گی کہ اس نے آخری سیب بھی اچھال دیا۔ مگر اس بار اٹلانٹے کو وہ سونے کا سیب اٹھانا بہت مہنگا پڑ گیا تھا۔

وہ ریس ہار گئی تھی۔ اس کے بعد ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ میلانیون بہت خوش تھا کہ آسمانی دیوی دیوتاؤں نے کسی بات سے ناراض ہو کر دونوں میاں، بیوی کو انسان سے جنگلی شیروں میں تبدیل کر دیا۔ آخری سانس تک وہ دونوں معبد خانے میں قید ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہے۔ خون پیتے نوچتے جھنجوڑتے رہے۔ یہاں تک کہ ختم ہو گئے۔"

ایک گہری سانس لے کر عبید الرحمان نے یونانی میتھالوجی کی کتاب بند کی اور ساتھ لیٹی نازنین کی طرف دیکھا۔ وہ اکثر رات کو سونے سے قبل کوئی کتاب پڑھا کرتے تھے۔ آج ناز جلدی سو گئی تھی اور انہوں نے نازنین کی شیلف سے یہ کتاب نکال لی تھی۔ جسے پڑھنے کے بعد جانے کیوں عبید کو محسوس ہوا جیسے ناز اٹلانٹے ہو اور وہ میلانیون ہو۔ نہ جانے کیوں؟

نازنین کا جسم قدرے بے ڈول ہوتا جا رہا تھا۔ پانچویں مہینے کا آغاز ہوتے ہی اس کی بہت سی مشکلات میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ بار بار سیڑھیاں اترنا چڑھنا ایک عذاب لگنے لگا تھا۔ اس نے عبید سے کہہ کر اپنی ذمہ داریوں میں تخفیف چاہی، جو صبیحہ بیگم کی اجازت کے بغیر ممکن نہیں تھی۔

"عبید میاں! آپ مرد ہیں، ان معاملات کو نہیں سمجھ سکتے۔ نازنین بھی پہلی دفعہ ماں بننے جا رہی ہیں، انہیں کیا خبر؟ ایسی حالت میں چلتے پھرتے رہنا چاہیے۔ ماں اور بچہ دونوں صحت مند رہتے ہیں۔ آپ نازنین کو سمجھائیے اور زیادہ مشکل ہو تو ان سے کہیے دوپہر میں اوپر نہ جایا کریں، یہاں قدسیہ کے کمرے میں آرام کر لیا کریں۔ رات کا کھانا کھا کر اوپر چلی جائیں آپ کے ساتھ۔" صبیحہ بیگم نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور بات ختم ہو گئی۔

نازنین کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ اسے کچھ وقت اکیلے گزارنا تھا۔ سکون و اطمینان سے۔ صبح ناشتا بنانے کے بعد وہ دوپہر کے کھانے کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتی تھی۔ قدسیہ اور گلناز دونوں کالج جاتی تھیں۔ سب کام اسے اکیلے ہی کرنا پڑتے تھے۔

کالج سے واپس آکر قدسیہ کھانا کھانے کے بعد برتن سمیٹنے میں اس کی مدد کرواتی تھی لیکن ساتھ ساتھ ذو معنی طنزیہ گفتگو کا سلسلہ بھی چلتا رہتا تھا۔ صبیحہ بیگم نے کبھی اپنی بیٹی کو نہیں ٹوکا۔ بلکہ اکثر اوقات وہ دونوں ماں، بیٹی بظاہر آپس میں باتیں کرتی اسے باتیں سناتی رہتی تھیں۔ گلناز کا رویہ قدرے بہتر تھا لیکن نازنین اس سے سخت بدگمان تھی۔ لاڈلی بیگم کے الفاظ اسے ابھی تک یاد تھے۔ اس کی ساری اچھائی ناز کو ڈھونگ محسوس ہوتی تھی۔ جسے وہ عبید کو خوش کرنے کے لیے رچا رہی تھی۔

ایک شام صبیحہ بیگم اور قدسیہ کسی کام سے بازار گئی ہوئی تھیں۔ عبید کے گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے باہر کھانے کی فرمائش کر دی۔ ابھی عبید نے کچھ جواب نہیں دیا تھا کہ ٹیپو بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا۔

"آج باجی نے مسالہ بھری بھنڈیاں اور روغنی روٹی بنائی ہے عبید بھائی! آپ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔"

"اچھا کھانا لگواؤ۔ میں ابھی کپڑے تبدیل کر کے آتا ہوں۔" وہ ناز کو وہیں کھڑا چھوڑ کر اوپر چلے گئے۔ ناز نے خشمگیں نگاہوں سے سامنے کھڑے ٹیپو کی طرف دیکھا تو وہ گھبرا کر وہاں سے ہٹ گیا۔ کچھ دیر ٹہلنے کے بعد وہ بھی اوپر گلناز کے پورشن میں چلی آئی۔

"واہ بھئی، مزا آگیا۔" عبید نے ہشاش بشاش لہجے

میں گرما گرم روٹی سامنے لا کر رکھتی گلناز کی محنت کو سراہا۔ جسے سن کر گلناز کے چہرے پر مسکان آئی تھی۔ وہیں نازنین کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ لیکن خاموش رہنا اس کی مجبوری بن چکا تھا۔

شادی سے پہلے عبید کی والہانہ محبت کے اظہار نے اسے جس غلط فہمی میں مبتلا کیا تھا کہ وہ زندگی بھر ان کے دل اور گھر پر راج کرنے والی ہے۔ وہ اب دور ہو چکی تھی۔ اپنے طور پر وہ ناز کی ناز برداری کیا کرتے تھے مگر ان کی ہر بات (امی بیگم نہیں مانیں گی۔ ابا میاں سے پوچھنا پڑے گا) سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتی۔ ناز کے لیے یہ سب کچھ ناقابل قبول تھا۔

عبید پورے خاندان کے بارے میں پہلے سوچتے تھے۔ پھر اس کی باری آتی تھی۔ کوئی نیا سوٹ خریدنے لگتی تو قدسیہ اور گلناز کے لیے بھی لینا پڑتا۔ اس نے کبھی اپنی بہنوں سے شراکت داری نہیں رکھی تھی اور یہاں اس کی ہر ذاتی چیز عبید کے گھر والوں کی نظر میں بھی تھی اور استعمال میں بھی۔

عبید اب بھی اکثر راتوں کو دیر تک گھر سے باہر رہا کرتے تھے۔ اپنے دوستوں کے ساتھ۔ ہاں اتنا کرم ضرور کیا تھا انہوں نے کہ ناز کی فرمائش پر کمرے میں ٹی وی لا کر رکھ دیا تھا مگر وہ ٹی وی سے بھی کب تک جی بہلاتی۔ اس نے دوبارہ پینٹنگ اور اسکیچنگ شروع کر دی۔ کچھ ادھورے پروجیکٹس وہ اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ انہیں بنانا شروع کیا تو وقت آسانی سے کٹنے لگا۔

"یہ تو بہت خوب صورت پینٹنگ بنائی ہے تم نے۔"

عبید نے ایک دن اس کی واٹر کلر پینٹنگ کو دیکھ کر تعریف کی۔ ابھی ناز اپنی تعریف پر جی بھر کے خوش بھی نہیں ہو پائی تھی کہ عبید کے اگلے جملے نے اسے سلگا کر رکھ دیا۔ اس نے کہا۔ "میں اسے فریم کروا کر امی بیگم کے کمرے میں لگوا دیتا ہوں۔"

نازنین نے جھپٹ کر اپنی پینٹنگ ان کے ہاتھ سے چھین لی۔ "کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ پینٹنگ میں کسی کو نہیں دوں گی، یہ میں نے اپنے گھر کے لیے بنائی ہے۔"

"اپنا گھر؟" باوجود ناز کی بدتمیزی کے عبید نے نرمی سے پوچھا تھا۔

"ہاں۔۔۔ میرا اپنا گھر۔" اس نے اطمینان سے اپنی پینٹنگ رول کرتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ تمہارا ہی گھر ہے۔ تو۔۔۔ نیا بنا کر کیا کرو گی؟"

"کیا مطلب ہے آپ کا۔ ہم کیا ساری عمر اس ایک کمرے میں گزاریں گے؟ اپنی اولاد کو اس چھوٹے سے کمرے میں زمین پر سلائیں گے کیا؟"

"لیکن میں اپنے ماں، باپ کو چھوڑ نہیں سکتا۔ بھائی جان بھی یہاں نہیں ہیں۔ ہم یہیں رہیں گے ان کے پاس۔" نازنین کے خیالات جان کر عبید نے مناسب سمجھا کہ دو ٹوک الفاظ میں ابھی سے واضح کر دیں کہ اسے الگ گھر دلانا ممکن نہیں ہے۔ "اور جہاں تک اولاد کو زمین پر سلانے کا سوال ہے، ایسا نہیں ہو گا، یہ کمرا اتنا بھی چھوٹا نہیں ہے۔ ہم وہاں کونے میں اس کے لیے بیڈ اور ایک چھوٹی الماری رکھ سکتے ہیں، تم فکر نہ کرو۔"

"پھر بھی۔۔۔ میں یہ پینٹنگ کسی کو نہیں دوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ کسی کو مت دینا۔" عبید کے لیے یہی بہت تھا کہ ناز نے ان کا فیصلہ چپ چاپ مان لیا تھا۔ آگے سے کوئی بحث نہیں کی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آپ چوہیا کی طرح بچے دینا چاہتی ہیں۔"

ناز آنکھیں پھاڑ کر قدسیہ کو دیکھنے لگی۔ محسنہ اور تابندہ اسپتال میں اسے دیکھنے آئی تھیں۔ قدسیہ وہیں موجود تھی۔ جب محسنہ نے بیٹی کو پیار سے گلے لگا کر اس کا حال چال پوچھا تو عادتاً ناز نے اپنے درد کی لمبی چوڑی تفصیل سنا کر آخر میں کہا۔

"ابھی تو پہلا بچہ ہے۔ میری یہ حالت ہو گئی ہے۔ کتنا اچھا ہو اگر سارے بچے ایک ساتھ پیدا ہو جایا کریں، ایک ہی دفعہ میں جان چھوٹ جائے۔" اور

اس سے پہلے کہ محسنہ بیٹی کی ہمت بندھاتیں، قدسیہ نے طنز کا تیر چلا کر بھونڈی سی ہنسی ہنسنا شروع کردیا۔

"میں تم سے بات نہیں کررہی تھی۔ تم بھی اپنا منہ بند رکھو۔" ناز نے ساس کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر اسے ڈپٹ دیا۔

"ہونہہ۔" قدسیہ سر جھٹک کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

"ہر وقت میرا خون جلاتی رہتی ہیں دونوں ماں بیٹی۔ جان مصیبت میں کرکے رکھ دی ہے۔"

"تو دھیان نہ دیا کر چھوڑ، جانے دے۔"

"کیا، کیا چھوڑوں؟ ابھی صبح عبید کے ماں، باپ آئے، بچے کا نام رکھا، اذان دی، گھٹی پلائی اور چلتے بنے۔ میرا حال تک نہیں پوچھا۔"

"اچھا کیا نام رکھا ہے بیٹے کا؟" تابندہ خالہ بننے کی خوشی میں دوڑی دوڑی آئی تھی۔ نام جاننے کو بے چین ہوگئی۔

"شاہ زیب۔" بیٹے کا ذکر کرتے ہوئے بے اختیار اس کا چہرہ ممتا کے نور سے جگمگا اٹھا۔

☼ ☼ ☼

صبیحہ بیگم سمجھ رہی تھیں کہ اولاد ہوجانے کے بعد نازنین خود ہی تعلیم مکمل کرنے کا خیال دل سے نکال دے گی۔ مگر ان کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ اپنے سوا مہینے کے اختتام تک وہ عبید کو سیکڑوں بار ان کا وعدہ یاد دلانے کے ساتھ کئی بار جتا چکی تھی کہ اسے ہر حال میں اپنا تعلیمی سلسلہ وہیں سے شروع کرنا ہے، جہاں سے منقطع کیا تھا۔

عبید نے یہ صورت حال صبیحہ بیگم کے گوش گزار کی تو وہ کچھ دیر کو چپ سی ہوگئیں۔ بیٹے کو انکار کرتیں تو اس کی نظروں میں بری بنتیں۔ جو انہیں ہرگز منظور نہ تھا۔ طوعاً "کرہاً" انہیں اجازت دینا ہی پڑی۔

نازنین نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ کم از کم دن کا کچھ حصہ تو گھر سے باہر گزارنے کو ملتا۔ ورنہ اس گھر میں رہتے ہوئے وہ ڈپریشن کی مریضہ بنتی جارہی تھی۔ اس نے فوراً" عالیہ سے رابطہ کیا اور اس کی مدد سے دوبارہ کالج جوائن کرلیا۔

شادی اور پھر بچے کی ولادت، نازنین کا پورا سال ضائع ہوچکا تھا۔ اب عالیہ اس سے ایک سال سینئر تھی۔ صبح عبدالرحمان اسے کالج چھوڑتے اور واپسی میں وہ عالیہ کے ساتھ آیا کرتی تھی۔ شاہ زیب کو اس نے شروع دن سے ہی فیڈر پر لگایا ہوا تھا۔ تاکہ اس کی پڑھائی کا حرج نہ ہو۔ ساس اور نند مل کر اس کے بیٹے کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ جب تک وہ گھر واپس نہ آجاتی۔ لیکن واپس آنے کے بعد اسے رات تک مسلسل کام پر لگائے رکھنا صبیحہ بیگم نے جیسے خود پر لازم کرلیا تھا۔

پہلے پہل تو نازنین خاموشی سے سب کرتی رہی، پھر ایک دن اس کا صبر جواب دے گیا۔ دوپہر میں سب گھر والوں کے لیے روٹی ڈالنا ابھی تک اس کی ذمہ داری تھی۔ اپنی فائلز وغیرہ برآمدے میں رکھ کر جب وہ کچن میں آئی تو چکرا کر رہ گئی۔ صبیحہ بیگم اور قدسیہ دونوں مل کر کچن کی الماریوں سے سب سامان باہر نکالتی جارہی تھیں اور ساتھ ساتھ ہنس رہی تھیں۔ نازنین نے سلام کیا تو صبیحہ بیگم نے فوراً" سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ کر سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہوا بہو! تم آگئیں۔ اب خود ہی سنبھال کر رکھو یہ چیزیں۔" انہوں نے تمام برتنوں اور مسالے کے ڈبوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ایک کاکروچ نظر آیا تھا ہمیں۔ چمچوں کی دراز میں۔ سوچا اور جانے کتنے ہوں۔ اب تم اچھی طرح دیکھ بھال کر سب سیٹ کردینا۔"

صبیحہ بیگم اتنا کہہ کر قدسیہ کے ساتھ باہر نکل گئیں۔ شاہ زیب نے دودھ کے لیے بلکنا شروع کردیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ پہلے روٹی ڈالے، کچن سمیٹے یا بچے کو دودھ بنا کردے۔ اس نے کوشش کرکے کاؤنٹر پر تھوڑی سی جگہ بنائی اور شاہ زیب کے لیے فیڈر تیار کیا۔ ابھی وہ صرف تین ماہ کا تھا۔ اسے گود میں لے کر دودھ پلانا پڑتا تھا۔ اس نے قدسیہ سے مدد مانگی تو اس نے صاف انکار کردیا۔

"بھابھی! میں تو نہانے جارہی ہوں۔ پسینے سے برا حال ہے۔ آپ روٹی ڈال کر خود ہی پلا دیجیے گا۔"

اس دن نازنین بہت پریشان ہوئی۔ صاف نظر آرہا تھا کہ صبیحہ بیگم نے محض اسے تنگ کرنے کی خاطر یہ بکھیڑا ڈالا تھا۔ اس نے عبید سے بات کی۔ عبید اس کی ساری شکایات بے توجہی سے سنتے، بدستور ٹی وی پر نظریں جمائے لیٹے رہے تو اسے بہت غصہ آیا۔

"میں اتنی دیر سے بکواس کیے جارہی ہوں، آپ سن کیوں نہیں رہے ہیں۔"

"کیا سنوں ناز۔ تم ہر روز اسی طرح کی باتیں کرتی ہو مجھ سے۔ کیا سنوں میں؟" شدید بیزاری کے عالم میں وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ "سب کچھ تمہاری مرضی سے ہورہا ہے۔ پھر بھی تمہاری شکایتیں ختم نہیں ہورہیں۔ اب کیا چاہتی ہو مجھ سے۔"

عبدالرحمان کو صبیحہ بیگم ہر روز سنایا کرتی تھیں کہ شاہ زیب کو سنبھالتے ہوئے انہیں کن مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انہیں شرمندگی ہونے لگتی تھی۔ بڑھاپے میں بجائے اس کے کہ انہیں آرام دیا جاتا۔ الٹا عبید نے اپنی اولاد بھی پرورش کے لیے ان کے حوالے کردی تھی۔

"تمہیں کبھی توفیق نہیں ہوئی کہ جھوٹے منہ ہی میری ماں کا شکریہ ادا کردو۔ جو تمہاری ذمہ داری بھی خود اٹھا رہی ہیں۔"

عبید نے اسے شرم دلائی اور ناز کے تو جیسے آگ ہی لگ گئی۔ "کیا ذمہ داری اٹھا رہی ہیں وہ؟ میں کالج سے واپس آتی ہوں تو باورچی خانے میں ہزاروں کام میرے منتظر ہوتے ہیں۔ شاہ زیب کو دھلاتی ہیں، نہ صاف کرتی ہیں۔ یوں ہی گند میں پڑا رہتا ہے۔ اسے نہلاؤں میں، صاف میں کروں، کھانا میں پکاؤں، روٹی بھی ڈالوں، صفائیاں بھی کروں، پھر اوپر اپنے کمرے کو بھی ٹھیک کرنا میرا ہی فرض ہے۔ آخر کرتی کیا ہیں وہ۔ جس کا احسان مانوں میں، جواب دیں۔"

"اگر اتنی ہی مصیبت پڑ رہی ہے تو چھوڑ دو پڑھائی، گھر پر رہو اور بچے کی صحیح طریقے سے دیکھ بھال کرو۔ میرے کان کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔" عبید نے اٹھ کر ٹی وی بند کیا اور چادر اوڑھ کر لیٹ گئے۔

نازنین تلملا کر رہ گئی۔ وہ پڑھائی پھر سے ادھوری چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اگلی صبح اس نے عبید سے پھر بات کرنے کی کوشش کی۔

"کیوں نہ ہم ایک آیا کا انتظام کرلیں۔" اس نے اپنی طرف سے بہترین حل سوچا تھا۔ مگر عبید کو یہ بھی منظور نہیں تھا۔

"میری اولاد کسی نوکرانی کے ہاتھوں میں پرورش نہیں پائے گی۔ میں نے آج تک تم جیسی ماں نہیں دیکھی۔"

وہ جو سمجھ رہی تھی کہ رات گزرنے کے بعد ان کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا ہوگا، پھر سے اپنی تضحیک ہوتے دیکھ کر چپ سی ہوگئی۔

"تم نے بچے کو اپنا دودھ پلانے سے منع کردیا۔ میں چپ رہا۔ تم نے اپنی ضد پوری کی، دوبارہ کالج میں داخلہ لیا۔ میں خاموش رہا۔ حالانکہ جو کچھ تم سیکھ رہی ہو، اس کی ہمارے دین میں بالکل اجازت نہیں ہے۔"

"اچھا؟ ایسا کیا گناہ کررہی ہوں میں۔" وہ ڈھٹائی سے بولی تو عبید نے بھی صاف صاف بات کرنے کی ٹھان لی۔

"تم کس بے شرمی سے اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ نیوڈ تصویریں بناتی ہو۔ کیا ضرورت ہے ان سب کی۔"

"یہ آرٹ ہے۔" ناز نے کمزور سا دفاع کیا اور نظریں چرانے پر مجبور ہوگئی۔ عبید نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"ناز! تم اپنی پسند کے سبجیکٹس میں پرائیویٹلی اے کرلو، گھر پر رہ کر پڑھائی کرلو، اس طرح شاہ زیب بھی neglect نہیں ہوگا۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ جس قسم کے لوفر لڑکے تمہارے کالج میں پڑھتے ہیں جیسی فحش باتیں وہ کرتے ہیں، میں نہیں چاہتا تم اس ماحول کا حصہ بنو۔ تم چھوڑ دو یہ سب۔ پلیز۔"

عبید کو ایک، دو بار نازنین کے کالج کے اندر جانے کا

اتفاق ہوا تھا۔ وہاں کا ماحول انھیں اچھا نہیں لگا تھا انہوں نے سرسری لفظوں میں نازنین کو روکنے کی کوشش کی تھی اور آج دوبارہ کہہ رہے تھے۔ مگر نازنین نہیں مانی۔ اس نے رو دھو کر عبید کو منالیا کہ "صرف دو، تین سال کی ہی تو بات ہے میرا گریجویشن کمپلیٹ ہوجائے۔" اور نہ چاہنے کے باوجود انہیں اجازت دینی ہی پڑی تھی۔

دو سال جیسے تیسے گزر ہی گئے۔ اب اس کے فائنل امتحانات میں چند ماہ رہ گئے تھے۔ شاہ زیب بھی چلنے پھرنے لگا تھا۔ ناز کو اپنی منزل آسان دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن پھر وہ ایک کے بعد ایک مشکل میں پھنستی چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

کالج میں نازنین کی طبیعت خراب ہوئی۔ عالیہ نے اس کے کہنے پر اسے محسنہ کے پاس ڈراپ کردیا۔ ویسے تو نازنین کو ماں کے پاس آنے اور رہنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہاں ان سہولتوں کا فقدان تھا جو اس کے سسرال میں میسر تھیں۔ محسنہ شروع سے قناعت پسند تھیں۔ انہوں نے گھر میں آسائشوں کا ڈھیر نہیں لگایا تھا۔ طارق جو پیسے بھجوایا کرتا اسے وہ تابندہ کی شادی کے لیے جوڑ رہی تھیں۔ اس کے ایک، دو اچھے رشتے آئے ہوئے تھے۔

تابندہ کی ذمہ داری سے فارغ ہو کر وہ حج پر جانا چاہتی تھیں۔ اس لیے غیر ضروری خرچ سے اجتناب برتی تھیں۔ یہی وجہ تھی نازنین نے بچے کی پیدائش کے بعد اپنے سسرال میں رہنے کو ترجیح دی۔ لیکن آج اس کا یہاں آنا ایک خاص مقصد کے تحت تھا۔ جس مصیبت میں وہ پھنس چکی تھی، صرف ماں ہی اسے نجات دلا سکتی تھی۔ محسنہ کمرے میں بستر پر لیٹی نازنین کے لیے نمکین لسی لے کر آئیں تو اس نے اپنی آمد کی وجہ بیان کردی۔

"ہے کیا کہوے نازنین۔" محسنہ ہکا بکا بیٹی کی شکل دیکھنے لگیں۔

"ہاں امی جی! مجھے نہیں چاہیے۔ ابھی میں یہ مصیبت مول نہیں لے سکتی، مجھے رضیہ خالہ کے پاس لے چلو۔" اس نے محلے کی دائی کا نام لیا۔

پھر اس نے لجاجت سے ماں کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "میری اچھی امی، میرا یہ کام کرادو۔۔۔ نہیں تو وہ لوگ پھر سے مجھے گھر بٹھالیں گے۔ میری پڑھائی چھوٹ جائے گی۔ آخری سال ہے میرا۔۔۔ اگر امتحان نہ دیا تو ساری محنت ضائع ہوجائے گی۔"

"میں تیرے میاں سے بات کروں گی، وہ سمجھالے گا تیری ساس کو، تو ایسا نہ کر، یہ اللہ کے کم ہوندے نیں، اساں کچھ نہیں کرسکتے ہیں گے۔" محسنہ نے اسے بہتیرا سمجھانے کی کوشش کی، مگر وہ نہیں مانی۔ تب انہوں نے بھی اس کی مدد سے صاف انکار کردیا۔

نازنین کسی صورت اس بچے کی پیدائش کے حق میں نہیں تھی۔ جب ماں سے کسی طرح اپنی حمایت کی کوئی امید نہ رہی تو اس نے عالیہ سے مدد لینے کا فیصلہ کرلیا۔

☆ ☆ ☆

"ہم تو اپنی بہو کو بیٹیوں سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ جیسے چاہو رہو سہو، کھاؤ پیو، عیش کرو، ہمیں تو انہیں خوش دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔"

صبیحہ بیگم شہد آگیں لہجے میں جانے کن خاتون سے نازنین کا تعارف کروانے کے بعد خود اپنی ہی تعریفیں کیے جارہی تھیں۔ ناز نے پہلے حیرت سے سر اٹھایا اور پھر بے زاری سے دوسری جانب دیکھنے لگی۔

"حد ہوتی ہے، بناوٹی محبت جتائے جارہی ہیں توبہ۔۔۔" اس کے حلق تک کڑواہٹ بھر گئی، جبکہ وہ خاتون صبیحہ بیگم سے خاصی متاثر نظر آرہی تھیں۔ ناز سے بولیں۔

"بیٹی! آپ بہت خوش نصیب ہیں جو اتنا چاہنے والا سسرال ملا ہے آپ کو۔۔۔ ماشاءاللہ۔"

"ہم تو اللہ سے بہت ڈرتے ہیں شائستہ بیگم۔" صبیحہ بیگم نے ان خاتون کا نام لے کر کہا۔ "دوسروں کی بیٹی کو دکھ دیں گے تو کیا ہماری بیٹی دوسرے گھر میں سکھی رہ سکے گی؟ انسان آخر اپنے کیے کا ہی پھل پاتا ہے۔ اب دیکھیے نا۔۔۔ ہم نے اپنی بہو پر کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی، کوئی روک ٹوک نہیں ہے، ڈھائی سال کا بیٹا ہے اس کا، یہ کالج جاتی ہے پڑھنے اور بیٹے کو میں سنبھالتی ہوں، گھر بھی دیکھتی ہوں اور وہاں، میری بیٹی بھی بڑے سکھ سے ہے۔ کیونکہ میں نے اپنی بہو کا خیال رکھا، اللہ نے میری بیٹی کو میری نیکیوں کا بدلہ دیا ہے۔"

شائستہ بیگم تو سر دھننے لگیں، مگر ناز سے اور برداشت نہیں ہوا۔ وہ بدقت مسکراتی ہوئی ان کی پیچھے والی کرسیوں کی لین میں جاکر بیٹھ گئی۔ اب اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ صبیحہ بیگم کے التفات کا مقصد کیا تھا۔ صبح سے وہ اس کے واری صدقے جارہی تھیں، بہو اپنا سب سے بھاری جوڑا پہننا اور زیور بھی، خوب اچھے انداز میں بناؤ سنگھار کیجیے گا۔ ہماری جان پہچان کے بہت لوگ ہوں گے اس تقریب میں، آج آپ تیار ہونے میں کوئی کسر مت چھوڑیے گا۔

اسی قسم کی دوسری ہدایات دے کر وہ بڑے اہتمام سے اسے اپنے ساتھ لے کر آئی تھیں۔ تیاری تو قدسیہ کی بھی کم نہ تھی۔ کچھ دیر بعد اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی نے اس کے کپڑوں کی تعریف کی۔ ناز نے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ مزید کہنے لگی۔

"آپ کی تو مسکراہٹ بھی بے حد خوب صورت ہے، بہت پیاری ہیں آپ۔"

اپنی توصیف سن کر پل بھر میں موڈ خوشگوار ہوگیا اور ناز اس سے خوب کھل مل کر باتیں کرنے لگی۔ اس دوران صبیحہ بیگم نے پیچھے مڑ کر ایک نظر نازنین کو دیکھا، پھر مسکرا کر دوبارہ شائستہ بیگم سے گفتگو میں مصروف ہوگئیں۔

ناز نے کھانا بھی اسی لڑکی کے ساتھ کھایا تھا۔ قدسیہ، صبیحہ اور شائستہ بیگم کو کھانا لا کر دے رہی تھی۔

"دراصل ہم اپنے بھائی کے لیے اچھی سی لڑکی تلاش کررہے ہیں۔" اس لڑکی نے کھانا کھاتے ہوئے ناز کو اس تقریب میں شرکت کا اصل مقصد بتایا۔

"تو پسند آئی کوئی؟"

"نہیں، ابھی کسی پر نگاہ ٹھہری تو نہیں۔۔۔ ویسے آپ تو یہاں سب کو جانتی ہوں گی۔ آپ ہی کچھ مدد کردیں ہماری۔" اس نے کولڈ ڈرنک کا گھونٹ لے کر اسے کرسی کے پاس نیچے کارپٹ پر رکھتے ہوئے کہا، پھر سامنے کچھ فاصلے پر کھڑی قدسیہ کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ لڑکی اچھی لگ رہی ہے نا۔۔۔ میں امی سے کہتی ہوں۔۔۔ اس کے بارے میں پوچھیں، زرینہ خالہ سے۔"

اس نے قدسیہ میں دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے تقریب کی میزبان کا حوالہ دیا۔ ابھی وہ اٹھنے ہی لگی تھی کہ ناز نے ہاتھ پکڑ کر اسے دوبارہ بٹھاتے ہوئے رازداری سے کہا۔

"رہنے دو، تم اسے نہیں جانتیں، ایک نمبر کی چالاک لڑکی ہے، تم لوگ سیدھے سادے لگتے ہو، یہ تو ناکوں چنے چبوا دے گی تمہیں۔" کن اکھیوں سے صبیحہ بیگم کو دیکھ کر اس نے آہستگی سے اس کے کانوں میں سرگوشی کی تھی۔

"کیا آپ جانتی ہیں اسے۔" وہ حیرت سے ناز کی شکل دیکھنے لگی۔

"ہاں، چھوٹی نند ہے میری۔" ناز کے لہجے میں تنفر تھا۔

"اچھا۔۔۔" وہ لڑکی پھر سے واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ "پھر تو آپ کو زیادہ بہتر پتا ہوگا، ویسے دیکھنے میں تو سیدھی سادی لگتی ہے۔"

"چھوڑو۔۔۔ صورت پر نہ جاؤ اس کی۔۔۔ پوری فسادن ہے، جب دیکھو، اپنے بھائی کے کان بھرتی رہتی ہے میرے خلاف۔"

"آپ کی ساس روکتی نہیں اپنی بیٹی کو۔"

"وہ کیوں روکیں گی، الٹا اس کے ساتھ مل کر میری زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ وہ دیکھو سامنے جو گلابی کپڑوں میں کھڑی ہیں، شاید تم جانتی ہو انہیں۔" ناز نے اس کی توجہ دلائی۔

"ہمم ابھی ایسا بن بن کر باتیں کررہی ہیں جیسے دنیا کی

بہترین ساس ہوں' اپنے منہ میاں مٹھو بننے کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے محترمہ نے۔ ہم تو اپنی بہو کو بیٹی سمجھتے ہیں۔ ہونہہ۔" اس نے منہ ٹیڑھا کرتے ہوئے صبیحہ بیگم کی نقل اتاری۔ "اصل میں یہ سب لوگ مجھ سے جلتے ہیں' عبید میرے شوہر نے ضد پکڑلی تھی کہ مجھ ہی سے شادی کرنی ہے اور یہ راضی نہ تھیں' اپنی بدشکل بھانجی سے بیاہنا چاہتی تھیں۔ ان پر بس نہ چل سکا' بدلے مجھ سے لیے جارہے ہیں۔ سارا دن جلی کٹی سناتی رہتی ہیں' شادی پر بھی بڑا تنگ کیا انہوں نے' حق مہر سوا بتیس روپے باندھا' ایسا چھلکا سا زیور دیا بری میں' اوپر سے سو سو باتیں الگ سنائیں۔ اللہ دشمن کو بھی ایسی سسرال نہ دے' جیسی مجھے ملی ہے۔" ناز نے خوب ہی دل کے پھپھولے پھوڑے۔

گھر جانے کا اشارہ ملنے تک نازنین اپنی نئی سہیلی کو اور بہت کچھ بتاتی رہی اور وہ لڑکی نہایت ہمدردی سے اس کے دکھڑے سنتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"عبید میاں' آپ کو توقیر میاں کیسے لگے؟ بھئی ہمیں تو پورا خاندان بہت پسند آیا ہے۔ نہایت سلجھے ہوئے لوگ ہیں۔" مطیع الرحمان نے تقریب سے واپسی پر گاڑی میں بیٹے کی رائے طلب کی ساتھ ہی اپنی پسندیدگی کا بھی فوراً" ہی اظہار کردیا۔

"جی ابو' لڑکا بھی اچھا ہے' پڑھا لکھا' سمجھ دار ہے۔"

"پورا خاندان ہی نہایت خوش اخلاق ہے' ان کی بیٹی سکینہ' بہو بیگم سے یوں گھل مل گئی تھی جیسے برسوں کی جان پہچان ہو۔"

لو یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ ناز نے حیرت سے ساس کی جانب دیکھا۔

"کون امی بیگم' کس کی بات کررہی ہیں آپ۔"

"سکینہ کی بات کررہی ہوں اور کس کی۔" شائستہ بیگم کی بیٹی ہی تو تھی وہ۔ جس کے ساتھ تم پوری تقریب میں پکی سہیلیوں کی طرح گفتگو کرتی رہی۔"

یہ انکشاف سن کر نازنین کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ "یہ کیا ہوگیا تھا؟" وہ اپنی دھن میں کہتی رہیں۔

"تین ہفتے پہلے شائستہ بیگم ہمارے گھر آکر قدسیہ کو دیکھ گئی تھیں' تم تو اپنی پڑھائی میں ہی اتنی مصروف رہتی ہو' شاید دھیان نہیں گیا تمہارا' شائستہ اپنے شوہر کے ساتھ آئی تھیں۔ انہیں ہمارا رہن سہن طور طریقہ بے حد پسند آیا۔ میرا خیال ہے شائستہ بیگم کل ہی رشتے کے لیے ہاں کہہ دیں گی' کہہ رہی تھیں فون کریں گی کل دوپہر تک۔"

صبیحہ بیگم بے حد خوش تھیں اور نازنین سوچ سوچ کر پاگل ہوئی جارہی تھی۔ کس چالاکی سے اس معصوم شکل والی سکینہ نے ناز سے سب کچھ اگلوالیا تھا اور وہ بے وقوفوں کی طرح ہر بات کہتی چلی گئی۔ اب اللہ جانے اس غلطی کا خمیازہ کون کون بھگتے گا۔ ناز سارا رستہ بے حد پریشان رہی۔ اگلا دن بلاشبہ اس کی زندگی کا سب سے تاریک دن بننے والا تھا۔

عبدالرحمان سے نیند پوری نہ ہونے کا بہانہ کرکے اس نے کالج سے چھٹی کی۔ جب وہ بھی گھر سے باہر نکل گئے تو نازنین اپنے کمرے میں آگئی عالیہ نے اسے میڈیکل اسٹور سے اسقاط حمل کی گولیاں لاکردی تھیں کل رات کی تقریب کا پورا احوال بھوت بن کر دماغ سے چمٹا ہوا تھا۔ وہ مضطرب تھی مگر اس کام میں مزید دیر کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔ اسے جلد سے جلد اس ٹینشن سے چھٹکارا حاصل کرنا ہی تھا۔ یہ فیصلہ کرتے ہی اس نے گولیاں پانی کے ساتھ نگل لیں اور چادر اوڑھ کر لیٹ گئی۔

شاہ زیب حسب معمول اپنی دادی' دادا کے پاس تھا۔ مطیع الرحمان اس کے بنا ناشتہ نہیں کرتے تھے۔

صبیحہ بیگم بے تابی سے شائستہ بیگم کی کال کی منتظر تھیں جو انہیں دوپہر سے پہلے ہی موصول ہوگئی۔ ان کی طرف سے صاف انکار قطعی غیر متوقع سہی پر اصل ستم تو انکار کی وجہ نے ڈھایا تھا۔ شائستہ بیگم نے نازنین کی کہی ایک ایک بات ان کے سامنے من و عن دہرا دی۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے صبیحہ بیگم کی خوب

خوب بے عزتی کی تھی۔ صبیحہ بیگم حیران پریشان "آپ سنئے تو۔۔۔" ہی کہتی رہ گئیں اور دوسری طرف سے فون بند کردیا گیا۔

صبیحہ بیگم اپنا سر تھام کر پاس پڑی کرسی پر ڈھے گئیں۔ مطیع الرحمان بھاگے بھاگے آئے' دیکھا تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ صبیحہ بیگم کی طبیعت اچانک ہی خراب ہوگئی۔ شاید بی پی شوٹ کرگیا تھا۔ اس وقت مطیع الرحمان صبیحہ بیگم کو کمرے کے اندر لائے اور بستر پر لٹانے کے بعد عبید کو فون کرکے فوراً" گھر پہنچنے کا حکم دیا۔

ماں کی طبیعت کا سن کر عبید نے گھر آنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ فوراً" ہی ماں کے کمرے میں چلے آئے۔ صبیحہ بیگم کا بلڈ پریشر تو نارمل ہوگیا تھا لیکن وہ اب تک روئے جارہی تھیں۔ مطیع الرحمان نے عبید کی شکل دیکھتے ہی کہا۔

"جائیے۔۔۔ نازنین کو بلا کر لائیے۔ آپ کے سامنے ان سے بات ہوگی۔" عبدالرحمان والد کے غصے سے اچھی طرح واقف تھے سو چپ چاپ نازنین کو بلانے چل پڑے۔

☼ ☼ ☼

عبدالرحمان کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ بھلا نازنین نے یہ انتہائی قدم کیوں اٹھایا تھا۔ لیکن ڈاکٹر جس یقین سے بات کررہی تھی اسے جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا تھا۔

"آگے بہت احتیاط کی ضرورت ہے ورنہ آپ کی مسز ماں بننے کی صلاحیت کھودیں گی۔" ڈاکٹر ہدایت دینے کے بعد وہاں سے چلی گئی۔

عبید ناز کے پاس کمرے میں آگئے۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔

عبید بے اختیاری میں اسے دیکھے چلے گئے۔ آج بھی وہ انہیں اول روز کی طرح حسین اور پرکشش نظر آرہی تھی۔ ایک بیٹے کی ماں بن جانے کے باوجود اس کا حسن ویسے کا ویسا ہی تھا جس پر وہ اپنا دل ہارے تھے۔

محبت کرنا' اپنی محبت کو حاصل کرنا جتنا پر لطف اور کیف آگیں تھا' محبت کے ساتھ نباہ کرنا اسی قدر عذاب بن گیا تھا۔ نازنین ایک بے حد مشکل عورت تھی۔ جو کچھ اس کے لیے وہ کرتے آئے تھے آج تک ان کے پورے خاندان میں کسی عورت کے لیے نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ خوش نہیں ہوتی تھی۔

جب مطیع الرحمان نے ناز کو نیچے بلوایا اور صبیحہ بیگم نے اس سے صاف صاف پوچھا کہ قدسیہ کے متعلق اس نے سکینہ سے کیا کیا باتیں کی ہیں؟ تو وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگی۔ مطیع الرحمان کے ڈپٹنے پر اس نے صفائی سے جھوٹ بول دیا کہ اس نے گھر کی کوئی بھی بات سکینہ کے سامنے نہیں کی۔

"آپ لوگ میری کسی بات پر یقین نہیں کریں گے باہر سے کوئی بھی آکر مجھ پر الزام لگادے تو وہ سچا اور میں جھوٹی؟"

"بی بی! کسی کو کیا پڑی ہے تمہارا نام لے کر جھوٹ بولنے کی؟" صبیحہ بیگم نے جل کر کہا۔

"شاید انہیں قدسیہ پسند نہیں آئی تھی' وہ یہاں شادی نہ کرنا چاہتے ہوں گے' جان چھڑانے کو میرا نام لگادیا اور آپ مجھ پر چڑھ دوڑے۔"

نازنین نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"اگر انہیں انکار کرنا ہوتا تو وہ کچھ بھی کہتے۔۔۔ لیکن انہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں نے اپنی ماں کی بھانجی کو ٹھکرا کر تم سے شادی کی' تمہارا حق مہر صرف سوا 32 روپے باندھا گیا۔ یہ سب کچھ تم نے کہا تھا تب ہی انہیں معلوم ہوا ورنہ کیسے پتا چلتا؟" عبید نے ناز کے جھوٹ کو پکڑلیا۔

"یہاں کسی نے مجھے کبھی عزت نہیں دی۔ اپنے گھر کا فرد نہیں سمجھا' قدسیہ کے رشتے کی بات چلتی رہی اور مجھے کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ کسی نے مجھے بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی' مجھے گھر کے معاملات میں شامل نہیں کیا جاتا۔ کیوں؟ اگر مجھے ابتدا سے شامل رکھا جاتا تو یہ سب تو نہ ہوتا۔ اپنی نیکیوں کا ڈھنڈورا پیٹنے کے لیے سجا سنوار کر ساتھ لے گئیں۔"

نازنے براہ راست صبیحہ بیگم کو مخاطب کیا "دنیا کو یہ دکھانے کے لیے کہ ہم اپنی بہو کا بہت خیال رکھتے ہیں کل شام مجھے سولہ سنگھار کرنے کو کہتی رہیں ایک بار بتا تو دیتیں کہاں لے جا رہی ہیں کیوں لے جا رہی ہیں؟"

"تمیز سے بات کرو میری ماں سے۔" عبید اس کے گستاخ لہجے پر سخت اشتعال میں آگئے۔

"میں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔" وہ بدستور ترخ کر بولی "آپ کو صرف میری غلطی نظر آتی ہے۔ اپنی ماں کی حرکتیں دکھائی نہیں دیتیں۔"

اور عبید اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتے تھے انہوں نے فوراً" آگے بڑھ کر ناز کے منہ پر تھپڑ رسید کیا اور اسی پر بس نہیں ناز کی زبان چلتی رہی اور وہ مارتے رہے۔ مطیع الرحمان کی آواز بھی انہیں سنائی نہیں دے رہی تھی جو انہیں ناز پر ہاتھ اٹھانے سے روک رہے تھے۔ ان کا ہاتھ شاید نہ رکتا اگر ناز بے ہوش نہ ہو گئی ہوتی۔

"اسے ہسپتال لے کر چلو عبید۔۔۔ یہ کیا کر دیا تم نے۔" مطیع الرحمان نے زمین پر گری ناز کے پاس بیٹھتے ہوئے فکرمندی سے کہا۔ عبید الرحمان کا پارہ چڑھا ہوا تھا وہ نازنین کو یونہی چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

قدسیہ اور گلناز گھر واپس آچکی تھیں۔ اس ہنگامے نے ان کے حواس معطل کر دیے تھے۔ مطیع الرحمان کے چلانے پر وہ نازنین کے پاس آئیں اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگیں۔ مگر وہ ہوش میں نہ آئی۔ گلناز نے عبید کی منت سماجت کر کے انہیں ہسپتال لے جانے پر راضی کیا۔ جہاں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ ناز امید سے تھی اور اس نے اپنی ہی اولاد کو قتل کر دیا تھا۔

ناز کی اس حرکت نے عبید کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ انہیں پہلی بار احساس ہوا کہ ناز سے شادی کر کے انہوں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ ایک غلط فیصلے نے ان کی پرسکون زندگی غارت کر دی تھی۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسے بے حد نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ ہاسپٹل سے آئے تیسرا دن ہو چلا تھا مگر ابھی تک طبیعت سنبھل نہیں پائی تھی۔ تین مہینے کا بچہ جو اس کے وجود کا حصہ رہا تھا اسے نہایت بے دردی سے نوچ پھینکا تھا دوائیوں نے اس کی اپنی جان بھی نچوڑ کر رکھ دی تھی۔ اوپر سے عبید کی ناراضی اسے پریشان کر رہی تھی۔ ہاسپٹل سے آنے کے بعد انہوں نے ایک بار بھی اس کا حال چال نہیں پوچھا تھا وہ اسے یکسر نظر انداز کیے ہوئے تھے۔

محسنہ کو اطلاع ملی تو وہ بیٹی کو دیکھنے آئیں۔ اس حالت میں جب ساری دنیا اس سے خفا تھی ماں کا مہربان رویہ دیکھ کر پہلی دفعہ اسے اس رشتے کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا۔ اور وہ محسنہ کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

محسنہ نے عبید سے ناز کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت مانگی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ انہیں اپنی بیوی پر بالکل بھروسا نہیں رہا تھا وہ دوبارہ ایسی حرکت کر سکتی تھی۔

تذلیل کیا ہوتی ہے؟ اس سے پہلے شاید ناز کو اندازہ نہیں تھا۔ تذلیل وہ نہیں تھی جو باورچی خانے میں کام کرتے ہوئے قدسیہ اور صبیحہ بیگم کی طنزیہ گفتگو سن کر وہ محسوس کیا کرتی تھی۔ اصل ذلت کا سامنا تو اب کیا تھا اس نے۔۔۔ جب سب لوگوں کے ساتھ عبید کا رویہ بھی بدل گیا تھا۔

گھر کے کام کلی طور پر اب اس کی ذمہ داری بنا دیے گئے تھے۔ جنہیں تمام کرتے وہ صبح سے رات کر دیتی۔ پھر بھی معمولی سی کوتاہی پر اسے بری طرح جھڑک دیا جاتا اور یہ کام عبید کیا کرتے تھے۔ پہلی بار انہوں نے نازنین کو سب کے سامنے زور سے ڈانٹ دیا جب وہ کھانے کی میز پر چٹنی رکھنا بھول گئی تھی۔ بلند آواز میں چلاتے ہوئے انہوں نے ناز کو سخت سست کہا تھا۔

اس دن کے بعد گھر کے تمام افراد کے منہ پر لگے لحاظ کے تالے بھی ٹوٹ گئے تھے۔ جس کے منہ میں جو آتا کہنے لگتا۔ قدسیہ بھائی کے سامنے مسکینی بن کر خاموش رہتی تھی مگر بعد میں ہر طرح کی کسر نکال لیتی۔ اس کی پڑھائی چھڑوا دی گئی تھی۔

"اب تم کالج نہیں جاؤ گی۔" انتہائی سرد بے مروت ٹوک لہجے میں عبید نے فقط اتنا ہی کہا اور وہ ٹکر ٹکر ان کی صورت دیکھے چلی گئی۔

مطیع الرحمان نے اکیلے میں عبید کو بہت ڈانٹا تھا ان کے خاندان میں آج تک عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا گیا تھا۔ انہوں نے والد کی ڈانٹ خاموشی سے سن لی تھی۔ مگر ناز کے ساتھ اپنا سخت رویہ ہنوز برقرار رکھا ہوا تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے اس طریقے سے وہ نازنین کی فطرت بدل پائیں گے۔ شاید وہ ان کی محبت پانے کے لیے خود کو ایک اچھی بیوی ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ اتنا ضرور ہوا تھا کہ اب وہ خاموش رہنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

قدسیہ کے لیے ایک اور رشتہ آیا تھا اب چونکہ وہ سارا دن گھر پر ہوتی تھی اس لیے اسے فوراً" ہی معلوم ہو گیا تھا۔ صبیحہ بیگم نے بھی رازداری برتنے کے بجائے مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے اس سے کچھ چیزیں پکوائی تھیں۔ وہ سمجھی اب ان کا غصہ اتر چکا ہے اور انہوں نے اسے معاف بھی کر دیا ہوگا۔ نہایت دل جمعی سے اس نے تمام اسنیکس تیار کیے شام تک وہ کچن میں ہی مصروف رہی۔

عبید الرحمان بھی جلدی گھر آگئے تھے کچھ دیر ماں کے پاس بیٹھ کر وہ باورچی خانے میں آئے تو نازنین نے ان سے کہا۔

"بس سب کچھ تیار ہے میں دس منٹ میں تیار ہو جاؤں گی۔ ان کے آنے میں ابھی آدھا گھنٹہ ہے نا۔۔۔" اس نے بریڈ رول پلیٹ میں نکالتے ہوئے انہیں تسلی دی تھی۔

"تم اوپر چلی جاؤ باقی کام گلناز کر دے گی میں نے بلایا ہے اسے۔"

"اسے کیوں بلا لیا سارا دن اسکول میں دماغ کھپاتی ہے اب آپ ان کاموں میں لگا دیں گے۔۔۔ میں نے کر تو لیا ہے سب کچھ۔"

"جتنا تم سے کہا جا رہا ہے۔۔۔ اتنا ہی کرو۔۔۔ چھوڑ دو یہ کام اور جاؤ سیدھی اوپر۔" عبید کو شاید غصہ آگیا تھا اس نے خاموشی سے فرائی رول کڑاہی سے باہر نکالے چولہے کی آنچ آہستہ کی اور کپڑے سے ہاتھ پونچھ کر باہر نکلتے ہوئے بولی۔

"میں ابھی نہا کر آتی ہوں پھر باقی رول بھی فرائی کروں گی۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ تم اوپر ہی رہو گی میں نہیں چاہتا میری بہن کی خوشیوں پر تمہارا منحوس سایہ بھی پڑے۔" نازنین ٹھٹک کر رک گئی اور بے یقینی سے عبید کو دیکھے چلی گئی۔ اتنی خدمت عاجزی اور فرماں برداری کے باوجود ان کا دل ابھی تک صاف نہیں ہوا تھا۔

عبید تو کیا صبیحہ بیگم اور مطیع الرحمان بھی اب تک اس حرکت کو یاد رکھے ہوئے تھے۔ رشتہ طے ہوا تاریخ طے کی گئی پھر قدسیہ کی دھوم دھام سے شادی بھی کر دی گئی اور وہ بیاہ کر پنڈی چلی گئی۔ ولیمے میں شرکت کی غرض سے گھر والے اور رشتہ دار سب ایک کوچ میں پنڈی گئے تھے۔ کسی ایک موقع پر بھی نازنین شرکت نہیں کر سکی۔ اسے محسنہ کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ ناز کو اس بار غصہ نہیں آیا تھا اسے صدمہ ہوا تھا شدید صدمہ۔ زندگی اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے گی اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں ایسی ہرنی ہوں عالیہ جسے شیر نے ادھ موا کر کے زمین پر گراتے ہی بھنبھوڑنا شروع کر دیا ہے۔ میں اپنی آنکھوں سے لمحہ لمحہ خود کو مرتے ہوئے دیکھتی ہوں۔ ایسی تکلیف دہ زندگی جی رہی ہوں۔ موت جس سے بدرجہا بہتر ہے۔"

عالیہ نے سر اٹھا کر نازنین کے چہرے کو غور سے دیکھا جس پر شدید اذیت' دکھ اور تکلیف کی داستان رقم تھی۔

"تم سوچ بھی نہیں سکتیں یہ لوگ میرے ساتھ کیا کرتے ہیں.... میرا حسن' اعتماد' صلاحیتیں سب بے معنی ہے' انہیں مجھ میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ میں ختم ہو جاؤں گی.... میری برائیاں میری خامیاں بھی ختم نہیں ہوں گی۔"

نازنین دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی عالیہ نے اسے کھل کر رونے دیا۔

"عبید نے مجھے دھوکا دیا ہے.... اپنا ایک بھی وعدہ پورا نہیں کیا۔ اس نے میری اسٹڈیز تک کمپلیٹ نہیں کرنے دیں مجھے.... رات گئے اس کی واپسی ہوتی ہے.... کچھ کہوں تو جانوروں کی طرح مارنے پیٹنے لگتا ہے.... اتنی غلیظ زبان استعمال کرتا ہے کہ تم تصور نہیں کر سکتیں۔

میں سارا دن بیگار کاٹتی ہوں' اس کے بچے پالتی ہوں.... اس کی ماں کی بکواس سنتی ہوں' گھر کے سارے کام کرتی ہوں پھر بھی وہ مجھ سے خوش نہیں ہے.... اول دن سے مجھے بدزبان' پھوہڑ اور بے غیرت کہہ رہا ہے.... بے غیرت ہی تو ہوں میں.... جو اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود اس کے قدموں میں پڑی ہوں۔" ناز نے الٹے ہاتھ سے بھیگے چہرے کو صاف کرتے ہوئے بے بسی سے کہا۔ تو عالیہ نے اسے ٹوکا۔

"یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے۔"

"میں نے کیا کیا؟"

"ان لوگوں نے تمہیں بے وقوف بنایا اور تم بن گئیں۔ اپنے آپ کو پہچانو نازنین! تم ہیرا ہو.... انمول اور بیش قیمت مگر یہ لوگ جوہری نہیں ہیں انہوں نے تمہاری قدر نہیں کی.... دنیا کرے گی اپنے ٹیلنٹ کو استعمال میں لاؤ...." عالیہ جیسے ناز کے بدن میں نئی روح پھونک رہی تھی' اس کے ہاتھ کپکپانے لگے۔

"تم اتنی ٹیلنٹڈ ہو' کالج میں تمہارے پروجیکٹس بہترین ہوا کرتے تھے تم تو ہر فن مولا تھیں۔ شاعری' ڈرامہ! اسٹوری رائٹنگ.... ہر شعبے میں کمال پرفارمنس ہوتی تھی تمہاری.... کالج کا کوئی فنکشن ہوا تھا کبھی تمہارے بغیر' نازنین! تم آج بھی بہت کچھ کر سکتی ہو۔"

ان پرانے دنوں کی یاد نے جب چہار جانب ستائش بھری نظریں اور تحسین آمیز جملے سنائی دیتے تھے اس کے چہرے کو روشن کر دیا تھا۔ عالیہ اپنی بات کا اثر ہوتا دیکھ کر مزید پرجوش ہو گئی۔

"تم پھر سے کام شروع کرو۔" اس نے چٹکی بجا کر ناز کے سامنے زمین پر بیٹھتے ہوئے آئیڈیا دیا "تم اتنی اچھی آرٹسٹ ہو' گھر پر ہزاروں کاموں کے لیے وقت نکالتی ہو پینٹنگ کرنے پر بھی دھیان دو.... میں تمہارا کام exhibit کروں گی۔ کراچی میں آرٹ کی بہت قدر ہے' ہاتھوں ہاتھ بکیں گی تمہاری پینٹنگز.... جو بیوی خود کماتی کھاتی ہو.... شوہر اسے دبا نہیں سکتا.... عبید تیر کی طرح سیدھا ہو جائے گا.... اور پھر۔" عالیہ نے ڈرامائی انداز میں بھنوؤں کے بل اچک کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا "تم اس سے علیحدہ گھر کا مطالبہ کر دینا۔"

"علیحدہ گھر؟" نازنین نے زیر لب دہرایا۔

عالیہ مسکرائی "ہاں تمہارا اپنا گھر۔"

☆ ☆ ☆

عالیہ جب تک لاہور میں رہی' باقاعدگی کے ساتھ نازنین سے ملنے آتی رہی۔ وہ کراچی کی ایک مشہور فرم میں انٹیریئر ڈیکوریٹر کی حیثیت سے جاب کرتی تھی۔ اس کے لیے ناز کی پینٹنگز بکوانا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ نازنین نے اس کے جاتے ہی دوبارہ کام شروع کر دیا تھا۔

مطیع الرحمان کے انتقال کو تین مہینے ہونے والے تھے۔ عافیہ کو پاکستان چھوڑ کر شفیق الرحمان ابوظہبی روانہ ہو گئے۔ انتہائی غیر محسوس انداز میں عافیہ نے ناز

کے بہت سے کاموں کو اپنی ذمہ داری بنا لیا تھا۔ وہ صبیحہ بیگم کے ناشتے اور کھانے کا خیال رکھنے لگی' انہیں وقت پر دوائیں دینا بھی اس کے فرائض میں شامل ہو گیا۔ پہلے پہل ناز کو حیرت ہوئی کیونکہ صبیحہ بیگم کو عافیہ کے کاموں میں کوئی برائی نظر نہیں آتی تھی۔ کیوں؟ اس کا صاف مطلب تو یہی تھا کہ خرابی ناز میں نہیں تھی اور نہ ہی اس کے کیے گئے کام میں تھی بلکہ صبیحہ بیگم جان بوجھ کر اسے ستایا کرتی تھیں۔ خیر جو بھی تھا' ناز کی جان چھوٹ رہی تھی اور وہ بے حد سکون محسوس کرنے لگی تھی۔

اس نے دوبارہ سے خود پر توجہ دینا شروع کر دی۔ اس نے پینٹنگز اور ووڈ کارونگ کے چند ایک پروجیکٹس مکمل کر کے عالیہ کے حوالے کر دیے تھے۔ جن کی اچھی قیمت وصول ہونے کی امید تھی۔

اس کے حالات بدل رہے تھے۔ کھویا ہوا اعتماد بحال ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اکثر بچوں کو لے کر نزدیکی بازار شاپنگ کرنے چلی جاتی۔ انہیں کھلونے اور گفٹس خرید کر دیتی اور پھر ان کی من پسند آئس کریم دلا کر واپس گھر کا رخ کرتی۔ اس سب کا مقصد بچوں کی خوشی سے زیادہ ان کا اعتماد حاصل کرنا تھا۔ وہ وہی کر رہی تھی جو عالیہ نے سمجھایا تھا۔

"تمہاری شادی پر مہر کی رقم دیکھ کر ہی مجھے اچھی طرح عبید کی فطرت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ رہی سہی کسر تمہارے سسرال والوں نے پوری کر دی۔ مگر تم خود کو کمزور مت سمجھو.... بچوں کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کرو.... وہی تمہاری ڈھال بنیں گے.... انہیں بتاؤ ان کی دادی اور باپ کس طرح تمہیں پریشان کرتے ہیں.... اگر بچے اپنے باپ کو تم پر زیادتی کرنے سے ٹوک دیں تو عبید بھی احتیاط کرے گا.... وہ ہرگز یہ نہیں چاہے گا کہ اس کی اولاد اسے ایک برا انسان سمجھے...."

نازنین نے عالیہ کے منہ سے نکلی ہر بات اچھی طرح ذہن نشین کر لی تھی۔ سمجھ دار تو وہ خود بھی بہت تھی۔

وہ جان بوجھ کر بچوں کے سامنے کوئی نہ کوئی فضیحتہ کھڑا کر دیتی اور پھر شوہر کے بے قابو غصے کا تماشا خود بھی دیکھتی.... اور انہیں بھی دکھاتی۔ نتیجتاً" بچے باپ سے سخت متنفر ہوتے جا رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

اپنی کار گھر کے گیٹ سے اندر لاتے ہوئے عبید کی نظر بالکونی میں کھڑے ٹیپو پر پڑی' تیزی سے کار پورچ میں داخل ہوئی تھی۔ جسے پارک کرتے ہی وہ فوراً" باہر نکلے اور لان میں آ کر دوبارہ بالکونی کی طرف دیکھا۔ ان کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ ٹیپو ان کے باتھ روم کی کھڑکی کے ساتھ لگ کر کھڑا اندر جھانک رہا تھا۔ عبید نے آواز دینا چاہی پھر کچھ سوچ کر رک گئے اور تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھتے اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگے۔

سیڑھیوں کے اوپر ہی انہیں ٹیپو نظر آ گیا اس کے سلام کا جواب دینے کے بجائے عبید نے پوچھا "وہاں بالکونی میں کھڑے کیا کر رہے تھے؟"

"جی کچھ نہیں.... بس پودوں کو پانی دے رہا تھا...." ٹیپو نے کہا تو عبید اسے غور سے دیکھنے لگے' وہ انٹر کر چکا تھا' قد بھی خوب نکلا تھا۔ ناز کی فطرت کی وجہ سے ان کا رشتہ بھی عجیب کھنچاؤ کا شکار ہوا تھا۔ نازنین اکثر گلناز پر طنز کیا کرتی تھی' جس نے ماں کے انتقال کے بعد جاب شروع کر دی تھی۔ تاکہ اپنے اور بھائی کے اخراجات کے لیے کسی پر بوجھ نہ بنے۔ وہ اسکول میں ٹیچر تھی' اور ٹیپو کی پڑھائی مکمل ہونے تک اس کا شادی کا ارادہ نہیں تھا۔ جبکہ ناز اس کی نیت پر شک کرتی اور اس کا برملا اظہار بھی کیا کرتی تھی۔ ٹیپو ایک دو بار ناز کو آگے سے جواب دے چکا تھا۔ عبید یہ بات جانتے تھے کہ ٹیپو نازنین کو پسند نہیں کرتا ہے۔

ابھی انہوں نے اپنے باتھ روم کی کھڑکی کے پاس کھڑے ہوئے ٹیپو کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس کے جھوٹ پر وہ کچھ بول نہیں پائے تھے۔ بس خاموشی سے سر ہلا کر اپنے کمرے کی طرف چل

پڑے۔ اندر آکر انہوں نے نازنین کو آواز دی ' پھر بچوں سے پوچھا۔ رامین اور شاہ زیب ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

"تمہاری ماما کہاں ہیں؟"

"وہ باتھ روم میں ہیں..... نہا رہی ہیں۔" رامین نے بدستور ٹی وی پر نظریں جمائے ہوئے کہا اور عبید یہ سن کر پتھرا گئے تھے۔ انہیں ٹیپو سے اس گھٹیا حرکت کی توقع نہ تھی۔

☆ ☆ ☆

"ہمیں یقین نہیں آتا عبید! ٹیپو ہماری گود میں پلا بڑھا ہے ' گھر کا بچہ ہے۔ وہ ایسی حرکت نہیں کرسکتا ' تمہیں یقیناً "غلط فہمی ہوئی ہے۔"

صبیحہ بیگم چند لمحوں پہلے ہی عبید کو زبردستی کھینچ کر اپنے ساتھ کمرے میں لے کر آئی تھیں۔ مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ برآمدے سے عبید کے چیخنے چلانے کی آواز سن کر وہ دہل گئیں۔ فوراً" اپنے کمرے سے باہر آئیں تو دیکھا ٹیپو عبید کے گھٹنے پکڑے جانے کس بات کی معافی مانگ رہا تھا ' وہ آگے بڑھیں ' ٹیپو روتے ہوئے عبید سے کہہ رہا تھا۔

"بھائی جان! قسم لے لیں ' میں تو بھابھی کے بلانے پر کھڑکی میں کھڑا ان کی بات سن رہا تھا ' انہیں بازار سے دہی منگوانا تھا ' اسی کے لیے پیسے پکڑا رہی تھیں وہ مجھے....."

"بکواس کرتے ہو تم....." عبید نے زوردار ٹھوکر مارتے ہوئے اپنا گھٹنا چھڑانے کی کوشش کی "اگر ایسی بات تھی تو تمہیں جھوٹ بولنے کی ضرورت کیوں پڑی تم نے یہ کیوں کہا کہ پودوں کو پانی دے رہے تھے..... جواب دو؟" وہ زور سے دھاڑے۔

"میں پودوں کو پانی دینے ہی گیا تھا بھائی جان! میں نے جھوٹ نہیں کہا مجھے بھابھی نے منع کیا تھا کہ آپ سے بلکہ کسی سے بھی کچھ نہ کہوں ' وہ آج دوپہر دہی جمانا بھول گئی تھیں اور انہیں خدشہ تھا رات کے کھانے پر رائتے کے لیے دہی نہ ہونے پر سب گھر والے ان سے ناراض ہوں گے..... آپ ان سے پوچھ تو لیں۔"

"انہیں بلاؤ عبید۔" صبیحہ بیگم نے آگے بڑھ کر مداخلت کی "ٹیپو ہمارا خون ہے وہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

"امی بیگم! میں نازنین سے پوچھ چکا ہوں ' اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ ٹیپو کیا کر رہا تھا اور میں نے اسے خود اپنی آنکھوں سے وہاں کھڑکی سے اندر جھانکتے دیکھا تھا۔ اگر ناز کو پیسے پکڑانے ہوتے تو وہ باتھ روم سے کیوں دیتی..... باہر آکر بھی دے سکتی تھی ' یہ جھوٹ بول رہا ہے۔" انہوں نے ٹیپو کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اس کی کسی بات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ صبیحہ بیگم عبید کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کمرے میں لائی تھیں۔ مگر عبید کی غیرت جوش میں آئی ہوئی تھی اس پر والدہ کا ٹیپو کی گھٹیا حرکت پر سرسری سا ردعمل انہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا ' اور پھر انہوں نے اپنا فیصلہ ان کے سامنے رکھ دیا۔

"ابا میاں نے گلناز اور ٹیپو کی کفالت کا ذمہ اٹھایا تھا میں بھی اسے ہر حال میں نبھاؤں گا ' مگر اس سے کہہ دیجیے گا..... جب تک میں یہاں ہوں مجھے اپنی شکل نہ دکھائے۔"

"آئے ہائے یہ خوب کہی ' ایک گھر میں رہنے والے کب تک ایک دوسرے کی شکل نہ دیکھیں گے۔"

"جی..... میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اب ہم اس گھر سے چلے جائیں۔" عبید اچانک اٹھ کھڑے ہوئے "میرا مکان بن رہا ہے اور کچھ عرصے میں ہم وہاں شفٹ ہو جائیں گے ' ٹیپو سے کہہ دیجیے گا مجھ سے اور میرے بیوی بچوں سے دور رہے۔" اتنا کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئے۔

صبیحہ بیگم جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئیں۔ عبید الرحمان کے علیحدہ گھر کی خبر نے انہیں پل میں بوڑھا کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس واقعے کے بعد ٹیپو نے عبید کے سامنے آنا موقوف کر دیا تھا۔ گلناز پھوپھی کی بے عزتی پر بے حد دکھی تھی۔ اس نے اپنا تبادلہ پنڈی کے ایک اسکول میں کروا لیا اور وہ دونوں گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد عبید کو اپنی زیادتی کا احساس اس وقت ہوا جب اتفاق سے انہوں نے ناز کو عالیہ سے فون پر گفتگو کرتے سن لیا۔ اپنی فتح کے نشے میں چور وہ اس منصوبے کی پوری تفصیل سناتی داد وصول کر رہی تھی اور عبید دروازے کی دہلیز پر کھڑے اس حسین عورت کے منہ سے اپنے قبیح فعل کا اعتراف سن کر دم بخود رہ گئے تھے۔ کیا کوئی حد ہے؟ آخر نازنین اپنے مفاد کے لیے کہاں تک جاسکتی ہے؟ کسی پر تہمت لگانا کیا اتنا ہی آسان تھا اس کے لیے..... علیحدہ گھر تو وہ بنوا ہی رہے تھے اس کے لیے..... جلد یا بدیر یہ خواہش پوری ہونے ہی والی تھی..... تو پھر..... کیوں؟ انہوں نے سہارے کے لیے دروازہ تھام لیا۔ روتا بلکتا جوان جہان ٹیپو جیسے ابھی تک ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"وہ میری ماں کی طرح ہیں ' میں ایسا کیسے کرسکتا ہوں عبید بھائی..... میرا بھروسا کریں۔"

نازنین نے باتھ روم کی کھڑکی سے سڑک کے موڑ سے اپنی گلی میں داخل ہوتی عبید کی گاڑی دیکھنے کے بعد پودوں کو پانی دیتے ٹیپو کو پکارا تھا۔ وہ فوارہ ہاتھ سے رکھ کر ان کی بات سننے نزدیک آیا۔ کچھ دنوں سے ناز بے حد مہربانی سے پیش آرہی تھی۔ اس نے اپنی ترش روئی پر باقاعدہ معافی مانگ کر ٹیپو کا دل صاف کر دیا تھا۔ اس کے بعد عبید الرحمان کی زیادتیوں کا سرسری سا تذکرہ کرتے ہوئے وہ ٹیپو کی ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ ٹیپو کھڑکی کے نزدیک آیا تو نازنین نے جالی والا پٹ کھول کر پیسے چوکھٹ پر رکھ دیے اور پٹ دوبارہ بند کرتے ہوئے اس سے فوراً" دہی لا کر دینے کی درخواست کر دی۔ نظریں تو گیٹ کے نزدیک آتی عبید کی گاڑی پر ٹکی تھیں۔ جیسے ہی عبید کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہونے لگی ' ناز ٹیپو کا شکریہ ادا کر کے پیچھے ہٹ گئی۔ ٹیپو کھڑکی کی چوکھٹ سے پیسے اٹھا رہا تھا کہ پچاس پیسے کا سکہ دس روپے کے نوٹ سے پھسل کر جالی میں اٹک گیا۔ اسے اچک کر نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے عبید نے ٹیپو کو دیکھا اور وہی سمجھ بیٹھے جو ناز سمجھانا چاہتی تھی۔ جب ٹیپو پیسے اٹھا کر وہاں سے ہٹ گیا تو ناز نے ٹی وی دیکھتے بچوں سے کہا۔

"جب پاپا آئیں تو بتا دینا کہ مما نہا رہی ہیں۔" اس کے بعد وہ باتھ روم میں آگئی اور دروازہ بند کرکے بالٹی نلکے کے نیچے رکھ دی۔

عبید کو یہ باور کرانا ضروری تھا کہ نازنین کی عزت اس گھر میں محفوظ نہیں اس کے بعد وہ الگ گھر کا مطالبہ کرسکتی تھی۔ مگر یہ نوبت آئی ہی نہیں تھی عبید نے اس سے خود ہی کہہ دیا کہ میں تمہیں جلد نئے گھر میں لے کر چلا جاؤں گا۔ صرف یہی نہیں انہوں نے تو بالکونی کے دروازے کو تالا ڈال کر چابی نازنین کے حوالے کر دی تھی۔ نتیجہ توقعات سے کہیں بڑھ کر حاصل ہوا تھا۔ ناز کے تو خوشی کے مارے پیر زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

شفیق الرحمان واپس آچکے تھے۔ بھائی کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے انہوں نے ٹیپو کے ساتھ ہوئے ظلم کا اعتراف کر لیا۔ عبید میں تو اب ٹیپو کا سامنا کرنے کی ہمت تھی نہیں..... البتہ انہوں نے شفیق الرحمان سے وعدہ لے لیا کہ وہ گلناز اور ٹیپو کو واپس لانے کی پوری کوشش کریں گے ان کے اس گھر سے چلے جانے کے بعد.....

اس رات نازنین کو بہت مارا تھا عبید نے..... رامین نے دیکھا تھا ' ناز فرش پر گری ہوئی سسکیاں لے رہی تھی اور..... اس کے پاپا منہ بھر بھر کے گالیاں دے رہے تھے۔ ناز نے کیا کیا تھا ' اس کم سن بچی کو کبھی معلوم نہیں ہوسکا مگر باپ کو انتہائی خوفناک روپ میں دیکھ کر وہ سہم گئی تھی۔ پہلے پہل شاہ زیب کے کان بھرے جاتے تھے۔ اب اس واقعے کے بعد رامین بھی غمگساروں میں شامل ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"آراستہ محل" پتھر کی تختی پر نستعلیق خط میں کندہ نام۔۔۔ اس کے نئے گھر کی پیشانی پر سجا تھا۔ یہاں وہ بلا شرکت غیرے ہر چیز کی مالک تھی۔ عالیہ تو اپنے شوہر کے ساتھ لندن چلی گئی تھی مگر نازنین کے لیے ترقی کے دروازے وا ہو چکے تھے۔ اب لاہور میں اس کا نام آرٹسٹ کے طور پر اچھی خاصی شہرت پا چکا تھا۔ اس میدان میں جھنڈے گاڑنے کے بعد اس نے دنیائے ادب میں نام کمانے کی تیاری شروع کر دی۔ ایک ناول ماہوار ڈائجسٹ میں چھپ چکا تو دوسرے کی مانگ کی گئی۔ اپنے گھر کے کاموں سے فراغت پا کر وہ لکھنے میں مصروف ہو جاتی۔ ساتھ ساتھ وہ گھر کی سجاوٹ پر بھی توجہ دے رہی تھی۔ اتنے سال فرسٹریشن میں گزارنے کے بعد اب کہیں جا کر سکون کا سانس لینا نصیب ہوا تھا۔ اسے اکثر یہ سوچ کر شدید پچھتاوا ہوا کرتا کہ اتنے عرصے تک وہ عبید اور ان کے گھر والوں کو خوش کرنے کی فضول سی کوشش میں کیوں لگی رہی۔ ورنہ بہت پہلے وہ اپنے گھر میں آچکی ہوتی۔

عبید بحیثیت شوہر جیسے بھی تھے 'ایک باپ کے روپ میں وہ بے حد مختلف انسان ثابت ہوئے تھے۔ اپنی ماں کا گھر چھوڑ دینے کے بعد ان کی ذات پر چڑھا رنگ بھی اترتا جا رہا تھا۔ نازنین کو اپنی ماں کی نظر سے دیکھنے کے بجائے اپنی وہ آنکھوں کا استعمال کر رہے تھے۔

وہ محنتی تھی گھر کو اچھے طریقے سے سنبھالتی تھی' ٹیلینٹڈ تھی' پڑھی لکھی سمجھ دار بھی تھی۔ عبید نے بھلے ہی ناز کے سامنے اس کی خوبیوں کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا دل ناز کی طرف سے صاف ہونے لگا تھا۔ جب ہی نازنین نے اپنے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر لیا۔

☼ ☼ ☼

"دنیا میں کوئی اور جگہ نہیں ملی انہیں جو ہمارے سروں پر آکر بیٹھنے کا شوق ہو رہا ہے؟"

ناز نے جب سے یہ خبر سنی تھی' وہ غصہ سے بے قابو ہو رہی تھی۔ شام کو عبید کے گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے جھگڑا شروع کر دیا۔ عبید کو اس لمحے پر افسوس تھا جب انہوں نے اسے بتایا تھا کہ ان کے گھر کی لین میں ذرا سا آگے ایک بنگلہ بک رہا ہے جسے شفیق الرحمان خریدنا چاہ رہے ہیں۔ اس کے بعد صبیحہ بیگم شفیق الرحمان اور ان کی فیملی کے ساتھ ساتھ یہیں بھی یہیں قریب آجائے گا۔ گلناز کی شادی ہو گئی تھی اور وہ اسلام آباد میں اپنے شوہر کے ساتھ مقیم تھی' صبیحہ کو شفیق الرحمان منا کر واپس لے آئے تھے۔

"جواب کیوں نہیں دیتے۔۔۔ بولتے کیوں نہیں ۔۔۔ میں کیا پوچھ رہی ہوں؟" وہ پہلے سے زیادہ بگڑ گئی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا نازنین ۔۔۔ تمہاری تربیت کس ڈھب پر ہوئی ہے۔۔۔ نہ بات کرنے کی تمیز ۔۔۔ نہ بڑوں کا لحاظ ۔۔۔ نہ موقع محل دیکھنا ۔۔۔ بس شروع ہو جاتی ہو' ابھی آفس سے اتنا تھک کر آیا ہوں تم نے ایک گلاس پانی نہیں پوچھا اور تفتیش کرنے لگیں۔۔۔ آرام سے بیٹھ کر بھی تو بات ہو سکتی ہے۔"

"نہیں ہو سکتی آرام سے بات۔۔۔ سمجھے آپ۔" وہ باقاعدہ چیخ کر جواب دے رہی تھی۔ اسے عبید کے نرم لہجے میں خود پر کیے جانے والا تبصرہ مخمل میں لپٹا جوتا محسوس ہوا تھا۔ "ہونہہ ماں بیٹے کی ایک ہی عادت ہے' گھما پھرا کر میری ذات میں کیڑے نکالنے بیٹھ جاتے ہیں۔ میری تربیت جیسی بھی ہوئی ہو' کبھی اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھا ہے' جھوٹ' منافقت خون میں رچ بس گئی ہے آپ کے۔"

"نازنین! زیادہ زبان چلانے کی ضرورت نہیں ہے ۔۔۔ مجھے غصہ مت دلاؤ۔" "نہیں تو۔" عبید تلملا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ناز نے ان کی بات مکمل نہیں ہونے دی۔

"نہیں تو کیا؟ ہاں؟ کیا کریں گے؟ ہاتھ اٹھائیں گے مار یں گے۔" ان کے جھگڑے کی آواز سن کر شاہ زیب اور رامین کمرے سے باہر نکل آئے' عبید نے ایک نظر بچوں کی طرف دیکھا' پریشان اور خوف زدہ بچے' ماں باپ کو دوبدو ہوتے دیکھ کر بہت گھبرا گئے تھے' عبید نے ان سے واپس کمرے میں جانے کے لیے کہا تو ناز نے روک دیا۔

"کہیں نہیں جائیں گے یہ۔ ان کے سامنے بات کریں نا ۔۔۔ انہیں بھی پتا چلے اپنے باپ کی حرکتوں کا۔"

شاہ زیب چلتا ہوا ان دونوں کے نزدیک آکھڑا ہوا "کیا ہوا ماما ۔۔۔؟ پاپا آپ سے جھگڑا کیوں کر رہے ہیں؟" عبید یہ سن کر چکرا گئے' بیٹے کو ماں کے بجائے باپ قصوروار نظر آرہا تھا۔

"نہیں بیٹا! میں جھگڑا نہیں کر رہا ۔۔۔ تمہاری ماں بلاوجہ چیخ چلا رہی ہیں ۔۔۔ میں تو آرام سے بات کر رہا تھا۔"

"آپ نے مجھے مجبور کیا ہے چیخنے پر ۔۔۔ جب میں آرام سے کچھ کہتی ہوں' آپ سنتے ہی نہیں ۔۔۔" ناز بیٹے کی حمایت پا کر اور مظلوم بن گئی تھی۔

"پاپا آپ بیٹھ کر ماما کی بات سنیں ۔۔۔" عبید بادل نخواستہ واپس صوفے پر بیٹھ گئے' نازنین کو بھی شاہ زیب نے ان کے سامنے بٹھایا۔ وہ چھوٹا سا لڑکا' جسے دو پختہ عمر انسانوں نے اپنے جھگڑے کی ثالثی کے لیے منتخب کیا تھا۔ پوری دیانت داری سے ان دونوں کی شکایات سن کر ننھے منے حل پیش کرتا رہا۔

وہ بوجھ دو نا اہل انسانوں نے اس کے نازک کندھوں پر زبردستی دھر دیا جسے خود اٹھانے کی سکت ان میں نہیں تھی۔ اس بوجھ نے کمسن انسان کو کیسے توڑا پھوڑا' یہ جاننے کا تردد بھی نہیں کیا۔ بس ہر گزرتے دن کے ساتھ اس بوجھ میں اضافہ کرتے گئے۔ انتہائی بے رحمی کے ساتھ۔۔۔

☼ ☼ ☼

اس کی یادداشت کے پہلے صفحہ پر اپنی ماں کا سکھایا جو پہلا سبق تحریر ہوا اس کا عنوان بدظنی تھا۔ کتاب شعور کا آغاز ہی اس متن سے ہوا' اس سے پہلے نہ کوئی پس منظر تھا نہ پیش لفظ۔

"پھر شہزادی کو اس جادوگرنی نے قید کر لیا ۔۔۔"

نازنین کی آواز ۔۔۔ ایک کہانی سناتے ہوئے ۔۔۔ اور بہت ساری آوازیں بھی تھیں۔ اسے اپنی آواز سنائی دی اور منظر صاف ہوتے چلے گئے۔

"جادوگرنی کیا ہوتی ہے؟" چار سال کی رامین نے ماں سے سوال کر ڈالا۔

"جادوگرنی ۔۔۔ وہ جادو کرتی ہے ۔۔۔ خون پیتی ہے ۔۔۔ لوگوں کو تنگ کرتی ہے تو وہ روتے ہیں ۔۔۔" نازنین سادہ الفاظ میں اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی' اس کا معصوم ذہن سوچ میں پڑ گیا "کیسی شکل ہوتی ہے اس جادوگرنی کی؟"

"تمہاری دادی جیسی ۔۔۔" تنفر بھرا جواب ملا تو وہ حیرانی سے ناز کی صورت دیکھنے لگی۔ دادی بیگم کا نام لیتے ہی ناز کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ اسے یکدم اپنی ماں سے ہی خوف محسوس ہونے لگا۔ وہ چپ چاپ پوری کہانی سنے بغیر ہی وہاں سے ہٹ گئی۔

شام کو جب وہ دادی کے کمرے کے سامنے سے گزر کر صحن میں جانے لگی تو بہت ڈر رہی تھی۔ صبیحہ بیگم اپنا چاندی کا پاندان سامنے رکھے' سروتے سے چھالیہ کتر رہی تھیں۔ ان کی نظر رامین پر پڑی تو وہ جہاں کی تہاں رک گئی۔ اس کی بھولی صورت اور خوف سے پھٹی آنکھیں دیکھ کر وہ بے اختیار مسکرا دیں اور پچکار کر اپنے پاس بلایا "وہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟ یہاں ہمارے پاس آکر بیٹھو۔۔۔"

رامین سمٹ کر ستون کی آڑ میں ہو گئی ۔۔۔ اس کا ننھا سا دل سوکھے پتے کی طرح کانپنے لگا "یہ مجھے بھی پکڑ کر بند کر دیں گی۔" ابھی وہ بھاگنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ صبیحہ بیگم نے پیچھے سے اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے لے کر اپنے کمرے میں مسہری پر بٹھاتے ہوئی بولیں "چلو بیٹھو یہاں ..... ورنہ ہم تمہارے پاپا سے شکایت کر دیں گے کہ تم ہمارا کہا نہیں مانتی ہو۔" اس دھمکی کو سنتے ہی رامین فوراً مسہری پر بیٹھ گئی۔ اسے اپنے پاپا کے غصے سے بے حد خوف آتا تھا۔

"اس گھر کے سب چھوٹے بڑے صبح صبح ہمیں سلام کرنے آتے ہیں' مگر تم نہیں آتیں ۔۔۔ بھلا کیوں؟"

"وہ ۔۔۔ وہ۔" رامین کو شروع سے ہی دادی کا رعب داب ان کے نزدیک نہیں جانے دیتا تھا۔ اب جو ماں نے صبیحہ بیگم کو جادوگرنی کا خطاب دیا تو وہ بری طرح خوف زدہ تھی۔ ان کے استفسار پر اٹک اٹک کر بالآخر اس نے کہہ ہی دیا "مجھے آپ سے ڈر لگتا ہے!"

"ہم سے؟" صبیحہ کو اس کی سہمی صورت نے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ "ارے ہم سے کیوں ڈرتی ہو بولو۔" پان کی پیک اب دانتوں اور ہونٹوں کو رنگنے لگی تھی۔ جسے دیکھ کر رامین کے اوسان خطا ہو گئے۔ یہ تو سچ مچ کی جادوگرنی ہیں، شہزادی کا خون پی لیا، مجھے بھی ماریں گی۔

"کہو ۔۔۔ کیوں ڈر لگتا ہے تمہیں ہم سے؟" ہنستے ہوئے دادی نے پھر سے پوچھا۔ رامین اپنا تھوک نگل کر بمشکل بولنے کے قابل ہوئی۔

"آپ جادوگرنی ہیں نا......"

اور صبیحہ بیگم اچھل پڑیں۔ "اوئی اللہ...... کیا کہا؟ ہم جادوگرنی؟ کس نے کہا تم سے ۔۔۔ تمہاری ماں نے؟" دادی کا غصہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ رامین اٹھ کر بھاگنے لگی تو انہوں نے نہایت سختی سے اسے پکڑ کر دوبارہ بٹھا لیا۔

رامین نے روتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "جی ...... ماما نے کہا تھا" صبیحہ بیگم نے اس کے بازو چھوڑ دیے اور ہاتھ نچا کر زہر خند لہجے میں کہا "ارے وہ تو خود جادوگرنی ہے ہمارے بیٹے کو چھین لیا ہم سے..... اب ہمارے بچوں کو بھڑکائے گی ہمارے خلاف ..... آج آنے دو اپنے پاپا کو ۔۔۔ سیدھا کرواتے ہیں تمہاری ماں کو۔"

رامین روتی ہوئی وہاں سے بھاگ آئی۔

مگر وہ سزا اس کی ماں کے ساتھ ساتھ اسے بھی ہمیشہ یاد رہی۔

☆ ☆ ☆

اس کے پاپا سخت غصے میں گالیاں دے رہے تھے اور ماما فرش پر اوندھی پڑی سسکیاں لے رہی تھیں۔ کانچ کی ٹوٹی ہوئی بوتلیں اور گلاس ان کے آس پاس بکھرے ہوئے تھے۔ اب تک وہ پاپا کی خاموش خفگی سے خوف کھاتی آئی تھی۔ انہیں یوں چیختے چلاتے اور ماں پر تشدد کرتے دیکھ کر اس کا دل بری طرح سہم گیا تھا۔

جب سے اس نے ہوش سنبھالنا شروع کیا اپنے گھر اور قریبی رشتوں میں تلخیوں اور بدگمانیوں کے سوا کچھ نہیں دیکھا تھا۔ یونہی کبھی وہ اپنی گڑیا سے کھیلنے میں مگن ہوتی تو یکایک اس کے پاؤں کے پاس چٹنی کی پیالی زور سے آگرتی، جو اس کے پاپا کے کھانے کی ٹرے میں موجود ہوتی تھی اور پاپا غصے سے چلاتے ہوئے کھانا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل جاتے۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آجاتا، وہ سہمی چڑیا کی طرح ادھر ادھر دیکھتی تو اسے اپنی ماما نظر آتیں۔ وہ ان کا چہرہ غور سے دیکھنے لگتی کہ اس کی طرح شاید ماما بھی پاپا کے غصے سے خوف زدہ ہوں گی مگر نہیں، اس کی ماں کے چہرے پر اطمینان ہوتا تھا، تمسخر اور طنز بھری نگاہوں سے وہ پیر پٹخ کر جاتے ہوئے عبید کو دیکھ رہی ہوتی تھیں ۔۔۔ جیسے فاتح، مفتوح کو دیکھتا ہے۔

اکثر وہ ہوم ورک کرتے ہوئے اپنی ماں کو کسی سے فون پہ بات کرتے سنتی، مخاطب کوئی سہیلی عالیہ، طیبہ خالہ یا پھر کوئی اور لیکن گفتگو ایک ہی قسم کی ہوتی تھی۔ ساس کی برائیاں، عبید کو برا بھلا ۔۔۔ رامین کو ہر دوسرے بچے کی طرح اپنی ماں سے محبت تھی جس کی نظر میں ماں کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتی۔ اسے صرف اپنی ماں سے ہمدردی تھی اور صرف ان ہی سے محبت ۔۔۔ لیکن یہ جذبہ نئے گھر میں آنے کے بعد عجب طریقے سے ماند پڑنے لگا۔

اس کی کتاب شعور میں تیسرا سبق بہ عنوان "الجھن" تحریر ہوا۔

☆ ☆ ☆

نیا گھر اسے بہت پسند آیا تھا۔ بے حد کشادہ کمرے اور بڑی بڑی کھڑکیاں۔ سورج کی روشنی ہر طرف سے گھر میں داخل ہو رہی تھی۔ گھر کے چاروں طرف سر سبز لان تھا۔ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد تین کمرے اوپر کی منزل پر تھے۔ وہ ہنستی کھیلتی یہاں سے وہاں بھاگنے لگی۔ گیٹ کے باہر سڑک کے ساتھ سفیدے کے اونچے درختوں کی لمبی قطار نہر کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

کچھ مزدور ابھی تک کام میں مصروف تھے۔ کسی کمرے کا پینٹ باقی تھا تو کہیں ترکھان لکڑی کی الماری بنا رہے تھے۔ پاپا تو صبح ہی صبح کام پر چلے جاتے تھے۔ سارا دن نازان کاریگروں کی نگرانی کیا کرتی۔ ابھی تک کسی ملازمہ کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ ماما ہی سب کو چائے بنا کر دیتی۔ کبھی تو خود لے جاتی اور کبھی اس کے ہاتھ بھجوایا کرتی۔

اکثر مزدوروں کے کام کا جائزہ لیتی نازان کے ساتھ وہیں رکھے کسی اسٹول پر بیٹھ جاتی۔ کام سمجھاتے ہوئے پتا بھی نہ چلتا اور کچھ ہی دیر میں بلا تکلف گفتگو اور ہنسی مذاق شروع ہو جاتا۔ رامین کبھی آتے جاتے کسی لطیفے کا آخری حصہ سن کر رکتی اور ماما کے بلند و بانگ قہقہے اسے کچھ حیران سا کر دیتے۔

ان میں ایک ترکھان جو روز کی دیہاڑی پر کام کر رہا تھا اور زیادہ تر ناز کی فرمائشی اشیا بنا کر دیتا تھا۔ ناز نے اس کاریگر سے اپنے لیے جیولری باکس، سوئی ڈورے کا ڈبہ اور جانے کیا کچھ ایک میگزین میں سے ڈیزائن پسند کر کے بنوایا تھا۔ رامین کو خود بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اس کے پیار کرنے سے وہ الجھن کیوں محسوس کرتی ہے۔ بھلا پیار کرنے میں کیا برائی ہے۔ اکثر لوگ بچوں کو پیار کیا ہی کرتے ہیں۔ لیکن رامین کو ٹھیک نہیں لگتا تھا۔ اس لیے وہ مزدوروں کو چائے دینے سے کترانے لگی۔ ناز جب اسے آواز دیتی کہ "جاؤ، انہیں چائے دے آؤ ۔۔۔" تو وہ ان سنی کر کے کھیل میں مگن رہتی۔ چائے پڑے پڑے ٹھنڈی ہو جاتی اور ناز خفا ہوتی۔ ایک آدھ بار اسے ناز سے مار بھی کھانی پڑی۔ نازنین کی نافرمانی کا آغاز اس نے اسی حرکت سے کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

عبید انارکلی کا پورا بازار چھاننے کے بعد اسے لبرٹی مارکیٹ لے کر جا رہے تھے۔ وہ خود ڈرائیو کر رہے تھے۔ رامین نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے اپنے پاپا کو بار بار کھانستے ہوئے سنا۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اسے حد درجہ شرمندگی ہونے لگی۔ وہ پاپا سے ہمیشہ دور دور رہا کرتی تھی۔ اسے باپ سے متنفر کرنے میں نازنین کا ہاتھ تھا۔ اپنی بیوی اور بچوں کو تمام آسائشیں فراہم کرنے کے باوجود ان کی تمام ضروریات احسن طریقے سے پوری کرنے کے بعد بھی رامین کے دل میں باپ کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔ اس نے ماں کو ہمیشہ شکوہ کرتے سنا تھا۔ لیکن آج اسے خود احساس ہو رہا تھا کہ پاپا اس سے کتنی محبت کرتے ہیں۔

شام کو وہ اپنی ماما سے نئے کپڑوں کی فرمائش کر رہی تھی۔ اگلے دن اس کا برتھ ڈے تھا اور اسے اسکول میں کلرڈ لباس پہننے کی اجازت تھی۔ نازنین نے پہلے سے ہی اس کے لیے ایک سلور میکسی خرید رکھی تھی اور وہ چاہتی تھیں کہ اس موقع پر رامین یہی ڈریس پہنے وہ میکسی بہت خوب صورت تھی لیکن رامین کو اعتراض اس کے سلیولیس ہونے پر ہوا۔ وہ دس سال کی ہو رہی تھی اور شرم کا احساس غالب تھا۔ اس نے میکسی پہننے سے انکار کر دیا۔ نازنین نے غصے میں ڈریس اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"اگر تمہیں یہ ڈریس نہیں چاہیے تو کل یونیفارم ہی پہن لینا۔" نازنین نے صاف لفظوں میں انکار کر دیا تو وہ رونے لگی۔

عبید نے گھر میں داخل ہوتے ماں بیٹی کی بحث سن لی تھی۔ وہ کمرے میں آئے پہلے نازنین کے لائے ہوئے ڈریس کو دیکھا پھر اسے سمجھانے لگے "اگر یہ نہیں پہننا چاہتی تو کوئی شلوار قمیص دلا دو۔" نازنین عبید کو رامین کی حمایت کرتے دیکھ کر اور ناراض ہو گئی۔

"آپ بھی عجیب ہیں بجائے اپنی بیٹی کو سمجھانے

کے کہ میری بات مانے الٹا مجھ ہی سے کہہ رہے ہیں اس کی ضد پوری کروں۔"

"مجھے بھی یہ کپڑے ٹھیک نہیں لگ رہے ہیں۔ میں نہیں چاہتا میری بیٹی اس قسم کے بے ہودہ کپڑے پہنے۔"

"آپ صرف یہ چاہتے ہیں کہ وہ میری کوئی بات نہ سنے۔" ناز اور عبید کا جھگڑا شروع ہو گیا تھا۔

"میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا..... اسے جیسا ڈریس چاہیے میں دلواؤں گا....." وہ رامین کو اپنے ساتھ لے کر اکیلے بازار آ گئے۔

عبید جلدی گھر اس لیے آئے تھے اس روز ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور وہ آرام کرنا چاہ رہے تھے۔ لیکن اس وقت اسے مختلف دکانوں پر ہر ڈریس دکھا کر اس کی پسند پوچھ رہے تھے اس کا دل ماں کی خفگی سے پریشان تھا۔ ناز کی ناراضی بہت دیر تک رہا کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی اب ماما اس کا منتخب کردہ لباس ہرگز پسند نہیں آئے گا۔ اس کی برتھ ڈے والے دن بھی وہ اسے پیار نہیں کریں گی..... یہی اندیشے 'اسے کوئی فیصلہ نہیں کرنے دے رہے تھے۔

لبرٹی مارکیٹ میں قطار در قطار بوتیکس کا چکر لگاتے اس نے یکدم اپنے پاپا کا ہاتھ پکڑ کر انہیں روک لیا "گھر چلیں پاپا....."

"کیوں؟ ابھی تو تم نے کچھ لیا ہی نہیں....." وہ تھوڑا سا جھک کر بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"کوئی بات نہیں پاپا..... میں اپنے پرانے کپڑے پہن لوں گی۔" رامین کی آواز بھیگ گئی۔ عبید کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ابھی رونا شروع کر دے گی۔

"کیا ہوا رامین؟ مجھے بتاؤ..... تم کیا خریدنا چاہتی ہو..... میں تمہیں دلواؤں گا....." ان کے پیار سے سر پر ہاتھ رکھتے ہی وہ رو دی۔

"نہیں پاپا..... مجھے کچھ نہیں لینا..... گھر چلیں۔" وہ گھر جانے کے علاوہ نہ کوئی بات کر رہی تھی نہ سن رہی تھی۔ مجبوراً عبید اسے لے کر پارکنگ کی طرف چل پڑے۔

راستے بھر وہ پاپا سے چھپ کر روتی رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

وہ اپنی ماں سے مختلف تھی۔ بہت زیادہ مختلف! اور اس بات کا احساس پہلے رامین کو ہی ہوا تھا۔

اس ڈریس والے واقعے کے بعد آج دوسری بار وہ اپنے والدین کو اپنی وجہ سے لڑتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر ہوئی کہ رامین گیٹ سے باہر کوڑے دان رکھ کر اندر آئی تھی۔ جب وہ باہر تھی اس نے پاپا کو اپنے دوست کے ساتھ گاڑی میں گھر کے پاس سے گزرتے دیکھا تھا۔ اسے گھر سے باہر یوں کھڑا دیکھ کر عبید کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات ہرگز خوشگوار نہیں تھے۔ وہ جو اپنے دوست کے ساتھ ہنستے مسکراتے کوئی بات کر رہے تھے یکدم ہی مسکرانا بھول کر اسے دیکھنے لگے تھے۔ وہ فوراً ہی گھر میں واپس آ گئی۔ کچھ دیر بعد ہی عبید دھاڑتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ رامین خوف زدہ ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

"کیوں بھیجا تم نے بچی کو گیٹ سے باہر۔ کتنی بار منع کیا ہے میں نے رامین سے گھر کا کوئی کام مت کروایا کرو۔ راشد بھی پوچھ رہا تھا کہ آپ کے گھر میں بچیوں سے ایسے کام لیے جاتے ہیں؟ ہر جگہ تمہاری وجہ سے بے عزتی ہوتی ہے میری۔" نازنین ان کی بات کاٹ کر خود بھی چلاتے ہوئے بولی۔

"ذرا سا آپ کی لاڈلی کو کام کہہ دیا تو میری جان کو آ گئے۔ صفائی والی چلی گئی۔ ایک ہفتے سے گھر کا سارا کام میں خود کر رہی ہوں۔ میرا احساس نہیں ہے آپ کو۔"

"بکواس بند کرو!" نازنین کے جواب نے ان کا غصہ ساتویں آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ "گھر کا کام تم اپنے شوق سے کرتی ہو۔ میں نے تم سے کبھی ایسی کوئی ڈیمانڈ نہیں کی۔ اتنے نوکر رکھوا چکا ہوں۔ کوئی تمہیں چور لگتا ہے۔ کسی کا کام پسند نہیں۔ غریب نوکروں کو گالیاں دیتی ہو تمہیں شرم نہیں آتی؟ تم کسی کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں کر سکتیں۔ نہ کوئی تمہارے

ساتھ گزارا کر سکتا ہے۔"

عبید نے طیش میں آ کر سامنے پڑی کرسی کو لات ماری اور گھر سے باہر نکل گئے۔ رامین جو اب تک خاموشی سے ان کا جھگڑا دیکھ رہی تھی 'عبید کو جاتے دیکھ کر سمجھ گئی کہ آج رات وہ پھر دیر سے گھر واپس آئیں گے۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر ماں کی طرف دیکھا جو پہلے ہی کینہ توز نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"چین مل گیا لڑائی کروا کر۔ بڑی مظلوم بنتی ہے باپ کے سامنے۔ ایک ذرا سا کام کرتے موت پڑ رہی تھی تجھے۔ کمینی کہیں کی۔ شکایت لگاتی ہے باپ سے ماں کی۔"

اس کی ماں کے الفاظ زہر میں بجھے تیر تھے۔ وہ کچھ بول نہیں پائی۔ اسے شاک لگا تھا یہ جان کر کہ ماما اس سے یوں بدگمان ہو رہی تھیں۔ لیکن اب اکثر ایسا ہونے لگا۔

جب بھی عبید گھر میں داخل ہوتے ناز رامین کو آواز دے کر بلاتی اور کوئی کام سونپ دیتی۔ نجانے وہ عبید کو چڑانے کے لیے ایسا کرتی تھی یا واقعی اسے رامین کی مدد کی ضرورت پڑنے لگی تھی۔ ماما ناراض نہ ہوں اسی لیے وہ پوری کوشش سے اس کام کو بہترین طریقے سے کرنے کی کوشش کرتی۔ عبید کبھی ٹوکتے اور کبھی خاموشی سے دیکھتے رہتے اور پھر اٹھ کر اوپر اسٹڈی میں جا بیٹھتے۔ ادھر آہستہ آہستہ ہر کام رامین کی ذمہ داری بنتا چلا گیا۔

اس کی پڑھائی متاثر ہو رہی تھی۔ لیکن اس کے لیے اپنی ماں کی خوشنودی زیادہ اہم تھی۔ وہ اپنی ماں کا دل جیتنا چاہتی تھی۔

ناز نے گھر کے کاموں میں دلچسپی لینا بند کر دیا تھا' تھوڑا بہت مارے باندھے کرتی اور باقی رامین سے کہہ دیتی۔ وہ ناز کے بتائے کام کرتی جاتی اور فارغ ہو کر اس کے پاس آ کر کھڑی ہو جاتی کہ شاید وہ اسے شاباش یا شکریہ کے دو لفظ کہے۔ پر ناز نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ وہ یا تو کوئی اگلا کام اس کے سپرد کر دیتی یا پھر چھٹی دے دیتی۔ شاید رامین کی حیثیت ایک ملازمہ سے زیادہ تھی بھی نہیں۔

نازنین نے گھر کے تمام کاموں سے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ وہ صرف اپنی ذات کی ہو کر رہ گئی تھی۔ اپنی پینٹنگز کی نمائش کی تیاری میں دن رات مصروف' کبھی wood Carving تو کبھی ڈریس ڈیزائننگ۔ اور کبھی مہینوں صرف لکھتی رہتی تھی۔ اس کے باوجود وہ خوش نہیں تھی۔ رامین اب سوچنے سمجھنے لگی تھی۔ بظاہر اسے کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی جس کی بنیاد پر ناز عبید سے جھگڑا کرتی۔ جن ساس نندوں سے اسے مسئلہ تھا وہ لوگ اس سے سیدھے منہ بات کرنے کے روادار نہ تھے۔ نہ یہ ادھر جاتی نہ وہ لوگ آتے تھے۔ عبید ہی جہاں تک ہو سکے ادھر کا چکر لگا آتے تھے۔

گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ نہ کھانے پینے کی تنگی' نہ پیسوں کی پریشانی اور نہ ہی نازنین پر کسی قسم کی کوئی پابندی تھی۔ نت نئی فرمائشیں' گھومنا پھرنا سب کچھ تھا' مگر سکون میسر نہیں تھا۔ پتا نہیں ناز کو زندگی سے اور کیا چاہیے تھا۔

ایک دن نازنین کو کسی مشاعرے میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ اپنی دوسری کتاب کی تقریب رونمائی میں اس نے ایک غزل پڑھی تھی جسے بہت پسند کیا گیا تھا۔ عبید شہر سے باہر کسی کام کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔

وہ رامین کو ساتھ لے کر جا رہی تھی' پہلی بار! اور یہ آخری بار بھی ثابت ہوا تھا۔

اس دن وہ ایک بہت سنگین غلطی کر بیٹھی' اور نازنین کے گمان کو سچ ثابت کر دیا۔

"پاپا۔ آج شام ہم ایک مشاعرے میں گئے تھے۔" رامین بہت ایکسائیٹڈ ہو کر عبید کو ہونے والے مشاعرے کی روداد سنا رہی تھی۔ اس نے محسوس نہیں کیا کہ پاپا نے کھانے سے ہاتھ روک لیا ہے اور وہ لب بھینچے کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے غصے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نازنین اپنے کمرے میں تھی اور وہ دونوں میز پر کھانا کھا رہے تھے۔

www.paksociety.com

"وہاں ایک انکل ماما کی اتنی تعریف کیے جارہے تھے کہہ رہے تھے ' آپ تو خود غزل ہیں۔ میں آپ کے لیے شعر کہنا چاہتا ہوں۔" رامین بصرہ من و عن بیان کررہی تھی۔

"کیا پہنا تھا تمہاری ماں نے؟" عبید نے بالکل غیر متعلقہ سوال پوچھا تھا۔ رامین نے چونک کر ان کی طرف دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ شاید اسے باپ سے یہ سب باتیں نہیں کہنی چاہیے تھیں۔ عبید نے ایک بار پھر وہی سوال دہرایا تو وہ بتانے پر مجبور ہوگئی۔

"ریڈ ساڑھی۔" اس نے منمناتے ہوئے کہا' عبید یہ سن کر فورا" ہی کرسی دھکیل کر کھڑے ہوگئے۔

"میں نے تمہیں منع کیا تھا' تم مجھ سے پوچھے بغیر گھر سے باہر قدم نہیں نکالوگی۔ کیوں گئی تھیں تم اس مشاعرے میں؟"

"کس نے بتایا آپ کو۔ رامین نے؟"

"تم میرے سوال کا جواب دو۔ کیوں گئی تھیں میری اجازت کے بغیر؟" عبید زور سے چلائے۔

"آپ شہر میں تھے ہی نہیں۔ کیسے پوچھتی میں؟ اور اگر چلی گئی تو کون سی قیامت آگئی۔ اچھے پڑھے لکھے شریف لوگ آئے تھے وہاں۔ آپ کے دوستوں کی طرح نہیں۔ جو بھابھی بھابھی کہہ کر میری گردن میں ہاتھ ڈال کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔"

"وہ شریف لوگ تمہیں اپنے روبرو بٹھا کر تم پر غزل کہنا چاہتے تھے۔ تمہیں احساس نہیں ہوا کہ وہ پڑھے لکھے جاہل تمہیں سر سے پاؤں تک ناپ رہے تھے۔ اور اتنے بے ہودہ لباس میں تم ان مردوں کے بیچ بیٹھی شاعری بگھار رہی تھیں۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔"

عبید پہلے بھی کئی بار نازنین کو وہ ساڑھی پہننے سے منع کرچکے تھے۔ وہ ایک نہایت مہین اور باریک شیفون کی ساڑھی تھی۔ جس کا بلاؤز سلیولیس اور لونیک تھا۔

"آپ کو تکلیف اس بات سے نہیں کہ میں آپ سے پوچھے بغیر گئی تھی یا پھر ریڈ ساڑھی میں کیوں گئی تھی۔ آپ کا مسئلہ دراصل یہ ہے کہ جس عورت کو آپ پاؤں کی جوتی سمجھتے رہے اسے دنیا سر آنکھوں پر کیوں بٹھا رہی ہے۔ آپ اور آپ کا خاندان مجھے طعنہ دیا کرتا تھا کہ مجھے گفتگو کا سلیقہ نہیں' بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔ آج جب لوگ میرے ایک ایک حرف پر داد دیتے ہیں تو آپ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

"وہ لوگ تمہارے کام کو نہیں۔ تمہاری خوبصورتی کو سراہتے ہیں۔"

"میں کوئی ماڈل نہیں ہوں۔ ریمپ پر اٹھلاتی اپنے حسن کی نمائش نہیں کررہی۔ میں رائٹر ہوں' شاعرہ ہوں اور اسی حیثیت سے لوگ مجھے جانتے ہیں' میری عزت کرتے ہیں۔"

"جو بھی ہے۔ آج کے بعد تم کسی مشاعرے میں نہیں جاؤگی۔" عبید نے اپنا حکم سنایا۔ وہ قطعی الفاظ میں اپنا فیصلہ سنا کر وہاں سے ہٹ گئے تھے۔ اور نازنین کا سارا غصہ' جھنجلاہٹ اور برہمی رامین کی طرف منتقل ہوگئی۔ اس وقت تو دل کی بھڑاس نہیں نکال سکی تھی عبید گھر میں ہی موجود تھے۔ لیکن اگلی صبح عبید کے گھر سے نکلتے ہی وہ رامین کے کمرے میں پہنچ گئی اور سوتی ہوئی رامین کو لکڑی کے وائپر سے پیٹنا شروع کردیا۔

نیند میں غرق رامین اس اچانک افتاد سے گھبراگئی۔ وہ اپنے آپ کو سنبھال ہی نہ پائی۔ ناز اسے لکڑی کے وائپر سے مارے جارہی تھیں۔

آج بھی اس کی ناک کی ابھری ہوئی ہڈی پر اس ضرب کا ہلکا سا نشان موجود تھا اور کانوں میں ماما کے الفاظ کی بازگشت۔

"کتنے پیسے دیتا ہے تمہارا باپ میری جاسوسی کرنے کے۔ بول رامین۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی پہلے تیری دادی' پھپھو اور اب تو۔ سب مل کر مجھے پاگل کرنا چاہتے ہو؟ لے مزا چکھ اب! بتاتی ہوں تجھے اچھی طرح۔"

اس کے ساتھ گالیوں کوسنوں اور بددعاؤں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ اسے لگتا تھا وہ اپنی ماما سے مختلف ہے شاید اس لیے وہ اسے انڈر اسٹینڈ نہیں کرپاتیں۔ اور خفا ہوجاتی ہیں۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ نازنین ... دراصل اسے بالکل اپنے جیسا ہی سمجھ رہی ہے۔ اسی لیے بدگمان رہتی تھی اور صفائی کا کوئی موقع دیے بغیر ہی سزا دے ڈالتی تھی۔ ناز اپنی بیٹی کو اپنا عکس سمجھ کر برتاؤ کررہی تھی اور رامین ماں کے برعکس اپنی ذات کے اندھیرے غار میں سمٹتی جارہی تھی۔

وہ نشان عبید کی نظروں سے چھپا نہیں رہ سکا تھا۔ انہوں نے رامین سے پوچھا "یہ نشان کیسا ہے؟" وہ سر جھکا کر آہستہ آواز میں یہ کہتی ہوئی ان کے سامنے سے ہٹ گئی۔

"ماما نے مارا تھا۔" عبید نے نازنین سے بھی پوچھا تو اس نے کہا۔ "رامین بہت بدتمیزی کرتی ہے۔ آگے سے جواب دے رہی تھی' اسی لیے مارا ہے میں نے ..." وہ جو بھی کہتی عبید کو یقین نہیں ہورہا تھا۔ عبید کو رامین کی فکر رہنے لگی تھی۔ ناز کو سمجھانے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آرہا تھا۔ عبید اس صورت حال سے پریشان ہورہے تھے۔ بچے بڑے ہورہے تھے۔ آگے ان کا مستقبل دیکھنا تھا۔ رامین کی شادی کرنی تھی۔ کسی ایک کو تو کمپرومائز کرنا پڑے گا۔ نازنین تو ہرگز جھکنے کے لیے تیار نہ تھی۔

اس واقعہ کے بعد رامین نے اپنے پاپا میں بدلاؤ محسوس کیا۔ اب وہ حتی الامکان ناز کے ساتھ الجھنے سے پرہیز کرتے تھے۔ کبھی ناز کی طرف سے پیسے اور زیور کی فرمائش ہوتی تو فورا" پوری کردیتے۔ اپنی طرف سے وہ پوری کوشش کرنے لگے تھے کہ گھر کا ماحول خراب نہ ہو۔

ناز اتنی بے وقوف نہیں تھی کہ سمجھ نہ سکتی' عبید رامین کی وجہ سے بلیک میل ہورہے ہیں۔ ناز کے ہاتھ شطرنج کا وہ مہرہ لگ چکا تھا جس کی مدد سے بادشاہ کو زیر کیا جاسکتا تھا۔

عبید اس کا بہت خیال رکھنے لگے۔ ان کے سلوک نے ناز کے اس شک کو مزید تقویت بخشی کہ وہ اس کی جاسوسی کے لیے رامین کو استعمال کرتے ہیں۔ رامین اس کے بے وجہ غصے کا نشانہ بننے لگی۔ ذرا سی غلطی پر وہ اسے روئی کی طرح دھنک کے رکھ دیتی۔ اس کے آنسو' رونا چیخنا اسے تسکین پہنچاتا تھا۔ اس کے معمولات ویسے کے ویسے ہی تھے۔ وہ اب بھی اکثر مشاعروں میں جایا کرتی تھی۔ لیکن تنہا!

☆ ☆ ☆

اسی طرح کا ایک دن تھا۔ رامین اسکول سے واپس آئی تو ڈرائیور نازنین کو لے کر نکلنے لگا۔ وہ کپڑے بدل کر باہر آئی تو اس نے کچھ مزدوروں کو گھر میں کام کرتے دیکھا۔ وہ فائر پلیس بنارہے تھے اور ایک ترکھان ساتھ ہی کام میں مصروف تھا۔ رامین نے گاڑی میں بیٹھی ناز کو دیکھا تو بھاگ کر اس کے پاس پہنچی۔ سب مزدوروں کے گھر میں ہوتے ہوئے وہ اکیلی یہاں نہیں رہ سکتی تھی۔ ناز نے روکھے لہجے میں اس کی التجا مسترد کرتے ہوئے اسے فورا" اندر جانے کو کہا۔

"میں جارہی ہوں' مزدوروں کا کام دیکھ لینا۔ وہ ترکھان بھی بیٹھا ہے۔ فائر پلیس کا فریم بنائے گا' آپ اندر جاؤ۔" اس کے ساتھ ہی اس نے ڈرائیور کو چلنے کا حکم دے دیا۔ رامین بے بسی سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ وہ گھر کے اندر نہیں جانا چاہتی تھی لیکن باہر کب تک بیٹھی رہتی۔

وہ منہ لٹکائے اپنے گھر کے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ سب مزدور کام میں مصروف تھے' کسی نے بھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ وہ اپنے کمرے میں آکر بستر پر بیٹھ گئی۔ غائب دماغی سے یونہی بیٹھے بیٹھے اسے کچھ لمحے گزرے تھے کہ اپنے پاؤں کے قریب اسے ایک مرد کے پاؤں دکھائی دیے۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا تو وہ ترکھان اس کے سر پہ کھڑا تھا۔ وہ یکدم بری طرح خوف زدہ ہوگئی۔ جبکہ وہ مسکراتا ہوا اس سے پانی مانگنے لگا۔ رامین نے تھوک نگلتے ہوئے اپنے خشک حلق کو تر کیا اور کچن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہاں فریج سے لے لیں۔" وہ کاریگر خباثت سے مسکراتا ہوا پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کی نظریں رامین کے وجود

کا ایکسرے کر رہی تھیں۔ وہ میٹرک میں پڑھ رہی تھی۔ اچھی طرح سمجھتی تھی ان نگاہوں کا مطلب کیا تھا۔ جیسے ہی وہ کچن میں جانے کے لیے پلٹا۔ رامین فورا" اپنے بستر سے اٹھی اور باتھ روم میں جاکر خود کو لاک کرلیا۔ اس کا سانس بے ترتیب ہو رہا تھا۔ وہ کہاں جاسکتی تھی۔ ؟اپنے گھر سے بھاگ کر کہاں جاسکتی تھی؟ وہ فرش پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اسے شدید غصہ بھی آرہا تھا اور رونا بھی۔ یہ وہی کاریگر تھا وہ اسے دیکھتے ہی پہچان گئی تھی۔ جب ماما اس کے ہاتھ چائے بھیجا کرتی تھیں اس کا ساتھی تو رامین کے ہاتھ سے فورا" ٹرے لے کر چائے پینے بیٹھ جاتا تھا مگر یہ رامین کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس کھینچ لیتا۔ "گڑیا آپ تو بہت پیاری ہیں۔" کہہ کر اپنی گود میں بٹھالیتا اور خوب بھینچ کر پیار کرتا جاتا۔۔۔

"یا اللہ! پاپا کو ہی گھر بھیج دے۔ کوئی تو آجائے میرا دم گھٹ رہا ہے۔۔۔" اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ صرف پانچ منٹ بعد ہی اسے پاپا کی کار کا ہارن سنائی دیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور کان دروازے کی طرف لگادیے۔ کار کے دروازے بند ہونے کی آواز آئی۔ باتھ روم کا روشن دان ہر آہٹ اس تک پہنچا رہا تھا۔ اسے پاپا کی آواز سنائی دی۔ وہ ناز کو پکار رہے تھے۔ پھر انہوں نے اس کا نام لیا۔۔۔ وہ اٹھی اور باتھ روم کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ تب تک پاپا پورے گھر میں گھوم چکے تھے۔ اسے کمرے سے نکلتا دیکھا اور اس کی طرف چلے آئے۔

"کہاں تھیں تم۔ اتنی دیر سے آوازیں دے رہا ہوں۔ پھر انہوں نے کچن کی طرف دیکھا اور پوچھا' تمہاری ماما کہاں ہیں؟"

عبید کے سوال پر وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی "ماما گھر پہ نہیں ہیں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا اس لیے میں۔۔۔" یہ کہہ کر رامین نے سر جھکا لیا۔ وہ پاپا کے سامنے اس طرح رونا نہیں چاہتی تھی مگر اتنے دیر سے خود پر قابو کیے ہوئے تھی اب مشکل تھا۔

عبید اس کی بات سن کر اندر تک لرز گئے۔ ایک نظر کام کرتے مزدوروں کی طرف دیکھا' دوسری نظر جوان بچی پر ڈالی' ان کی عزت' غیرت و حمیت۔ ان کی بیٹی۔۔۔ اگر آج کچھ ہو جاتا' کیا وہ ساری زندگی خود سے نظر ملا پاتے اور ناز؟ وہ اکیلی بچی کو اس طرح گھر میں اتنے غیر مردوں کے بیچ کیسے چھوڑ کر چلی گئی۔ یہ کیسی ماں ہے؟

"تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں یہیں پر ہوں۔" ان کی آواز سن کر رامین نے سر اٹھایا' جانے کیوں اسے لگا' پاپا اس سے نظریں نہیں ملا پا رہے۔۔۔ وہ کترا رہے تھے۔ چپ چاپ ان کی بات مان کر وہ سیدھی کمرے میں واپس آگئی۔ پاپا نے مزدوروں کو جلد ہی فارغ کردیا۔

شام کو نازنین جب گھر میں داخل ہوئی تو بہت خوش تھی' اسے معلوم نہیں تھا آج عبید اس کے ساتھ کیا کرنے والے ہیں۔ اپنے بیڈ روم میں پہنچ کر اس نے جیسے ہی دروازہ بند کیا تھا۔ رامین کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

"تم بے غیرت عورت۔ جوان بچی کو یوں گھر میں۔۔۔ مزدوروں کے ساتھ اکیلا چھوڑ کر چلی گئیں۔۔۔؟"

حیران کن طور پر ناز نے آگے سے کچھ نہیں کہا تھا اور عبید نے ہاتھ اٹھانے کے علاوہ سب کچھ ہی کہہ دیا تھا۔ عبید کا آخری جملہ سن کر رامین کے ساتھ ساتھ نازنین کو بھی لرزا گیا۔ اس سے پہلے انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا تھا۔

"مگر اب تم نے میری بیٹی کو یوں تنہا چھوڑ کر گھر سے باہر قدم نکالا۔ تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔"

عبید کی یہ وارننگ اثر کر گئی تھی۔ نازنین اب آنا جانا کافی حد تک کم کرچکی تھی۔ تلخیاں اور لڑائیاں اپنی جگہ۔۔۔ مگر اب رامین اپنے گھر میں محفوظ تھی' کچھ تو سکون ملا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی' یہ آنے والے طوفان کی پیش گوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

بمشکل ڈیڑھ مہینہ گزرا تھا۔ ان ہی دنوں اطلاع آئی کہ نانی امی کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ رامین ان کی موت کی خبر سے بہت ڈسٹرب ہو گئی تھی۔ محسنہ ایک نہایت سادہ سی خاتون تھیں۔ وہ رامین سے بہت محبت کرتی تھیں۔ طارق ماموں کے ساتھ حج پر جانے کے بعد وہ پھر واپس پاکستان بس ایک ہی دفعہ آئی تھیں۔ نازنین کا اپنی ماں کے ساتھ بھی کچھ عجیب سا ہی رویہ تھا۔ اسے حیرت ہوتی تھی۔ طارق ماموں کے ساتھ امریکہ میں رہنے کی وجہ سے ان کا سالوں بعد پاکستان آنا ہوتا تھا۔ یہاں وہ آتیں بھی کس کے لیے۔ صرف نازنین تھی ماں' بہن بھائی تینوں وہیں امریکہ میں تھے۔

ان کا انتقال وہیں امریکا میں ہی ہوا تھا اور انہیں وہیں دفنایا گیا۔ طارق ماموں ان کے انتقال کے ایک ہفتے بعد پاکستان آئے۔ اپنا آبائی گھر بیچ کر انہوں نے نازنین کا حصہ دے دیا۔ اس نازک موقع پر بھی رامین نے ماں کو اپنے بھائی سے انتہائی بے تکی بات پر لڑتے دیکھا تھا۔ اسے اپنی ماں کا زیور چاہیے تھا۔ جو کہ ظاہر ہے طارق اپنے ساتھ نہیں لائے تھے۔ یہ قضیہ کسی نہ کسی طرح نبٹایا تو ناز نے ایک اور عجیب حرکت کر ڈالی۔ وہ اپنا سوٹ کیس پیک کرکے طارق کے پاس ہوٹل پہنچ گئی اور جی بھر کے عبید کے ظلم و ستم کا رونا رویا۔ طارق خود اپنی بہن کو عبید کے پاس واپس لائے اور معذرت کی تھی۔ ان کے جانے کے بعد ناز کو یقین ہوگیا کہ اب اپنی زندگی اسے خود ہی ٹھیک کرنی تھی۔ کوئی اس کی مدد کو نہیں آئے گا۔ کیسے ٹھیک کرنی تھی یہ وہ سوچ چکی تھی۔

اپنی باقی فرینڈز کی طرح رامین نے بھی ایک اوپینین کتاب بنائی' جس میں اخبارات اور میگزینز سے خوب صورت پکچرز کاٹ کر لگائی تھیں اس کی تمام سہیلیاں تو دوسرے کلاس فیلوز کو بھی وہ بک فل کرنے کے لیے دے رہی تھیں۔ پر رامین نے صرف لڑکیوں سے ہی فل کروائی تھی۔ اوپینین بک کے پہلے صفحے پر اس کی سب سہیلیوں نے اپنا نام' ایڈریس اور فون نمبر لکھ کر آگے ہر صفحے پر موجود مختلف سوالوں کے نہایت دلچسپ جواب لکھے تھے۔ آج وہ اپنے ساتھ ایک آٹو گراف بک بھی لائی تھی۔ بریک کے دوران اسٹاف روم میں جاکر اس نے اپنی تمام پرانی ٹیچرز سے آٹو گراف لیے جنہوں نے پچھلے دس سالوں میں اسے مختلف سبجیکٹس پڑھائے تھے۔ ان سے مل کر رامین آبدیدہ ہو گئی تھی۔

گھر جاتے ہوئے وہ پکا ارادہ کرچکی تھی کہ پاپا سے فیئرویل پارٹی میں آنے کی اجازت مانگے گی۔ بھلے ہی پاپا نے اسے کبھی اسکول کے کسی فنکشن یا پکنک پر آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ لیکن اسے یقین تھا کہ فیئرویل پر جانے کی اجازت ضرور مل جائے گی۔

اگلے دن وہ بہت ایکسائیڈ ہو کر یہ خبر اپنی سب فرینڈز کو سنا رہی تھی کہ اس کے پاپا مان گئے ہیں اور وہ فیئرویل پارٹی پر آسکتی ہے۔ رامین سے بھی زیادہ اس کی تمام دوست بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھیں۔ سب مل کر اپنے ڈریسز ڈسکس کرنے لگیں۔ محض تین دن بعد ہی جمعے کی شام فیئرویل پارٹی تھی۔ رامین نے پاپا سے فرمائش کرکے خاص طور پر ان کے ساتھ جاکر سفید موتیا رنگ کا ڈریس خریدا تھا۔ پاپا اسے خوش دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ اس کی ساری فرینڈز نے سفید لباس پہنا تھا۔ اسی لیے اس نے بھی یہی رنگ پسند کیا تھا۔ ماما نے اس لباس کو سخت ناپسند کرتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"تجھے ہمیشہ لٹی بیواؤں والے رنگ پسند آتے ہیں۔" رامین دکھی دل سے اپنی ساری شاپنگ اس کے سامنے سے اٹھا کر لے گئی۔

فیئرویل کی شام اس نے اپنے ڈریس کے ساتھ وہی بالیاں پہنیں جو فرح نے اسے ایک سال پہلے گفٹ کی تھیں۔ اپنی اوپینین بک اور آٹو گراف بک لے کر وہ بھائی کے ساتھ اسکول پہنچ گئی۔ اسے ڈراپ کرکے شاہ زیب وہاں سے چلا گیا۔

نویں کلاس کے کچھ اسٹوڈنٹس استقبالیہ پر کھڑے ہر آنے والے کو ۔۔۔ کی نازک سی کلی پیش کر رہے تھے۔ اس نے مسکراتے ہوئے رابعہ کے ہاتھ سے وہ کلی پکڑلی اور ہال میں چلی آئی۔

فرح ہال میں مہرز کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ رامین کو داخل ہوتے دیکھ کر ان دونوں نے اسے اشارے سے پاس بلالیا۔ فرح نے اس کے ذرا سا نزدیک آنے پر اس کے بازو کس کر پکڑے اور بولی۔

"یہ میری بیسٹ فرینڈ ہے مہرز۔ یہ میرے لیے دعا کرے گی۔"

"دوست تو ہم بھی رہ چکے ہیں۔ وہ میرے حق میں زیادہ دعا کرے گی۔" پھر اس نے رامین سے تصدیق طلب کی "ہے نا رامین۔ تم میرے لیے زیادہ دعا کروگی نا؟"

"کون سی دعا؟" وہ نا سمجھی کے عالم میں دونوں کی شکلیں دیکھنے لگی۔

"یہی... کہ میں بورڈ ایگزامز میں بھی فرح کو شکست دینے میں کامیاب ہوجاؤں۔"

"جی نہیں میں اپنی دوست کے لیے دعا کروں گی۔" رامین نے اس کی بات سمجھ کر فرح کی سائیڈ لی۔

"کچھ تو لحاظ کرو۔" مہرز نے فرح کی بتیسی باہر آتے دیکھ کر رامین کو احساس کرنے کی تلقین کی۔

"اب میری فرینڈ کو بلیک میل مت کرنا۔ فیصلہ ہوچکا ہے۔" فرح نے ہاتھ اٹھا کر سارا جھگڑا ہی نمٹا دیا۔ حسن کے آنے پر مہرز نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ "میرا یہ دوست بہت پہنچا ہوا ہے' یہ میرے لیے دعا کرے گا۔" فرح اور رامین کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"چودھری صاحب تمہارے لیے کیا دعا کریں گے؟ انہیں تو خود دعاؤں کی ضرورت ہے۔" فرح نے بے تکلفی سے حسن کا مذاق اڑایا۔ حسن خوا مخواہ شرمندہ ہوتا رہا۔

ڈنر کے بعد وہ سب ٹیچرز سے باتیں کرتے ہنس بول رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں نائن اے کا ساجد علی مائک کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ وہ بہت اچھا گاتا تھا۔

اردو کی ٹیچر مس راحت نے غزل کی فرمائش کی تو ساجد نے کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا اور جگجیت سنگھ کی مشہور غزل گانا شروع کی۔

جھکی جھکی سی نظر بے قرار ہے کہ نہیں
دبا دبا سا سہی' دل میں پیار ہے کہ نہیں

ساز خاموش تھے' ساجد کی خوب صورت آواز نے سننے والوں پر سحر طاری کردیا تھا۔ رامین کو بھی یہ غزل بہت پسند تھی۔ وہ سر جھکائے سنتی رہی۔

غزل ختم ہوتے ہی ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ رامین نے گھڑی کی طرف دیکھا نو بج رہے تھے۔ اس کے بھائی نے اپنے آنے کا یہی وقت طے کیا تھا۔ وہ باری باری سب کو خدا حافظ کہتی فرح کے پاس آئی جو مہرز سے آٹوگراف لکھوا رہی تھی۔ مہرز... رامین کو دیکھ کر مسکرایا۔ اپنی آٹوگراف بک اس کی طرف بڑھا کر بولا۔

"تم پلیز... آٹوگراف دوگی مجھے..." رامین کو تعجب ہوا' ابھی وہ کوئی بہانہ سوچ ہی رہی تھی کہ فرح نے مہرز کی آٹوگراف بک اس کے ہاتھ جھپٹ لی۔

"جی نہیں... میری دوست یہ بعد میں کرے گی جب تم اس کی اوپینین بک فِل کرکے دوگے۔" پھر وہ رامین سے مخاطب ہوئی۔

"چلو رامین... دو اسے..." رامین انہیں آپس میں یوں بے تکلفی سے مذاق کرتے دیکھ کر خوش بھی تھی اور حیران بھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنی بک مہرز کی جانب بڑھائی تو مہرز سٹپٹا کر فرح کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"اتنی موٹی بک... میں ابھی تو فل نہیں کرسکتا۔ آٹوگراف یا کمنٹس لکھوالو۔"

"ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔ تم منڈے کو واپس کردینا۔ کیوں رامین' ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں... تم منڈے کو واپس کردینا۔" پھر وہ فرح سے گلے مل کر خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔

مہرز نے اوپینین بک اسی میز پر رکھ لی جس پر وہ بیٹھا ہوا تھا' کچھ دیر میں سر تنویر آواز دینے پر وہ اٹھ کر ان کے پاس چلا گیا۔ فنکشن دیر میں ختم ہوا تھا۔ سب سے آخر میں نویں کلاس نکلی تھی۔ کیٹرنگ والوں کو

پے منٹ وغیرہ دے کر باؤس کیپٹن اسد باہر نکلنے والا تھا کہ ویٹر نے اسے آواز دے کر روک لیا۔

"سر جی' یہ کاپی پڑی تھی ٹیبل پر۔ جب میں چائے سرو کرنے لگا تو اٹھائی تھی' ٹیبل پر جگہ بنانی تھی آپ دے دیجیے گا جس کی بھی ہو۔"

اس نے سر ہلا کر خاموشی سے وہ رجسٹر پکڑ لیا اور اسکول سے باہر نکل آیا۔ اس کے چند دوستوں کے علاوہ سب لوگ جاچکے تھے۔ وہ بھی انہیں خدا حافظ کہتا اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

گھر آکر اسد نے وہ اوپینین بک کھولی تو اسے رامین کا نام نظر آیا' ساتھ ہی فون نمبر اور ایڈریس بھی موجود تھا۔ یقیناً" وہ اس بک کے کھوجانے سے پریشان ہوگی' اس نے فوراً" ہی رامین کے گھر کا نمبر ملایا۔

بابا' شاہ زیب اور وہ اس وقت ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ نازنین اپنے لیے چائے بنانے کے لیے ابھی کمرے سے باہر آئی ہی تھی کہ فون بج اٹھا۔ ناز فون کے قریب ہی تھی۔ عبید نے اسے فون اٹھانے کے لیے کہا تو اس نے کڑے تیوروں سے ان تینوں کی جانب دیکھا جو ایک ساتھ کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ ہونہہ' مجھے بے سکون کرکے بہت خوش ہیں سب کے سب۔ جلتے کلستے اس نے فون اٹھالیا۔

"ہیلو!" کہنے کے بعد وہ دوسری جانب سے کی جانے والی گفتگو غور سے سنتی رہی۔ تیس سیکنڈ بعد دوسری طرف سے کال ڈسکنکٹ کردی گئی اور نازنین نے تیز آواز میں چیخنا چلانا شروع کردیا۔ وہ تینوں حیرت سے مڑ کر اسے دیکھنے لگے' وہ فون کان سے لگائے جو کچھ کہہ رہی تھی' رامین کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔

"تمہاری اتنی ہمت کہ ہماری بیٹی کا نام لو۔ تم ہو کون؟" عبید اور اس کا بھائی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بوائے فرینڈ؟ کیا بکواس کررہے ہو' آئندہ یہاں فون کرنے کی جرأت نہ کرنا۔" عبید نے آگے بڑھ کر ریسیور اس کے ہاتھ سے لینا چاہا تو ناز نے چیخ چلا کر فون رکھ دیا اور غصے میں بپھری رامین کی طرف بڑھی اور اسے ایک زوردار طمانچہ رسید کیا۔

"ذلیل بے غیرت' باپ بھائی کی عزت مٹی میں ملاتے ہوئے تجھے شرم نہیں آئی۔" وہ اپنی چپل اتار کر رامین پر پل پڑی تھی۔ عبید یکدم جیسے ہوش میں آئے اور پیچھے سے آکر نازنین کو پکڑ کر روکنے کی کوشش کی۔

"کیا کررہی ہو؟ کیا ہوا ہے؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔" ناز ان کا ہاتھ جھٹک کر سیدھی کھڑی ہوگئی اور روتے ہوئے بولی۔

"مجھ سے کیا پوچھ رہے ہیں؟ اپنی بے غیرت بیٹی سے پوچھیں کیا گل کھلاتی رہی ہے۔ اسکول پڑھنے جاتی ہے یا آوارگیاں کرنے۔" عبید نے بے یقینی سے رامین کو دیکھا جو پتھر کا بت بنی ماں کی شکل دیکھ رہی تھی۔

"بابا! میں نے کچھ نہیں کیا۔" عبید اس کی طرف بڑھے تو وہ فوراً" اپنے ہاتھ تیزی سے ہلاتی ڈر کر پیچھے ہٹنے لگی۔ پیچھے سے ناز بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ "اس لڑکے نے فون پر مجھ سے خود کہا کہ میں رامین کا بوائے فرینڈ ہوں وہ اپنی اوپینین بک میرے پاس بھول گئی ہے آنٹی۔ ہم پارٹی کے دوران اسکول کی بیک سائیڈ پر بیٹھے ہوئے تھے' وہ جلدی میں نکلی اور بک یہیں میرے پاس چھوڑ گئی۔" وہ طنزیہ انداز میں ہاتھ نچا نچا کر اس لڑکے کے کہے الفاظ دہراتی رہی۔

جنہیں سن کر شاہ زیب بھی یکدم غصے میں آکر اس کے سر پر کھڑا ہوگیا "تمہاری بک کہاں ہے' جو تم ساتھ لے کر گئی تھیں؟"

"بھائی... میں نے وہ اسکول میں مہرز کو دی تھی۔ میں..."

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عشق مسیحا

اسمائے خان

ناولٹ

کیلی فورنیا ہائی وے پر "معرز خان" نامی ایک نوجوان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ آفیسرز کے مطابق اس نوجوان کے زندہ بچنے کے امکانات کم ہیں۔

معرز خان اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ روڈ ایکسیڈنٹ میں اس کے والدین کی وفات ہوچکی ہے۔ اب وہ کیلی فورنیا میں اپنے پرانے اور بااعتماد ملازم جیری کے ساتھ رہتا ہے۔ رضا اس کا دوست ہے۔ معرز کا اس کے گھر بھی آنا جانا ہے۔ رضا کی چھوٹی بہن عنبر کو وہ بھی اپنی بہن سمجھتا ہے۔

رامین ایک مغموم و معصوم لڑکی ہے۔ ماں کے ظلم کی وجہ سے ہر وقت وحشت زدہ رہتی ہے۔ ماں کے انتقال پر اس کی پھوپھیاں آمنہ بیگم اور قدسیہ بیگم اسے سنبھالتی ہیں۔ تایا شفیق الرحمان اسے اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کرتے ہیں مگر وہ منع کردیتی ہے۔

رامین اور معرز کے درمیان اسکول کے پہلے دن سے ہی خوب اچھی دوستی ہوجاتی ہے۔ پھر حسن بھی ان کے ساتھ شامل ہوجاتا ہے مگر ایک دن رامین کے والد اسے معرز اور حسن کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ کر بہت سختی کرتے ہیں۔ اس دن کے بعد سے رامین ان دونوں سے کھنچ جاتی ہے۔ میٹرک تک آتے آتے رامین کی سرد مہری کے باوجود معرز اس کو پسند کرنے لگتا ہے۔

مطیع الرحمان اور صبیحہ بیگم کے دو بیٹے شفیق الرحمان اور عبید الرحمان اور بیٹیاں آمنہ بیگم اور قدسیہ بیگم ہیں۔ لاڈلی بیگم، مطیع الرحمان کی چھوٹی بہن ہیں اور صالحہ بیگم، صبیحہ بیگم کی چھوٹی بہن ہیں، جو بیوہ اور تین بچوں کی ماں ہیں۔ صبیحہ بیگم اپنے میاں کی رضامندی سے انہیں اپنے ساتھ رکھ لیتی ہیں۔ ان کی بہت سگھڑ، مگر قدرے عام صورت بیٹی گل ناز کو صبیحہ بیگم عبید الرحمان کے لیے لینے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ گل ناز بھی عبید الرحمان کو پسند کرتی ہے۔ دوسری طرف لاڈلی بیگم کی خواہش ہے کہ عبید الرحمان کے لیے ان کی بیٹی طوبیٰ کو لیا جائے۔ صبیحہ بیگم بہت ہوشیاری سے مطیع الرحمان اور اپنی ساس کو گل ناز کے حق میں راضی کر لیتی ہیں۔

لیکن عبید الرحمان کسی شادی میں نازنین کو پسند کر لیتے ہیں، جو محسنہ اور شاکر علی کی سب سے چھوٹی اور نہایت حسین بیٹی ہے۔ شاکر علی کی ہی طرح مغرور بھی۔ محسنہ اناللہ سے تعلق رکھنے والی ایک سادہ، ان پڑھ اور کم صورت خاتون تھیں۔ جبکہ شاکر علی خوش شکل، خوش لباس پروفیسر تھے۔ انہوں نے محسنہ اور بچوں کی کفالت کے علاوہ کبھی بیوی بچوں میں دلچسپی نہ لی مگر نازنین پر انہوں نے خوب توجہ دی جس کے باعث وہ مزید مغرور اور خود سر ہوگی۔

عبید الرحمان بہت مشکل سے اپنے گھر والوں کو نازنین کے لیے راضی کر پاتے ہیں۔

شادی کے بعد ناز بے تحاشا مسائل میں پھنس جاتی ہے۔ عبید الرحمان اپنی والدہ کے فرماں بردار ہوتے ہیں اور صبیحہ بیگم بہرحال ناز کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ لاڈلی بیگم بھی شادی کے دوسرے دن ہی گلناز کے خلاف اس کے کان بھر دیتی ہیں۔ سسرال والے اس کی خوشیوں میں اچھی خاصی رکاوٹ ڈالتے ہیں، عبید ماں کے بارے میں نازیبا الفاظ بولنے پر ناز پر ہاتھ اٹھا دیتے ہیں۔ ناز کے دل میں سسرال والوں سے شدید نفرت پیدا ہو جاتی ہے پھر وہ حتی المقدور اس نفرت کا اظہار اپنی باتوں اور حرکتوں سے کرنے لگتی ہے۔ اس کی دوست عالیہ اسے مزید شہ دیتی ہے۔ وہ عبید الرحمان کو ان کے گھر والوں سے برگشتہ کرنے کے لیے ایسی حرکت کرتی ہے کہ عبید الرحمان ٹیپو سے سخت ناراض ہو جاتے ہیں اور الگ ہونے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ بعد میں پتا چلتا ہے کہ یہ سب ناز کی منصوبہ بندی تھی۔ ناز، شاہ زیب اور رامین کو باپ اور ددھیال سے بدگمان کرنا شروع کر دیتی ہے۔

رامین کو باپ کی طرف داری کرتے دیکھ کر وہ عبید الرحمان کو زچ کرنے کے لیے اس پر ظلم کرنے لگتی ہے۔ الگ گھر میں آ کر ناز آزاد ہو جاتی ہے۔ اور عبید الرحمان کے منع کرنے کے باوجود اپنی پرانی ایکٹویٹیز شروع کر دیتی ہے۔ وہ غلط بیانی کر کے عبید الرحمان سے رامین کو پٹواتی ہے۔

چوتھی قسط

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کے پاپا کا ہاتھ اٹھ گیا اور پھر انہوں نے کچھ بھی نہیں سنا نہ رامین کی قسمیں، نہ واسطے۔ شاہ زیب انہیں نہ روکتا تو شاید آج وہ اسے جان سے ہی مار ڈالتے۔ رامین کو اپنے پاپا کے بھاری ہاتھ سے جسم پر اتنی چوٹ نہیں لگ رہی تھی جتنا ان کے آنسوؤں سے تر چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کا دل لہولہان ہو رہا تھا۔ وہ روتے ہوئے اس سے شکوہ کناں تھے کہ اس نے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ کسی کو بھی اس کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

یقین تو اسے بھی نہیں آ رہا تھا کہ مہرینہ ایسا کیسے کر سکتا ہے؟ ایک ذرا سی بات کا اتنا بتنگڑ کیسے بن گیا تھا؟

"جاؤ اپنے کمرے میں۔ ہٹو یہاں سے۔" امی کا بھائی، پاپا کو کاندھوں سے تھامے ہوئے اسے جانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ عبید بے دم سے ہو کر صوفے پر گر گئے تھے۔ شاہ زیب انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا اور نازنین... وہ صرف زہر اگل رہی تھی۔

"اپنی اس بیٹی کی چوکیداری کرنے کے لیے میرے آنے جانے پر پابندی لگا دی تھی۔ اب اسے قید کر کے دکھائیں۔ ایسی بے غیرت... ابھی سے یہ حال ہے، آگے کیا کرے گی؟ ان مزدوروں سے "نیک پروین" کو ڈر لگ رہا تھا؟ اب پتا چلا کتنی بڑی "چھوٹی" ہے آپ کی بیٹی، بلاوجہ کوئی کسی کے آگے پیچھے نہیں پھرتا، اب ایسی بھی حور پری نہیں ہے کہ ساری دنیا کے مرد..."

"بس... اب ایک لفظ مت کہنا نازنین، ورنہ میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔" عبید سے نازنین کی جلی کٹی باتیں برداشت نہیں ہو رہی تھیں، انہوں نے پوری قوت سے چلا کر اسے خاموش رہنے کو کہا، مگر وہ چپ رہنے والوں میں سے نہیں تھی۔

"میرا منہ کیوں توڑیں گے؟ اپنی لاڈلی کے ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہیں کر دیتے؟ اتنی ہی غیرت ہے تو... ؟ میرا سلیولیس بلاؤز نظر آتا ہے۔ اپنی بیٹی کے کرتوت نہیں؟ بس! میں نے بہت سہہ لیا، اب جہاں دل کرے گا میں جاؤں گی۔ اپنی بیٹی کو سنبھالنا ہے تو خود سنبھالیں، میں اس کی ذمہ دار نہیں ہوں، اور خبردار جو آئندہ مجھے روکنے کی کوشش کی۔ پوری دنیا میں مشہور کر دوں گی کہ آپ کی بیٹی پڑھائی کے بہانے منہ کالا کرتی پھرتی ہے۔"

وہ الفاظ نہیں تھے، پگھلا ہوا سیسہ تھا جو ناز عبید کے کانوں میں انڈیلتی جا رہی تھی۔ عبید نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا، ناز اپنے ترکش کا آخری تیر چلا کر کمرے میں چلی گئی۔ اور شاہ زیب پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے پاپا کو چپ کروانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ وہ اپنے کمرے میں بستر پر بیٹھی تھی۔ لیکن ہر آواز سن سکتی تھی۔ پاپا کے رونے کی آواز۔ اس نے بے اختیار گردن موڑ کر اندھیرے ہال کی طرف دیکھا۔ جانے کیوں ابھی بھی اسے لگ رہا تھا کہ عبید کی سسکیاں ہر طرف گونج رہی ہیں۔ اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

اگلے دو روز وہ بے تحاشا روتی رہی تھی، شاہ زیب اسے چپ کروانے آیا تھا۔ اسی نے پاپا کو سمجھایا تھا کہ وہ رامین کے ساتھ اسکول جا کر ساری صورت حال معلوم کرے گا۔ اس دن مہریز کو اچھی طرح برا بھلا کہنے کے بعد جب وہ چھٹی کے وقت بھائی کے ساتھ اسکول سے باہر نکلنے والی تھی تو اسد گیٹ سے اندر آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں رامین کی بک تھی۔ انہیں دیکھتے ہی وہ سیدھا ان کے پاس آیا اور رامین کی بک اسے دیتے ہوئے کہا۔

"سوری، مجھے فلو تھا، صرف آپ کی بک واپس کرنے آیا ہوں... یہ سوچ کر کہ آپ پریشان ہو رہی ہوں گی... ویسے آپ کو میسج تو مل گیا ہوگا، میں نے آپ کے گھر فون کر کے آنٹی کو بتایا تھا کہ ٹیبل پر یہ بک ویٹر کو مل گئی تھی، میرے پاس ہے۔ میں پیر کو واپس دے دوں گا۔"

رامین سن کھڑی اس کی ہر بات سن رہی تھی۔ شاہ زیب نے تھینکس کہہ کر اس سے ہاتھ ملایا اور وہ دونوں گھر واپس آ گئے۔ اسی شام شاہ زیب نے عبید کو بھی سب کچھ بتا دیا تھا۔

نازنین کے جھوٹ کا سچ پہلی بار ان کے سامنے نہیں آیا تھا۔ اپنے دفاع میں جھوٹ بولنے والی نازنین اب اس حد تک آگے بڑھ چکی تھی کہ بیٹی پر تہمت لگانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ عبید رامین سے بھی سخت شرمندہ تھے۔

کچھ بعید نہیں تھا کہ ناز اپنے کہے پر عمل کرتے ہوئے خاندان بھر میں یہ قصہ مشہور کر دیتی اور رامین بدنام ہو جاتی۔ رامین کے لیے مزید احتیاط لازم ہو گئی۔ گھر کا فون نمبر تبدیل کر دیا گیا اور ہر جگہ آنے جانے پر پابندی لگ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے باپ کی نظروں میں تو معتبر کر دیا تھا مگر وہ خود سے بہت شرمندہ تھی۔ مہریز جس نے کچھ نہیں کیا تھا، اس کے غصے کا نشانہ بن گیا تھا۔ وہ اس سے معافی مانگنا چاہتی تھی لیکن کیسے؟ اب تو ملاقات کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔

"یا اللہ... مجھے زندگی میں ایک موقع ملے کہ میں

اس سے معافی مانگ سکوں۔ اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی۔ مجھے معاف کردے اور مہرزا سے اتنی خوشیاں اور کامیابیاں عطا فرما کہ لوگ اس پر رشک کریں۔ وہ جو چاہے اسے مل جائے، میں اس کے لیے تیرے آگے ہاتھ پھیلاتی ہوں۔ اسے عزت، نام، پیسہ سب کچھ دے ہمیشہ اسے اپنی حفظ و امان میں رکھ۔"

اس نے رامین سے کہا تھا کہ وہ اس کے لیے دعا کرے وہ کررہی تھی۔

☼ ☼ ☼

عبید نے اٹھتے بیٹھتے رامین کی تربیت کرنی شروع کردی تھی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ رامین اپنی ماں کی شخصیت کا ذرا سا بھی اثر قبول کرے۔

باتوں باتوں میں وہ رامین کو سمجھاتے رہتے کہ اسے ہرگز نازنین جیسا نہیں بننا ہے۔ ایک اچھی بہو اور بیوی ویسی نہیں ہوتی جیسی ناز تھی۔ عورت وہی کامیاب ہے، جس سے اس کا شوہر خوش ہو۔

عبید چاہتے تھے کہ رامین کی جلد از جلد شادی کردی جائے۔ ان کے خاندان میں تو ابھی تک کسی نے رامین کے لیے دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ان کا ارادہ قدسیہ کے بڑے بیٹے سعد کے لیے تھا مگر ان کی بہن نے اپنی بیٹی کے لیے شاہ زیب کا نام لیا تو وہ پریشان ہوگئے تھے۔ قدسیہ کو کسی نہ کسی طرح ٹال کر انہوں نے رامین کے لیے کہیں اور کوشش شروع کردی۔

رامین کا ایڈمیشن کالج میں ہوگیا تو گھٹن میں کچھ کمی واقع ہوئی۔

اس کی فرینڈز مل جل کر لنچ، مووی اور گیٹ ٹوگیدر کے پروگرامز بناتیں اور کالج کے باہر بھی ایک دوسرے کے ساتھ خوب انجوائے کرتی تھیں۔ رامین سے ان کا تعلق صرف کالج کی حد تک ہی تھا ان کے لاکھ کہنے پر بھی وہ کبھی ان کے گھر نہیں گئی تھی۔ اپنے گھر وہ اس لیے نہیں بلا پاتی تھی کہ معلوم نہیں کب ماما پاپا کا سین کری ایٹ ہو اور وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہ رہے۔

☼ ☼ ☼

شاہ زیب اس کا بھائی اس کا دوست ۔۔۔ جس سے کچھ نہ بھی کہتی وہ ہمیشہ اس کے دل کا حال جان جایا کرتا تھا۔ بھائی اپنی بہن کے لیے مضبوط پناہ بھی ہوتا ہے اور محبت کا سرچشمہ بھی۔ ان کا بچپن ماں باپ کے جھگڑوں سے جہاں جہاں محفوظ رہا تھا وہیں بہت خوب صورت اور معصوم یادیں سمیٹے ہوئے تھا۔ ساتھ کھیلتے، تتلیوں اور جگنوؤں کا پیچھا کرتے، پتنگ اڑاتے، اللہ کے نام چٹھی باندھ کر آسمان میں گیس بھرے غبارے کو چھوڑ دیتے۔ ان کی لڑائیاں بھی بہت ہوا کرتی تھیں جیسے سب بہن بھائی کی ہوتی ہیں۔ بہن نے بال کم کردی تو بھائی ناراض، بھائی نے چوٹی کھینچ دی، گڑیاں توڑ دیں تو بہن کا غم سے برا حال ۔۔۔ رو رو کر لڑائی شروع ہوتی اور ہنستے ہنستے ختم ہوجاتی۔

بہت سے مناظر جو رامین کو یاد تھے جنہیں دیکھ کر اسے زندگی کی بدصورتی کا احساس ہوا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ خوف ناک منظر شاہ زیب نے دیکھے تھے۔ وہ لڑکا تھا، اس کے باوجود وہ رامین سے زیادہ حساس تھا اور یہی چیز اس کے لیے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوئی تھی۔

اسے رامین کی طرح گھر میں قید نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اسے پڑھائی میں دشواری ۔۔۔ پیش آئی تو اسے اکیڈمی میں داخل کرادیا گیا جہاں اس کی دوستی سر نبیل سے ہوگئی تھی۔ یہ شخص کچھ عجیب سے کردار کا مالک تھا۔ اکیڈمی میں انگلش پڑھایا کرتا تھا اور اپنے گھر میں اس نے ایک آرٹس اسکول کھول رکھا تھا جہاں دن بھر نو عمر لڑکے لڑکیوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔

گھر کے کشیدہ ماحول سے فرار حاصل کرنے کے لیے شاہ زیب نے نازنین سے کہہ کر آرٹس اسکول میں بھی داخلہ لے لیا اور اپنی شامیں وہیں گزارنے لگا۔

یہیں سے اسے سگریٹ نوشی کی عادت پڑگئی تھی۔ وہاں ہر قسم کے لڑکے لڑکیاں آتے تھے، زیادہ تر ایلیٹ کلاس کے بچے جنہیں نبیل کی پراسرار شخصیت اپنی جانب کھینچ لیتی تھی۔ یہاں سب آپس میں بے حد بے تکلف تھے۔ مذہب، آرٹس کلچر، جنس یہاں ہر موضوع پر بے لاگ تبصرہ کیا جاتا۔ نبیل کے تمام خرچے ان ہی امیر والدین کی بگڑی ہوئی اولادیں اٹھایا کرتیں۔

شاہ زیب کو کبھی روپے پیسے کی کمی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ ماں باپ کے پاس اولاد کو دینے کے لیے وقت اور خوشیاں نہ ہوں تو پیسے تھما دیا کرتے ہیں۔ اپنے گلٹ کا گلا دبانے میں آسانی رہتی ہے۔ شاہ زیب کے معاملے میں ناز اور عبید پوری قوت سے اپنے گلٹ کا گلا گھونٹنے میں مصروف تھے۔

شاہ زیب گھر سے لاتعلق ہوتا جارہا تھا۔ کبھی گھر میں ایک دو وقت کا کھانا کھانے آجاتا تو سر پر لڑتے ماں باپ کو بھنبھناتی مکھیوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیا کرتا تھا۔ اسے رامین کی فکر رہتی تھی، اپنے کمرے کی چابی وہ اسے دے جاتا کہ اس کے لیے ایک ایسی پناہ گاہ تو ہونی چاہیے، جہاں وہ ماں کے چنگل سے محفوظ رہ سکے۔ وہ ماں کو بپھرتے دیکھ کر اس کے کمرے میں چلی جاتی اور اندر سے لاک کرکے چند گھنٹوں کے لیے محفوظ ہوجاتی تھی۔

عبید الرحمان کو ان کے کسی دوست کے ذریعے معلوم ہوا تھا کہ جس آرٹس اسکول میں شاہ زیب جارہا ہے، اس کی شہرت اچھی نہیں ہے، پھر اپنے طور پر بھی انہوں نے معلوم کروایا تو یہی بات سامنے آئی تھی کہ نبیل جیسا شخص استاد کہلانے کے لائق ہرگز نہیں تھا۔ انہوں نے شاہ زیب کو وہاں جانے سے منع کیا تو اس نے انکار کردیا۔

عبید کی آنکھوں کے سامنے ان کا گھر برباد ہورہا تھا۔ انہیں کچھ کرنا تھا۔ اپنے بھائی شفیق الرحمان کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔

شفیق الرحمان نے نہایت سمجھ داری سے جوان ہوتے بھتیجے کو زور زبردستی سے روکنے کے بجائے ایک متبادل تفریح فراہم کی۔ وہ اسے آرٹس اسکول جانے کی ٹائمنگ پر اپنے گھر لے جاتے۔ اپنے بچوں کے ساتھ گپ شپ لگاتے اس کے ساتھ۔ کچھ ہی مہینوں میں شاہ زیب سر نبیل کو بھول گیا۔ پڑھائی کے لیے اسے جو مدد درکار ہوتی شفیق الرحمان کردیا کرتے تھے۔ اپنے ددھیال والوں سے براہ راست رسم و راہ پیدا ہونے کے بعد شاہ زیب کو احساس ہوا تھا کہ نازنین کس قدر غلط سوچتی تھی ۔ اس نے اپنے بچوں کے ذہنوں میں ابتدا ہی سے سسرال والوں کے ظلم و ستم کا وہ نقشہ کھینچ رکھا تھا کہ بچے کبھی بھی ان سے کھل مل نہیں پائے تھے۔ اب ناز کی کہی ہر بات شاہ زیب کو جھوٹ محسوس ہوتی تھی۔

اس معمول کی خبر جب تک نازنین کو نہیں ہوئی تھی، سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ جس دن ناز کو علم ہوا کہ اس کا چہیتا بیٹا اس کی آنکھوں میں دھول جھونک

رہا ہے' وہ فورا" ستھے سے اکھڑ گئی۔

اولاد کو بہت پہلے ہی بانٹ لیا تھا ناز نے۔ رامین عبید کی اور شاہ زیب صرف ان کا۔ وہ اس پر بے تحاشا روپیہ لٹاتی آئی تھی۔ اس کی ہر خواہش پوری کی مگر شاہ زیب نے بھی اسے دھوکا دے دیا۔ وہ غصے میں پاگل ہو کر یہاں سے وہاں چکر لگا رہی تھی۔ اسی وقت شاہ زیب پسینے میں شرابور گھر کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اس نے چور نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا جو لال انگارہ آنکھوں سے پہلے ہی اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ چپ چاپ سر جھکا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ناز نے ہاتھ بڑھا کر اس کا راستہ روک لیا۔

"ٹھہرو۔۔۔"

"ماما! آپ اس وقت غصے میں ہیں۔۔۔ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔" نرمی سے کہتا وہ اس کا ہاتھ ہٹا کر آگے نکلنے لگا تو ناز نے اس کے ہاتھ سے وکٹ چھین کر اسے بے دریغ پیٹنا شروع کر دیا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ رامین پر اپنا غصہ نکالتی تھی۔

"آئندہ وہاں جانے کا سوچا بھی تم نے تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گی۔"

"کیا کر رہی ہیں آپ۔ چھوڑیں۔"

"نہیں شاہ زیب۔" وہ غصے میں بالکل اندھی ہو رہی تھی۔ "تو نہیں جانتا۔۔۔ آج وہ لوگ جشن مناتے ہوں گے کہ بیٹے کو ماں کے خلاف کر دیا۔ تو مجھے جھوٹا سمجھتا ہے؟ میں سچ کہہ رہی ہوں انہوں نے مجھے بڑا ستایا تھا۔ تمہارا باپ ان کے ساتھ مل کر مجھے بے عزت کرتا تھا۔ رامین بھی باپ کے ساتھ ہو گئی اور اب تو بھی؟؟"

وہ مارنا چھوڑ کر جذباتی حربوں پر اتر آئی جن سے شاہ زیب نے عرصہ پہلے متاثر ہونا چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر ماں کی جذباتیت سے بے زاری نظر آ رہی تھی۔ اپنی بات کا کوئی اثر نہ ہوتا دیکھ کر ناز کا غصہ دوبارہ لوٹ آیا۔ اس نے اسے ڈرانے کے لیے پھر سے وکٹ اس کے سامنے بلند کی۔ اس بیٹے کے سامنے جو اس کے قد سے بھی اونچا تھا۔

نازنین نے شاہ زیب سے دوبدو ہو کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔ اس کے باغیانہ رویے اور ماں کی بات سننے سے صاف انکار نے ناز کو ہاتھ اٹھانے کی ترغیب دلائی اور گالیوں اور مغلظات کے طوفان کے ساتھ اس نے وکٹ زور سے شاہ زیب کے گھٹنے پر دے ماری' وہ ایک لمحے کو لڑکھڑایا پھر اس نے اسی وکٹ کو ماں کے ہاتھ سے چھین کر اپنی ران پر دونوں کناروں سے پکڑ کر زور سے مار کر دو حصوں میں تقسیم کر کے ناز کی طرف پھینک دیا۔

"اب کیسے توڑیں گی میری ٹانگیں۔۔۔ آپ کا ہتھیار تو ٹوٹ گیا۔" نازنین اس کے طنز پر غراتے ہوئے اسے ہاتھوں اور تھپڑوں سے مارنے لگی۔ شاہ زیب اپنے آپ کو بچانے کے لیے پیچھے ہٹنے لگا۔ ناز نے مارنا چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے اسے دبوچ لیا۔

"کتے ذلیل۔۔۔ اپنی ماں کی ہنسی اڑاتا ہے۔" اس نے شاہ زیب کے بال پکڑ کر اس کے سر کو شدید جھٹکے دیے تو اپنا سر پیچھے کرتے ہوئے شاہ زیب نے ناز کو پیچھے دھکیل دیا۔ نازنین اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور لڑکھڑا کر زمین پر گر گئی۔ رامین اس کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ ماما کے گرتے ہی اسے بھی سانپ سونگھ گیا تھا۔ زمین پر گری ناز بے یقینی سے بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔ اسے ہرگز ایسے ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ اس نے فورا" اونچی آواز میں رونا پیٹنا شروع کر دیا' ساتھ ساتھ وہ شاہ زیب کو منہ بھر بھر کے بددعائیں بھی دینے لگی۔ رامین بھی اپنے آنسو روک نہیں پائی تھی لیکن جب اس کی نظر شاہ زیب کے چہرے پر پڑی تو وہ اپنا رونا بھول گئی۔ شاہ زیب کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا جیسے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔

"بھائی۔۔۔!" رامین اسے پکارتی ہوئی آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ اس کی پکار نہیں سن رہا تھا' کیوں کہ وہ خود بھی کچھ بڑبڑا رہا تھا اور جو وہ کہہ رہا تھا۔ رامین بخوبی سن سکتی تھی۔ وہ اس کے بالکل پاس آ چکی تھی۔

"میں نے اپنی ماں پر ہاتھ اٹھایا۔۔۔ میں تو جہنمی ہوں۔" اس کی آواز خود بہ خود بلند ہوتی گئی۔ وہ رامین کو اپنے حواسوں میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے لاکھ پکارنے اور جھنجھوڑنے کے باوجود وہ مسلسل اسی ایک جملے کی گردان کیے جا رہا تھا۔

"میں جہنمی ہوں۔۔۔ میں جہنمی ہوں۔۔۔ میں دوزخ میں جاؤں گا۔" بلک بلک کر روتا ہوا وہ زمین پر بیٹھ گیا' پھر سجدے میں گر کر اللہ سے معافیاں مانگنے لگا۔ اس کے رونے کی آواز اتنی شدید تھی کہ رامین کو اپنا دل پھٹتا محسوس ہوا۔ اسے ماں کے واویلوں کی فکر نہیں تھی جنہیں وہ ہر روز سنا کرتی تھی' اسے اپنے بھائی کی فکر تھی جسے وہ پہلی بار اس طرح ٹوٹ کر بکھرتے ہوئے دیکھ رہی تھی' لیکن بے بس تھی۔ چاہ کر بھی وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر پا رہی تھی۔ اس نے سوچا' اپنے روتے بلکتے بھائی کو دو گھونٹ پانی پلا دے تاکہ وہ سنبھل جائے۔

وہ گرتی پڑتی اٹھی اور بھاگ کر کچن میں پہنچی۔ پانی نکالا اور واپس ہال میں داخل ہوتے ہی اس نے شاہ زیب کو تیزی سے اٹھ کر داخلی دروازے سے باہر نکلتا دیکھا۔

رامین اس کے پیچھے لپکی' لیکن وہ اپنی بائیک لے کر نکل گیا۔ ایک بار بھی اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ رامین ہزار اندیشوں میں گھری اندر آ گئی۔ ناز اٹھ کر اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔ وہ بھی گھسٹ گھسٹ کر قدم اٹھاتی اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔

پھر وہ کرنٹ کھا کر اٹھی اور بابا کو فون ملانے لگی۔

عبید فورا" ہی گھر واپس آ گئے۔ رامین سے پورا واقعہ جان لینے کے بعد وہ بھی سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ شاہ زیب کے دوستوں کو فون کیا' مگر کسی کو اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ آخری دن تھا۔ جب رامین نے بھائی کی صورت دیکھی تھی۔

☼ ☼ ☼

نازنین فاتح کے روپ میں مسلسل آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے اپنا آپ ثابت کرنا تھا۔ سب سے بڑھ کر عبید کی نظروں میں ستائش دیکھنے کی تمنا اسے ہمت ہارنے نہیں دے رہی تھی۔ اسے یقین تھا' ایک نہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب عبید الرحمٰن اپنی شکست تسلیم کر لیں گے۔

اپنی ہر کامیابی اور اس پر حاصل ہونے والی ستائش کے قصے بڑھا چڑھا کر عبید کے سامنے سنانے کا کبھی حسب منشا نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ پوری دنیا اس کی صلاحیتوں کی معترف تھی' سوائے اس ایک شخص کے۔

عملی طور پر رامین باپ کے اصولوں کے مطابق چل رہی تھی۔ شاہ زیب پہلے پہل اس کے دکھڑے سن کر عبید سے جھگڑ لیتا تھا' پر اب تو وہ بھی بے نیاز نظر آتا۔ رامین باپ کے سائے میں چلی گئی اور شاہ زیب تو جنگ بیچ میں ہی چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

بھائی بہنوں نے اسے بہت پہلے تنہا کر دیا تھا۔ رہی سہی کسر وہ خود وہاں جا کر پوری کر آئی تھی۔ امریکا میں تینوں بھائی بہنوں کے گھر کا عیش و آرام' ازدواجی زندگی کی خوشیاں' ہنستے کھلکھلاتے چہرے اسے شدید محرومی میں مبتلا کر رہے تھے۔ سب ہی خوش تھے۔

محسنہ بیگم فوت ہو گئیں تو بھائی مکان بیچنے پاکستان آیا۔ عبید سے کسی معمولی بات پر جھگڑ کر وہ اس کے پاس ہوٹل میں آئی کہ شاید بھائی کی غیرت جوش میں آ کر عبید کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دے۔ سب کچھ الٹ ہو گیا۔ طارق اسے خود شوہر کے پاس چھوڑ گیا' عبید سے معافی مانگ کر۔ گویا ناز کو اس کے قدموں میں پھینک دیا۔ ذلت ہی ذلت تھی۔

آراستہ محل جہنم سے کہیں زیادہ جھلسائے دے رہا تھا۔ ہر مکین عذاب جھیل رہا تھا۔

شاہ زیب کے بعد عبید الرحمان تھے جنہیں رہائی نصیب ہوئی تھی مرنے کے بعد۔

☼ ☼ ☼

زین کا کمرا سگریٹ کے دھوئیں سے بھرتا جارہا تھا۔ اسے اپنے فیصلے پر کوئی ملال ہرگز نہیں تھا۔ لیکن ہاں۔۔۔ اتنے سالوں بعد رامین کو دیکھ کر وہ ٹھٹک ضرور گیا تھا اور اب سگریٹ پیتے دھوئیں کے مرغولے اڑاتا رامین کے بارے میں سوچ رہا تھا' جو کبھی اس کی بیوی تھی۔ لندن سے ایم بی اے کرنے کے بعد جب وہ پاکستان واپس آیا تو اس کے والد صدیقی صاحب نے اس خوشی کو منانے کی غرض سے اپنے تمام دوستوں اور رشتہ داروں کو دعوت دی اور یہیں پہلی بار اس نے رامین کو دیکھا تھا۔

وہ اپنی ماں کی ایک عزیز دوست کی بیٹی سے پیچھا چھڑانے کا کوئی بہانہ تلاش کررہا تھا' جو پچھلے آدھے گھنٹے سے اسے متاثر کرنے کی کوشش میں ہلکان ہوئی جارہی تھی۔ سخت بے زاری کے عالم میں وہ اس کی بے سروپا باتیں سنتا ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ دعوت میں زیادہ تعداد ایسی خواتین کی تھی جنہیں اپنی کنواری بیٹیوں کے لیے "زین" ایک بہترین شوہر کے روپ میں نظر آیا تھا۔ قریبا" ہر عورت اسے اپنی بیٹی سے ضرور ملوانا چاہتی تھی اور وہ لڑکیاں خود کو سر سے پیر تک یوں سجابنا کر اس کی سامنے آئی تھیں جیسے آج ہی رات وہ منگنی کی تقریب بھی کرڈالے گا۔ سخت کوفت کے عالم میں وہ اس لڑکی کے پاس سے اٹھ کر اپنے والد کی طرف چلاآیا۔ صدیقی اور عبید الرحمان ملکی سیاست پر بحث کرنے میں مصروف تھے' وہ چپ چاپ کھڑا ان کی گفتگو سننے لگا۔ کچھ دیر بعد عبید نے گھڑی دیکھی اور چلنے کی اجازت چاہی۔ پھر رامین کی تلاش میں انہوں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو وہ انہیں ایک کونے میں بیٹھی نظر آگئی۔ صدیقی صاحب نے عبید کو روک لیا اور زین سے کہا وہ جاکر رامین کو بلالائے۔

" زین وہ بچی جو بیٹھی ہے لاسٹ ٹیبل پر۔۔۔ اسے بلا کرلاؤ' رامین ہے اس کا نام۔"

زین نے اپنے والد کی نشاندہی پر اپنے قدم اس طرف بڑھادیے جہاں وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اگر صدیقی صاحب اسے بلانے کے لیے زین کو نہ بھیجتے تو شاید اسے کبھی معلوم نہ ہوپاتا کہ یہ لڑکی بھی اس دعوت میں شریک ہے۔ وہ دو گھنٹوں میں ایک لمحے کے لیے بھی اس کے سامنے نہیں آئی تھی اور اسی لیے زین اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ فان کلر کے سادہ سے کاٹن کے شلوار قمیص پر چادر نما دوپٹا اوڑھے وہ ٹیبل پر ساتھ بیٹھی کسی باتونی خاتون کی باتوں پر محض ہوں ہاں کیے جارہی تھی۔ کانوں میں سونے کی چھوٹی سی بالیاں اور سفید کانچ کی چوڑیاں۔۔۔ اس نے یہی سنگھار کیا تھا بس۔۔۔ اس کے ہلکے براؤن بالوں کی لمبی چٹیا کاندھے سے ہوتی کہنی تک آکر رکی تھی اور مانگ کشادہ پیشانی سے صاف لکیر کی صورت نکلتی چلی گئی تھی۔ زین نے اس کے بالکل پاس آکر اس کا نام پکارا۔

"رامین۔۔۔!" وہ چونک کر سیدھی ہوگئی۔

"آپ کے پاپا بلا رہے ہیں آپ کو۔۔۔ عبید انکل۔۔۔" وہ اس کی حیرانی دور کرنے کے لیے ان کا نام لے کر اسے ساتھ چلنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ کچھ لمحوں پہلے کی بے زاری اڑنچھو ہوگئی تھی۔ اب وہ نہایت دلچسپی سے زیر لب مسکراتے ہوئے اس کی شہد رنگ آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ رامین نے ایک نظر دور بیٹھے صدیقی انکل کے ساتھ باتوں میں مصروف اپنے پاپا کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ زین نے دیکھا اس نے پیروں میں کھسہ پہنا ہوا تھا' ہیل سلیپرز نہیں۔۔۔ آج کے دور میں بھی ایسی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ اسے حیرت ہورہی تھی۔ دس پندرہ قدم چلتے ہوئے رامین نے ایک بار بھی اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا جبکہ وہ مسلسل اسی کو دیکھ رہا تھا۔

"میرا نام زین ہے۔۔۔ میں آپ کے پاپا کے دوست شہاب صدیقی کا اکلوتا بیٹا ہوں۔۔۔ ابھی ایم بی اے کرکے لوٹا ہوں لندن سے۔۔۔ ڈیڈ نے میری اسی کامیابی کو سیلیبریٹ کرنے کے لیے یہ پارٹی دی جس میں آکر آپ بہت بور ہوئیں۔" وہ براہ راست اس کی حیران آنکھوں میں دیکھتا ہوا بیچ راستے میں رک گیا۔ کیوں کہ وہ بھی ٹھہری گئی تھی۔

"نہیں۔۔۔ میں بور نہیں ہوئی۔" وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی۔ زین کی پرشوق نگاہیں اس کے وجود سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ وہ آگے بڑھ گئی۔ زین اسے خاموشی سے جاتا دیکھتا رہا۔ اسے پہلی بار کوئی لڑکی اچھی لگ رہی تھی۔

دوسری ملاقات ایک ریسٹورنٹ میں ہوئی۔ وہ ڈنر عبید الرحمان کی طرف سے تھا۔ پچھلی بار کی طرح اب بھی اس نے مدھم رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ یا تو وہ سادگی پسند تھی یا پھر اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ آج کل کیا فیشن چل رہا ہے۔ زین کو اسے دیکھ کر یہی خیال آیا۔

حیرت تو رامین کو اپنے پاپا پر ہورہی تھی۔ وہ آج کل اسے بہت سی جگہوں پر اپنے ساتھ لے کر جارہے تھے اور وہ جہاں بھی جاتے وہاں زین ضرور موجود ہوتا۔ وہ کیا چاہ رہے تھے' یہ الجھن تین ہفتوں بعد ہی سلجھ گئی۔ جب پاپا نے اسے بتایا کہ زین اس سے شادی کرنا چاہتا ہے اور عبید اس رشتے سے بہت خوش ہیں۔ اس کوئی اعتراض نہ ہوا۔

نکاح ہوجانے کے بعد وہ بہت پرامید ہوگئی تھی۔ کچھ ہی مہینوں کی بات تھی اب۔۔۔ اور پھر وہ اس زنداں سے آزاد ہوجاتی ہمیشہ کے لیے۔

زین اس سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔ کبھی فون کرتا' کارڈز بھیجتا اور اکثر اوقات کوریر سے پھول اور چاکلیٹس بھجوایا کرتا تھا۔ اس کے لیے رامین ایک بند کتاب کی مانند تھی' جس کے ہر صفحہ پر لکھی تحریر وہ پڑھنا بھی چاہتا تھا اور سمجھنا بھی۔ کچھ چہرے ایسے ہوتے ہیں جن پر نظر ڈال کر ہٹالینا آسان ہوتا ہے کہ ان چہروں پر ہر جذبہ بہت واضح نظر آتا ہے۔۔۔ لیکن رامین۔۔۔ اس پر ایک نظر ڈال لینے کے بعد۔۔۔ ہٹالینا اتنا سہل ہرگز نہیں تھا۔ اس کی خاموشی میں پراسراریت تھی اور سنہری آنکھوں میں حزن و ملال تیرتا تھا۔

جب وہ بات کرتی تو رخسار دہکنے لگتے تھے اور مسکراتی تو اس کی آنکھیں ماتم کرتی نظر آتی تھیں۔ وہ خوش ہے یا اداس' محتاط ہے یا ناراض' کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ جو وہ ظاہر کرتی اس پر یقین نہیں آتا تھا اور جو کہتی۔۔۔ آنکھیں اس کا انکار کرتی نظر آتیں۔ عجب "ہاں ناں" کا کھیل تھا۔ زین اس کی پرکشش شخصیت کے سامنے خود کو بالکل بے بس پارہا تھا۔

اکثر اوقات وہ عبید کی اجازت لے کر اسے اپنے ساتھ کہیں لے کر جانا چاہتا تو نازنین اس کی طرف سے انکار کردیتی۔

"وہ ہچکچارہی ہے ذرا۔۔۔ تمہیں جانتی نہیں ہے۔۔۔ گھبراتی ہے۔" اس کا عذر زین کی سمجھ سے بالاتر تھا' وہ اسے جان لے۔۔۔ سمجھ لے اسی لیے تو اسے اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتا تھا' لیکن لاکھ کوشش کے باوجود وہ نکاح سے پہلے رامین کے ساتھ تھوڑا سا بھی وقت گزار نہیں پایا۔ وہ تو نکاح کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ابھی صرف منگنی کرنے کی خواہش تھی اس کی' لیکن شہاب صدیقی نے اسے سمجھایا کہ عبید نکاح کا فنکشن ابھی کرنا چاہتا ہے۔۔۔ پھر تین ماہ بعد رخصتی ہوجائے گی۔ زین تھوڑی پس و پیش کے بعد مان گیا تھا۔ وہ پسند آہی گئی تھی تو نکاح کرلینے میں بھی کوئی حرج نہیں تھا۔ کم از کم نکاح کے بعد وہ اس کے ساتھ ہر جگہ آنے جانے کے لیے آزاد ہوتی۔

اس نے رامین کو کیوں چھوڑا؟

جو "وجہ" اس وقت نہایت اہم تھی' آج بے حد معمولی محسوس ہورہی تھی۔ نکاح ہوجانے کے ایک ہفتے بعد ہی وہ رامین کو اپنے ساتھ ڈنر پر لے کر گیا۔ اس رات جو کچھ اس نے دیکھا۔۔۔ کیا صرف اس بنا پر وہ اتنا بڑا فیصلہ کر بیٹھا تھا۔

"نہیں۔۔۔" اس فیصلے میں اس رات اس کے لیے مشاہدے سے زیادہ رامین کی ماما کی باتوں کا اثر موجود تھا۔ وہ جب بھی اس سے ملا' اسے کچھ عجیب سا محسوس ہوتا تھا۔ وہ جانے اپنی بیٹی کا ایسا کون سا راز جانتی تھی جو اسے بتاتے ہوئے رک سی جاتی تھی۔ کبھی وہ اس سے رازداری سے نزدیک ہوکر پوچھتی۔

"تم سے فون پر ہنس ہنس کے باتیں نہیں کرتی۔" وہ صرف مسکرا کر رہ جاتا' جس پر نازنین برا سامنہ بنا کر

پیچھے ہٹتے ہوئے زیرِ لب کہتی۔
"وہ ابھی تک بھول نہیں پائی اسے۔" اور یہ زیرِ لب کہے گئے الفاظ اتنی آواز ضرور رکھتے تھے کہ ساتھ بیٹھا زین چونک جاتا۔ کیا رامین کسی کو پسند کرتی تھی؟ وہ صرف سوچتا، پوچھ نہیں سکتا تھا۔
ایک بار وہ "آراستہ محل" جان بوجھ کر اس دن آیا، جب رامین کے والدین گھر پہ نہیں تھے۔ گارڈ اسے پہچانتا تھا اس لیے اندر جانے دیا تھا۔ گھر میں داخل ہو کر وہ رامین کو سرپرائز دینے کی غرض سے اس کے کمرے کی طرف بڑھا تو اسے رامین کے زور زور سے رونے کی آواز آئی۔ وہ چیخ چیخ کر روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
"میں آپ کو بہت یاد کرتی ہوں۔۔۔ بہت زیادہ۔۔۔ آپ کہاں چلے گئے ہیں مجھے چھوڑ کر۔۔۔ واپس آجائیں۔۔۔ پلیز۔" وہ بلکتے ہوئے کیا اس شخص کو یاد کر رہی تھی جس کا ذکر ناز آنٹی کر رہی تھیں؟ یہی سوچتا وہ گھر سے باہر نکل آیا رامین سے ملاقات کیے بغیر۔
اور پھر ڈنر پہ لے جاتے ہوئے۔۔۔ رامین کا رویہ وہاں اس کی گفتگو۔۔۔ ناز آنٹی کے معنی خیز اور مبہم انکشافات، واپسی پر اس نے ایک منٹ نہیں لگایا تھا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ رامین اس کے لائق نہیں تھی۔ اس وقت زین نے اپنے حق میں بہترین فیصلہ کیا تھا۔ آج وہ اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ ایک خوش و خرم زندگی بسر کر رہا ہے۔ بھلا رامین جیسی لڑکی اسے آسودہ کر سکتی تھی؟ وہ تو سائیکو تھی۔
زین کو ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ رامین کن حالات میں زندگی گزار رہی ہے۔ کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ جو زخم کھائے، درد صرف اسی کو ہوتا ہے، لہو بھی اسی کا بہتا ہے۔ نشان بھی اسی کے جسم پر باقی رہ جاتا ہے۔ کسی اور کا کچھ نہیں بگڑتا۔۔۔ نہ زخم دینے والوں کا۔۔۔ نہ ہی دیکھنے والوں کا۔
وہ زین کے ساتھ پہلی بار اکیلی ڈنر کرنے آئی تھی۔ گھر سے یہاں آنے تک جانے کتنی بار وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر چکی تھی مگر بے سود۔
زین کے ساتھ کار میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے وہ بے حد خوش بھی تھی اور بے تحاشا نروس بھی۔ کسی مرد کے اتنے قریب اور وہ بھی تنہائی میں۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع تھا۔ زین کے تیز کلون کی خوشبو اس کے آس پاس رقص کرتی، ل میں ہلچل مچانے لگی۔ پھر زین اپنی کار ریورس کرنے کے بعد گیٹ سے باہر نکل رہا تھا تو وہ پیچھے رہ جانے والے آراستہ محل کو گردن موڑ کر لمحہ بہ لمحہ خود سے دور ہوتے دیکھ رہی تھی۔ ایک دن آئے گا جب وہ ہمیشہ کے لیے اس گھر کو چھوڑ چلی جائے گی پھر کبھی اسے نہ مڑ کر دیکھے گی۔ کبھی بھی نہیں۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے پکا وعدہ کر لیا اور پھر اچھل کر سیدھی بیٹھ گئی اور تالی مار کر بے ساختہ ہنسی۔
زین نے موڑ مڑتے ہوئے اسٹیئرنگ گھمانے کے ساتھ ہی ایک حیران سی نظر اس پر ڈالی۔
"از ایوری تھنگ اوکے؟ زین نے اپنی نظر سامنے مین روڈ پر رکھتے ہوئے اس سے سوال کیا۔ رامین نے اس کے سوال کے جواب میں زور سے ہنستے ہوئے ۔۔۔ یس کہا۔ وہ اب اس کا شوہر تھا۔ اپنی خوشی، اپنا غم وہ سب کچھ اسی سے شیئر کرنا چاہتی تھی۔ اس نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ عبید کا پڑھایا تلقین کا پہاڑہ وہ روز دہراتی۔ وہ ہمیشہ اچھی بیوی بننے کے خواب دیکھتی آئی تھی۔ اب وہ بیوی بن چکی تھی۔ اسے اچھی بیوی بن کر دکھانا تھا۔ زین کی فرمانبرداری میں آخری حد تک جانا تھا تاکہ وہ اپنے انتخاب پر فخر کر سکتا۔
زین نے پھر کچھ اور نہیں پوچھا تھا۔ وہ نہایت سنجیدگی سے ڈرائیو کرتا اپنے چائنیز ریسٹورنٹ کے سامنے پہنچ گیا۔ اب وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔
کار میں انتہائی خوش دکھائی دیتی رامین کے چہرے پر اب ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس میں بھلا اس کا قصور بھی کیا تھا۔ ریسٹورنٹ میں بیٹھا ہر شخص اسے بری طرح گھورے جا رہا تھا۔ ان کے ساتھ تمام ویٹرز اور استقبالیہ پر موجود منیجر بھی اس کی طرف متوجہ تھے۔ کم از کم اسے تو یہی محسوس ہو رہا تھا۔ وہ باری باری ہر ایک کا چہرہ دیکھنے لگی۔ آخر سب اسے دیکھ کر مسکرا کیوں رہے ہیں؟
زین مینو کارڈ دیکھ رہا تھا پھر اس نے اشارے سے ویٹر کو بلایا پھر کچھ سوچ کر رامین سے کہا کہ وہ اپنی پسند سے آرڈر کرے۔ رامین گڑبڑا کر زین کی شکل دیکھنے لگی۔ وہ اپنی مرضی سے آرڈر کر دیتی اور زین کو پسند نہ آتا تو اس کا ڈنر خراب ہوتا۔ وہ ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس وقت وہ یہ سب کچھ اسے سمجھا نہیں سکتی تھی۔
"مم۔۔۔ مم۔۔۔ میں ۔ نہیں۔۔۔ میں کوئی آرڈر نہیں کروں گی۔ آپ کو جو اچھا لگے منگوالیں۔ میں شوق سے کھالوں گی۔ میں تو پیاز روٹی بھی شوق سے کھا لیتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پھر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ شکر ہے سب لوگوں نے اسے گھورنا تو بند کیا۔ اپنے وجود سے چمٹی آنکھوں کی تعداد میں کمی باعث تسکین تھی۔
زین نے ایک گہری سانس لے کر خود ہی آرڈر لکھوانا شروع کر دیا۔ وہ رامین کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہا تھا اور وہ ہرگز اسے نارمل نظر نہیں آ رہی تھی۔ یا ہو سکتا ہے وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہی ہو۔
"رامین"۔
زین نے اس کا نام لیا، اس نے سنا ہی نہیں۔ وہ اپنی کہنیاں میز پر ٹکائے بیٹھی تھی اور مٹھیوں میں اپنی ٹھوڑی پھنسائے ہوئے سر جھکایا ہوا تھا۔ البتہ اس کی آنکھیں ترچھی ہو کر دائیں سے بائیں حرکت کر رہی تھیں۔ زین نے اسے دوبارہ تھوڑا نزدیک ہو کر آواز دی تو وہ فوراً" اچھل کر سیدھی ہوئی اور پھر بے ہنگم طریقے سے ہنس پڑی۔
"ہائے میں ڈر گئی تھی۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اسے توقع تھی کہ زین بھی ہنس دے گا۔ لیکن زین ضرورت سے زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ رامین کی مسکراہٹ سکڑتی سمٹتی معدوم ہو گئی۔ زین کی جانچتی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ بہت سوچنے کے بعد اس نے کہا۔
"میں تم سے کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں۔ صرف سچ کہنا! جو بھی تمہارے دل میں ہو، بے دھڑک کہہ دینا۔ یہ مت سمجھنا کہ مجھے برا لگے گا۔ میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مناؤں گا۔ لیکن اگر تم نے مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو میں برداشت نہیں کروں گا۔ تم سمجھ گئیں میں تم سے کیا کہہ رہا ہوں۔"
وہ تھوڑا آگے ہو کر رامین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ جواب میں رامین نے بچوں کی طرح سر کو ہاں میں کئی بار ہلایا۔ زین نے کہنا شروع کیا۔
"میں نکاح سے پہلے بھی کئی بار تم سے ملنے کی کوشش کرتا رہا۔ فون کرتا رہا۔ ملنے سے تمہارا گریز اور فون پر ہوں ہاں سے زیادہ گفتگو نہ کرنا میری سمجھ سے باہر تھا۔ میں منگنی کرنا چاہتا تھا۔ تمہارے بابا نے نکاح کی بات چھیڑ دی۔ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ اس لیے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ لیکن میں کچھ باتوں کو کلیر چاہتا ہوں۔"
وہ اک لمحہ رکا، شاید رامین کوئی سوال کرے لیکن وہ پورے انہماک سے پلکیں جھپکائے بغیر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"ناز آنٹی کی باتوں نے مجھے الجھا دیا ہے۔ کیا تم مجھے بتاؤ گی کہ تم اس ۔۔۔ شادی سے خوش ہو یا نہیں؟"
وہ جاننا چاہتا تھا کہ ناز بیگم کی مبہم گفتگو کے پیچھے ماضی کی کون سی کہانی چھپی ہوئی ہے۔ اس لیے رامین کا جواب اہم تھا۔
"میں۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اسے اپنی مسرت کے اظہار کے لیے مناسب لفظوں کی کمی کا سامنا تھا۔ "میں تو خوشی سے بھی زیادہ خوش ہوں زین! مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا میں آپ کو کیسے بتاؤں۔ میں۔ میں۔" وہ پھر ہکلاتے ہوئے با آوازِ بلند سوچ رہی تھی۔ اس کے واضح اقرار کے باوجود وہ مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے ایک اور ملتا جلتا سوال پوچھ لیا۔
"میں تمہیں کیسا لگتا ہوں؟ پسند کرتی ہو مجھے؟"
زین کے دل میں شکوک شبہات کی دیوار کافی بلند ہو چکی تھی۔ جس ردعمل کی توقع اس نے کی تھی، وہ

اسے نہیں ملا تھا۔

رامین نے متعدد بار اپنی پلکیں تیزی سے جھپکائیں۔ وہ کیا بتاتی کہ زین اس کے لیے کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ جو بھی دل میں ہے 'بے دھڑک کہہ دے۔ وہ کیسے بتاتی کہ اگر وہ ہینڈسم اور گڈ لکنگ ہے اور رامین کو پسند کرتا ہے تو یہ رامین کی خوش قسمتی تھی لیکن وہ دنیا کا بدصورت ترین شخص بھی ہوتا تو بھی اسے زین سے محبت ہو جاتی۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ اس کے لیے کس قدر اہمیت رکھتا ہے۔ یہ موقع اظہار کا تھا۔ اسے ضائع کرنا یقیناً" بے وقوفی ہوتی۔

"میں آپ کو پسند نہیں کرتی۔ شدید محبت کرتی ہوں آپ سے۔" زین گھبرا گیا۔ وجہ رامین کے الفاظ نہیں انداز تھا۔ وہ عجب وحشت سے بھری آنکھوں کو بساط بھر پھیلا کر کہنے لگی۔ "آپ میرے نجات دہندہ ہیں۔ آپ تو مجھے بچانے آئے ہیں۔ مجھے اندھیروں سے نکالنے آئے ہیں۔ آپ نہ آتے تو میں مرجاتی۔ میں مرجاتی۔" اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

"آپ کو پتا ہے میں کتنی بے قرار ہوں۔ ایک ایک پل گن گن کر گزارتی ہوں کہ کب میری شادی ہوگی۔ میں رخصت ہو کر ہمیشہ کے لیے آپ کے پاس آجاؤں گی۔ آپ انکل آنٹی سے کہیں نا۔ وہ اگلے ہفتے ہی رخصتی کروالیں۔ میں اب اور انتظار نہیں کرسکتی۔"

رامین نے روتے ہوئے زین کا ہاتھ پکڑ لیا۔ زین نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تو وہ منہ بسور کر بولی۔

"آپ کو یقین نہیں آرہا۔ سچ مانیں میں آپ سے بہت پیار کرتی ہوں۔ آپ جو کہیں گے میں کروں گی۔ کبھی لڑائی نہیں کروں گی۔ آگے سے جواب نہیں دوں گی آپ کے ممی پاپا کی بہت خدمت کروں گی۔ میں کبھی بچوں کو ان کے خلاف نہیں بھڑکاؤں گی۔ میں اپنی خدمت اور فرماں برداری سے سب کا دل جیت لوں گی۔ آپ دیکھیے گا میں۔۔۔" ویٹر کھانا سرو کرنے لگا تھا لیکن وہ اپنی کہتی جارہی تھی تو زین کو روکنا پڑا "پلیز رامین چپ ہو جاؤ۔" اور وہ ایسے خاموش ہوئی جیسے ریموٹ کا بٹن دبتے ہی ٹی وی بند ہو جاتا ہے۔

زین کی بھوک پیاس سب اڑ چکی تھی۔ لیکن رامین نے بہت رغبت سے کھانا کھایا۔ بالکل چپ چاپ۔ اسے زین نے خاموش رہنے کے لیے کہا تھا 'اب جب تک زین خود نہ کہتا 'وہ کچھ بول نہیں سکتی تھی۔ اسے ناز جیسا تھوڑی بننا تھا وہ تو ایک اچھی بیوی بننا چاہتی تھی۔ زین پہاڑ سے کودنے کو بھی کہہ دیتا تو وہ کود جاتی۔ انہی سوچوں میں غلطاں وہ اپنی فرماں برداری کا بہترین مظاہرہ کررہی تھی۔ خاموش رہ کر۔

خاموش تو زین بھی رہا۔ کھانا کھانے کے بعد بھی' گاڑی میں بیٹھنے کے بعد بھی اور رامین کو گھر تک پہنچانے کے بعد بھی۔ اس نے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ مگر گھر آکر شہاب صدیقی کے سامنے جو کچھ اس نے کہا وہ بالکل غیر متوقع تھا۔

"زین! تم کیا کہہ رہے ہو؟" اس کے والدین حق دق رہ گئے تھے۔ ابھی ایک ہفتے پہلے اس کا رامین کے ساتھ نکاح ہوا تھا اور اب وہ اسے طلاق دینا چاہتا تھا۔

"ڈیڈ! وہ لڑکی سائیکو ہے۔"

"یہ تمہیں اب معلوم ہوا ہے۔۔۔ نکاح کے بعد؟"

"غلطی میری نہیں آپ لوگوں کی ہے ڈیڈ! وہ آپ کے دوست کی بیٹی ہے۔ میں نے تو صرف پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ یہ آپ کی ذمہ داری تھی کہ اچھی طرح چھان بین کرتے۔ وہ لڑکی بالکل پاگل ہے ڈیڈ! اسی لیے ناز آنٹی اسے میرے ساتھ کہیں آنے جانے نہیں دے رہی تھیں۔ عبید انکل نے بھی ہمیں چیٹ کیا۔ زبردستی نکاح کروا کر ہمیں باؤنڈ کردیا۔ انہیں بھی اپنی پاگل بیٹی سر سے اتارنے کی اتنی جلدی تھی۔ اور وہ رامین۔۔۔ وہ تو فوراً" ہی رخصتی چاہتی ہے۔ کہہ رہی تھی مجھ سے انتظار نہیں ہورہا۔ یہ کس قسم کے لوگوں میں رشتہ کیا ہے آپ نے۔"

اس کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ اور شہاب صدیقی کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں تھے۔ رامین ان کے عزیز دوست کی بیٹی تھی۔ وہ اس کے متعلق کیا چھان بین کرواتے۔ آج ان کا بیٹا ہر الزام ان کے سر پر رکھ کر بری الذمہ ہو گیا تھا اور شاید وہ صحیح کہہ

رہا تھا۔ غلطی تو ہو گئی تھی۔

لیکن عبید سے بات کرنا بھی ضروری تھا۔ انہوں نے فوراً" عبید کا نمبر ملایا۔ رسمی سلام دعا کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ عبید ان دنوں شہر سے باہر ہیں۔ یہ بات فون پر کرنے والی نہیں تھی سو انہوں نے یہ کہہ کر فون بند کردیا کہ جب واپس آؤ گے تب مل کر بتاؤں گا۔ وہ صبر اور حوصلے سے یہ معاملہ سلجھانا چاہتے تھے۔ لیکن یہ صبر اور حوصلہ زین میں نہیں تھا۔ اسے شک تھا کہ عبید انکل اپنی دوستی کا واسطہ دے کر شہاب صاحب کو مجبور کردیں گے اور اس کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ وہ اگلے ہی دن اپنے ایک دوست وکیل سے ملا اور رامین کو طلاق کے کاغذات بھجوا دیے۔

زین نے اسے مسترد کیا تھا جیسے ناز نے کیا تھا 'عبید نے کیا تھا۔ بھائی بھی اسے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ کیا وہ کسی کے لیے بھی اہم نہیں ہے۔ "جیسی" وہ ہے کسی کے لیے بھی قابل قبول نہیں ہے۔ ناز کو جیسی بیٹی چاہیے تھی وہ "ویسی" نہیں تھی۔ پاپا جو اسے بنانا چاہ رہے تھے وہ ویسی بھی نہیں بن سکی اور زین۔۔۔ اپنے تمام وعدے وعید اور محبت کے اظہار کے باوجود اسے مسترد کرکے چلا گیا۔ "مسترد اور غیر ضروری" اس کی پیشانی پر لکھا تھا۔

پاپا شہر سے باہر تھے انہیں دیر سے پتا چلے گا۔ ناز نے پیپرز کھول کر پڑھے تھے اور ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف اچھال کر بولی۔

"تو مجھے ڈائیورس دلوانا چاہتی تھی نا دیکھ تجھے طلاق ہو گئی۔ اب کہنا اپنے باپ سے تیری دوسری شادی کروادیں۔"

یہ اس کی بے حسی تھی یا اپنی بددعا پوری ہونے کی خوشی۔ رامین صدمے سے گنگ۔ بے حس و حرکت اس اسٹیمپ پیپر کو دیکھ رہی تھی جسے ناز نے فرش پر پھینک دیا تھا اور وہ ہوا سے اڑا کرتا اس کے پیروں کے پاس پھڑ پھڑا رہا تھا۔ قانونی طور پر اسے طلاق مل چکی تھی۔ وہ دیکھتی نہ دیکھتی کیا فرق پڑتا تھا۔

ہوا تھا۔۔۔ ایک بار ایسا ہوا تھا۔ رامین نے ایک رات ماں کی شدید مار کھانے کے بعد عبید کو اپنی بے بسی کا رونا روتے دیکھ کر یہی کہا تھا "ماما کو چھوڑ دیں۔۔۔ طلاق دے دیں۔"

وہ رو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کی ہڈی میں بہت درد ہو رہا تھا۔ ناز ہاتھوں کے بجائے اسے چیزوں سے مارتی تھی۔ پیتل کے گلدان' لکڑی کے وائپر' جوتے' بمبو اسٹک یا لوہے کا ڈسٹ بن۔۔۔ ہاتھ کی پہنچ میں جو شے آتی وہی اس کا ہتھیار بن جاتی۔

☆ ☆ ☆

"کیا وہ اتنا کمزور دل تھا۔۔۔ بیٹی برباد ہوئی اور اس نے موت کو گلے لگا لیا۔ وہ اتنی سی بات پر جان کی بازی ہار گیا۔۔۔ نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔"

اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ عبید' رامین کی طلاق کی خبر سنتے ہی ختم ہو گیا تھا۔

"کیسے؟ پیپرز تو میرے پاس تھے' اسے کیسے پتا چلا۔۔۔؟"

"ہاں شفیق الرحمان آئے تھے نا۔۔۔ ان کے پاس بیٹھا تھا وہ اس وقت صدیقی صاحب کا فون سن کر دل کا دورہ پڑا تھا اسے۔۔۔ یہی کہا تھا انہوں نے مگر میں نہیں مانتی۔ جھوٹ بولتے ہیں سب۔"

"عبید کی دولت پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں یہ لوگ۔۔۔ اس محل پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔"

وہ وحشت کے عالم میں آراستہ محل کے سارے دروازے کھڑکیاں بند کرنے لگی' کچھ دیر پہلے شفیق الرحمان آئے تھے۔ اس نے انہیں گھر میں داخل نہیں ہونے دیا تھا۔ دروازے کی درز سے روتے ہوئے بھائی کی آواز سنی تھی اس نے کہ۔۔۔ وہ بیوہ ہو گئی ہے۔۔۔ اس نے پھر بھی دروازہ نہیں کھولا تھا۔ رامین نے سب سن لیا تھا' وہ چیخی چلائی تھی۔ ناز پر کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ دروازہ کھول دیتی تو سب لوگ اس کے محل میں داخل ہو جاتے۔۔۔ اسے بے دخل کردیتے۔۔۔ وہ سب تو شروع دن سے اسے ناپسند کرتے تھے۔

"ہائے! میں کیا کروں؟ کتنا کہا تھا عبید سے یہ گھر میرے نام کردو۔۔۔ میرا بیٹا بھی مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔۔۔ میں در بدر ہو جاؤں گی۔۔۔ تنہا اکیلی کس کس سے لڑوں۔۔۔ کاروبار پر پہلے ہی قبضہ کر رکھا ہے۔"

ایک کے بعد ایک اندیشوں نے ذہن مفلوج کر کے رکھ دیا تھا اس کا۔ اوپر سے رامین کا اونچی آواز میں روئے چلے جانا۔

نازنے غصے میں آکر رامین کو جوتا کھینچ مارا "تو تو چپ کر۔۔۔ ماتم بعد میں کرلینا۔۔۔ مجھے سوچنے دے کچھ۔"

اور وہ حیرت سے گنگ رہ گئی۔ "ماں کو شوہر کی موت پر کوئی غم نہیں، ابھی بھی ذہن مستقبل کے تانے بانے بن رہا ہے۔"

وہ سسکتی ہوئی اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب چل پڑی۔ پیچھے سے نازنین خالی خالی نظروں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

رامین اپنے کمرے میں آکر اندر سے دروازہ بند کر کے خوب روئی تھی۔ بلک بلک کر روتے ہوئے اس نے شاہ زیب کو پکارا "بھائی! کہاں چلے گئے ہو۔۔۔ آکر دیکھو تو۔۔۔ پاپا ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔" وہ زور سے چیخی، پر شاہ زیب کہیں نہیں تھا۔ دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے وہ عبید کو یاد کرتی رہی۔ جانے کتنی دیر تک۔

نازنین کی عدت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی مگر مجبوری تھی اسے گھر سے باہر نکلنا پڑا۔ عبید کے بینک اکاؤنٹس اور بزنس شیئرز کے معاملے میں وہ شفیق الرحمٰن پر اعتبار نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے خاندانی وکیل سے رابطہ کیا اور وکیل کی بات سن کر اسے شدید دھچکا لگا تھا۔ عبید کا مکان دونوں بچوں کے نام پر تھا۔ نازنین کے لیے بینک میں کچھ رقم موجود تھی جسے وہ اپنی مرضی سے استعمال کر سکتی تھی اور بس۔۔۔ کاروبار کی تفصیلات اور ان کے پیپرز شفیق الرحمان کے پاس تھے۔ جس کے لیے اسے اپنے جیٹھ سے ملاقات کا مشورہ دیا گیا۔

نازنین نہایت مایوسی کے عالم میں گھر واپس آئی تھی۔ دو دن بعد اس کے چوکیدار نے ایک چیک لا کر دیا جو شفیق الرحمان نے بھجوایا تھا۔

"ڈیڑھ لاکھ۔۔۔" اس نے رقم دیکھ کر سر جھٹکا۔

"کروڑوں کا کاروبار ہڑپ کرنے کے چکروں میں ہیں۔ میرا منہ بند کرنے کو یہ چیک بھجوا دیا ہے۔"

"ہر مہینے اتنے پیسے بھجوایا کریں گے۔۔۔ اگر زیادہ کی ضرورت ہو تو بتا دیں۔۔۔" رامین اس کی بدگمانی پر خاموش نہ رہ سکی۔

"بات ہوئی تھی فون پر۔۔۔ تایا جان کہہ رہے تھے۔" اور اس سے پہلے کہ وہ بات مکمل کرپاتی۔ نازنین نے پاؤں سے جوتی اتار اسے مارنا شروع کردیا، رامین کی اپنی ذہنی کیفیت ایسی ہوگئی تھی کہ وہ خاموشی سے مار کھاتی رہی۔

اگلے ہی دن نازنین نے چوکیدار کو ہٹا کر کمپنی سے سیکیورٹی گارڈ بلوا لیا۔ گھر کا فون نمبر تبدیل کر لیا۔ ڈرائیور بھی نیا رکھ لیا اور ان تمام ملازمین کو یہی ہدایت تھی کہ کسی بھی شخص کو آراستہ محل میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ اور نہ ہی رامین کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت تھی۔ یہ تمام اقدامات ضروری تھے رامین کو تایا جان سے دور رکھنے کے لیے۔ اس خاندانی وکیل کے ذریعے شفیق الرحمٰن کو نازنین کے عدت ختم ہونے سے پہلے گھر سے باہر نکلنے کا جواز معلوم ہو چکا تھا۔ اسی لیے انہوں نے وہ چیک بھجوایا تھا۔ اس کے علاوہ راشن اور ضروری استعمال کی چیزیں بھی پہنچا دی تھیں۔ وہ بس اتنا چاہتے تھے کہ ناز اپنی عدت مکمل کیے بغیر گھر سے باہر نہ نکلے۔ انہوں نے رامین سے فون پر یہی بات کی تھی مگر نازنین کے لیے یہ سب خطرے کی علامات تھیں۔

شفیق الرحمٰن عبید کے جانے کے بعد پورے بزنس کو خود سنبھال رہے تھے۔ سب کچھ ان کے قبضے میں تھا۔ اگر رامین ماں کو چھوڑ اپنے ددھیال چلی جاتی تو نازنین اس گھر سے بے دخل ہو سکتی تھی۔

عدم تحفظ کے احساس نے بہت جلد اسے ایک نفسیاتی مریضہ بنا ڈالا۔ آدھی آدھی رات کو اٹھ کر پورے گھر میں کہرام مچا دیتی۔ عبید کی اسٹڈی کے کاغذات سب اٹھا کر زمین پر پھینک دیتی۔ پھر اس ڈھیر میں سے ایک ایک صفحہ اٹھا کر پڑھتی اسے غور سے دیکھتی، شاید عبید نے اس کے لیے کچھ لکھا ہو۔ آخر وہ ان کی بیوی تھی۔۔۔ ان کی محبت تھی۔ مگر کچھ نہ ملتا، وہ تھک ہار کر وہیں سو جاتی۔

اس نے پھر سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ پبلشرز سے بھی رابطہ ہو چکا تھا۔ صبح رامین پورے گھر کو نئے سرے سے درست کرتی، ماں کے پاس اوپر چلی آتی۔ جو بے سدھ پڑی سو رہی ہوتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں نے ناز چچی کو دیکھا تھا۔۔۔" نئے آؤٹ لیٹ کے افتتاح کے بعد عمر شفیق الرحمان کو گاڑی میں گھر چھوڑنے جا رہا تھا۔ تب ہی اس نے شفیق الرحمان کو بتایا۔ وہ چونک کر سیدھے ہو بیٹھے "کب؟"

"جب دکان کا ان آگوریشن (افتتاح) ہو رہا تھا، وہ وہیں پر موجود تھیں۔۔۔ پھر فوراً" چلی بھی گئیں۔"

"تم انہیں میرے پاس لے کر آتے۔۔۔ جانے کیوں دیا۔۔۔ یا کم از کم مجھے اس وقت ہی بتا دیتے۔"

"ابو! میرا نہیں خیال وہ آپ سے ملنے آئی تھیں۔" شفیق الرحمان نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔ سال ڈیڑھ سال ہونے کو آیا تھا انہوں نے رامین کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔

"پتا نہیں، کوئی مسئلہ نہ ہو۔۔۔ ہمارے پاس تو نمبر بھی نہیں ورنہ فون پر ہی رامین کی خیر خیریت معلوم ہو جائے۔"

"ابو! رامین آپی سے میری بات ہوتی رہتی ہے۔ میں اکثر فون کرتا ہوں انہیں۔"

عمر کی بات سن کر وہ حیران رہ گئے "تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"ابو! رامین آپی نے منع کیا تھا، انہیں ڈر تھا اس طرح ناز چچی کو خبر ہو جائے گی۔ میں جب ناز چچی کو گھر سے باہر نکلتے دیکھتا تو انہیں فون کرتا ہوں۔"

"لاؤ مجھے دو نمبر۔۔۔ میں بات کرتا ہوں خود اس سے۔۔۔ ابھی ناز گھر نہیں پہنچی ہوگی۔" شفیق الرحمان کے کہنے پر عمر نے ان کے موبائل سے آراستہ محل کا نمبر ڈائل کیا اور انہیں پکڑا دیا۔ فون چند بیلوں کے بعد ہی ریسیو کر لیا گیا تھا، وہ فوراً" کہہ اٹھے۔

"ہیلو رامین! میں تمہارا تایا جان بات کر رہا ہوں بیٹا! کیسی ہو؟ سب خیر خیریت ہے نا۔۔۔ تمہیں کسی چیز کی۔۔۔" اور فون دوسری طرف سے بند کر دیا گیا تھا۔ ان کی مایوس صورت دیکھ کر عمر نے موبائل اپنے ہاتھ میں لے کر کان سے لگایا، پھر سنجیدہ نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے فون آف کر دیا۔

"اس نے مجھ سے بات نہیں کی عمر۔۔۔ کیا وہ مجھ سے خفا ہے؟"

"نہیں ابو! ایسا نہیں ہے مجھے لگتا ہے ناز چچی گھر پر ہی ہیں۔۔۔" عمر نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا، اور جیسے ہی ان کی گاڑی اپنے گھر کی سڑک پر آئی، آراستہ محل کے باہر سیکیورٹی گارڈ سے باتیں کرتے ڈرائیور کو دیکھ کر اس کے شک کی تصدیق ہوگئی۔ نازنین گھر پر موجود تھی۔

☼ ☼ ☼

کچھ دن بعد رامین نے انہیں خود فون کیا۔ جو کچھ اس نے کہا۔ اسے سن کر وہ پریشان ہو گئے اور عمر کو ساتھ لے کر فوراً" آراستہ محل کی جانب چل پڑے آج انہیں وہاں جانے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

کھانا کھانے کے بعد اس نے کمرے کا دروازہ لاک کر لیا۔ الماری سے زیورات کا ڈبا نکالا اور اطمینان سے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

اگلے ہی لمحے دمکتے زیورات کی روشنی اس کے آس پاس پھیل گئی۔

سات سونے کے سیٹ، دو درجن چوڑیاں جن میں کچھ تو خالص سونے کی تھیں اور کچھ نگینوں والی۔ چار

www.paksociety.com

ہندوستانی طرز کے جڑاؤ کنگن بھی تھے۔ زمرد کی لڑیوں میں کندن کا لاکٹ اور بڑے بڑے جھمکے' سونے کی پازیب جس پر پان کے پتوں کے نیچے نازک گھنگھرو چھنک رہے تھے۔ اس کے علاوہ چاندی کی پائل اور سونے کے بچھودے بھی تھے۔ یہ سب کچھ بہت سالوں میں اکٹھا ہوا تھا' چھوٹی موٹی اور بھی کافی چیزیں تھیں۔ چھ سات ہیرے کی انگوٹھیوں کو ملا کر اکیس انگوٹھیاں تھیں' جو سیٹ کے علاوہ تھیں۔

بہت سے زیورات تو اس کی اور عبید کی لڑائی کے بعد عبید کی طرف سے صلح کا جرمانہ تھے۔

عبید ان زیورات کی باقاعدگی سے زکواة دیتے تھے۔ صبیحہ بیگم ان سے زکوة لے کر مستحقین میں تقسیم کر دیتی تھیں۔

"آئندہ اپنے زیور کی زکواة میں خود تقسیم کروں گی کوئی ضرورت نہیں ہے اپنی والدہ صاحبہ کو پیسے دینے کی۔" نازنین نے علیحدہ گھر میں آتے ہی فیصلہ سنا دیا تھا۔

عبید نے بحث میں جائے بغیر خاموشی اختیار کرلی اور اگلے سال سے انہوں نے زکوة کی رقم اس کے حوالے کردی تھی۔ جسے اس نے کام والی اور چند ماسیوں میں بانٹ دیا تھا مگر۔۔۔ کچھ عرصے بعد وہ اس فرض میں کوتاہی برتنے لگی۔

عبید کو تمام عمر معلوم نہیں ہوسکا تھا۔ مگر امین جان گئی تھی۔

اس نے خود پر پانی کی طرح روپیہ بہایا تھا۔ اسے بڑی تسکین ملتی تھی' جب قدسیہ' امی بیگم کے گھر خاص موقعوں پر ملنے کے لیے آنے والی بھابھی کو ہر دفعہ نئے زیورات میں لدا پھندا دیکھتیں تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتیں۔ یہ دیکھ کر نازنین کو بہت مزا آتا تھا۔ اب اس کے پاس زیورات کا بہترین کلیکشن موجود تھا۔

جیولری باکس الماری میں لاک کرنے کے بعد اس نے گھڑی کی جانب دیکھا گیارہ بج چکے تھے۔ وہ وضو کرنے کے لیے باتھ روم میں چلی گئی۔ اسے عشاء کی نماز پڑھنی تھی۔ وضو کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس آکر کھڑی ہو گئی' آسمان کی طرف دیکھا تو رات ساحروں کے اعمال کی مانند سیاہ اور تاریک تھی' کسی ٹمٹماتے تارے کی روشنی کا نقطہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آسماں پر گہرا سناٹا جیسے کسی طوفان کی آمد کا منتظر تھا۔ اس نے پردے کھینچ کر برابر کردیے اور نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔

ابھی نازنین کی نماز جاری تھی کہ کمرے میں کچھ سرسراہٹیں سنائی دینے لگیں۔ کون ہو سکتا ہے؟ دروازہ تو لاک کیا تھا میں نے۔۔۔

وہ نماز کی وجہ سے پیچھے مڑ کر نہ دیکھ سکی۔

التحیات پڑھتے ہوئے اس کی نظر اپنے سفید مرمریں ہاتھ پر ٹھہر گئی۔ اس نے شہادت کی انگلی اٹھائی پورے جسم نے گواہی دی۔۔۔ بس ایک دل۔۔۔ وہ خاموش رہا۔ اگر دل گواہی دیتا اور ثابت قدم رہتا تو عبادت خانوں میں بتوں کی موجودگی کا جواز نہ تھا۔

وہ سرسراہٹیں اب بڑھتی جا رہی تھیں۔ سلام پھیرتے ہی اس نے جلدی سے پیچھے مڑ کر دیکھا تو دہشت کے مارے اندر تک لرز گئی۔

اس کے کمرے میں سانپ ہی سانپ بھرے ہوئے تھے۔ سیاہ چمکیلے سانپ' ایک دوسرے پر چڑھتے اترتے پورے فرش پر دندناتے پھر رہے تھے۔ حتیٰ کہ دیواروں پر سجی اس کی تمام پورٹریٹس بھی ان لہردار اجسام کے پیچھے چھپ گئی تھیں۔ زمین پر رینگتے سانپ اس کی توجہ پاتے ہی اپنا پھن اٹھا کر کھڑے ہوگئے اور جھومنے لگے۔ خوف کے مارے اس کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہل نہیں پا رہی تھی کہ ایک سانپ رینگتا ہوا نماز کے مقام پر پہنچ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے ڈس لیتا' اس نے زوردار چیخ مارتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔

کچھ دیر تک وہ یونہی کان بند کیے آنکھیں میچ کر بیٹھی رہی۔ پھر کسی نے آہستگی سے کلائی پکڑی اور ہاتھ کان سے ہٹا دیا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں تو کمرا بالکل خالی پڑا تھا۔ نہ کوئی سانپ' نہ پھنکار نہ ہی سرسراہٹ۔ تو کیا۔۔۔ میں خواب دیکھ رہی تھی؟ اس نے حیرت سے سوچتے ہوئے اپنی کلائی کی طرف دیکھا' جسے کوئی اور ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ اس نے فوراً گردن گھما کر دیکھا تو آنکھیں دہشت سے پھیلتی چلی گئیں۔ وہ خود اپنے سامنے بیٹھی تھی۔

ابھی وہ سانپوں کے غائب ہونے کے بعد ٹھیک طرح سے سکون کا سانس بھی لے نہیں پائی تھی کہ دل پھر سے اچھل کر حلق میں اٹکا پڑا تھا۔ بے اختیاری میں اس نے ہتھیلی کو زمین پر جما کر اپنا بوجھ اس پہ ڈالتے ہوئے پیچھے سرکنے کی کوشش کی۔

"کون ہو تم؟" بڑی مشکل سے ہمت مجتمع کر کے پوچھا تھا اس نے' جس کا جواب ایک مسخرانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیا گیا۔ "میں تم ہوں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

اس عورت نے اس کی حیرت کا مزا لیتے ہوئے پوچھا "کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"ایسے بن رہی ہو جیسے خود کو پہچانتی ہی نہیں۔۔۔ کبھی آئینہ نہیں دیکھا کیا؟"

اب اس کا وہ بھلا کیا جواب دیتی' بس گونگوں کی طرح ٹکر ٹکر اسے دیکھے گئی۔ وہ عورت کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی پھر سرسراتی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔

"مجھے غور سے دیکھو' میں تمہارا حسن ہوں۔ تم میری پرستش کرتی رہیں۔ تمہاری خواہش ہوں' جس کی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو روندتی رہیں تم اور اب ایسے پیش آرہی ہو جیسے مجھے جانتی ہی نہیں۔"

نہایت غصے میں وہ عورت اس کے مقابل آکر بولی۔ "مجھے غور سے دیکھ۔۔۔ میں تیرا تکبر ہوں۔۔۔"

نازنین نے گھبرا کر پیچھے ہٹنے کے بجائے اسے زور سے دھکا دیا اور عبادت کے مقام سے باہر نکل آئی۔ اٹھ کر بھاگتے ہوئے بھی وہ اپنے تکبر کو دیکھے جا رہی تھی۔ تب ہی کسی سے ٹکرائی۔ پلٹ کر دیکھا تو یہ قد آدم وینس کا برہنہ مجسمہ تھا۔۔۔ مگر یہ پہلے تو اس کمرے میں نہیں تھا۔ آراستہ محل کے داخلی دروازے کے سامنے سجایا تھا اس نے۔۔۔ وہ اپنے بیڈ کی طرف آئی۔

سفید کروشیے کی جال دار بیڈ شیٹ پر ایک سیاہ فام حبشی عورت کا بے لباس وجود آڑا ترچھا پڑا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ عورت اٹھ بیٹھی اور سیاہ ہونٹوں کے پیچھے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولی "مجھے پہچانا؟"

اس کے اپنے ہاتھوں کا بنایا اسکیچ زندہ اس کے سامنے تھا۔

"میری ہر تخلیق زندہ معلوم ہوتی ہے۔" ہر اسکیچ مکمل کرنے کے بعد وہ فخر سے کہتی مگر آج حقیقت میں انہیں زندہ دیکھ کر دہشت سے اس کا برا حال تھا۔

خوب صورت' قبطی عورتوں کے رقص کرتے اجسام' یونانی دیوتا زیوس کا کسرتی بدن' مائرون ڈسکو بولس ایک رومن ایتھلیٹ ڈسک پھینکتے ہوئے' مصری دیوتا اوسیس اور فرعون آخن آتون' کشن کنہیا ایک ہاتھ میں بانسری تھامے رادھا کو خود سے لپٹائے ہوئے۔۔۔ اور بھی بہت تھے۔

یہ تخلیقات اس کی زندگی کا حاصل تھیں مگر آج اس طرح اس کے سامنے کیوں آکر کھڑی ہو گئیں۔۔۔؟ اس کا دل رک رک کر دھڑکنے لگا۔

ناز کو سانس لینے میں دقت پیش آنے لگی' اس کا دل ڈوب رہا تھا اور بے ترتیب سانسوں کو بحال کرنے کی کوشش میں وہ خود بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ تب ہی اس کے پیروں پر کوئی چیز رینگتی ہوئی گزرنے لگی' اس نے چونک کر اپنے پیر اوپر کرتے ہوئے فرش کی طرف دیکھا اور چیخ پڑی۔

کتھئی رنگ کا چائنیز سرپینٹ (چینی ناگ) تھا۔ اس کی چیخ پر وہ رینگتا ہوا پلٹا اور بستر پر گرتے ہی بھڑکنا شروع کردیا۔ کمرے میں یکدم اندھیرا چھا گیا تھا' بادل گرج رہے تھے اور بستر پر آگ لگ چکی تھی۔ نازنین نے بے تحاشا چیختے ہوئے پیچھے گھسٹنا شروع کردیا۔ مگر آگ بڑی تیزی سے پورے بستر پر پھیل رہی تھی' وہ نیچے اتری' اس بھڑکتے الاؤ کی روشنی میں اس نے اردگرد دیکھا' ان بے جان بت اور تصویروں نے اسے چاروں طرف سے یوں گھیر لیا تھا کہ وہ ان کے بیچ

سے گزر کر دروازے تک نہیں جا سکتی تھی' ان کے درمیان رستہ بنانا ناممکن لگ رہا تھا۔

"مجھے باہر نکلنے دو... جانے دو مجھے۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔

اسی دم پیچھے سے کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ ناز مڑی تو دیکھا' وہ عفریت بے حد خوفناک تھا۔

"چھوڑو مجھے..." ناز اپنا ہاتھ جھٹکتی پیچھے ہٹی سیاہ عفریت عجب انداز سے مسکرایا۔

"کیسے چھوڑ دوں؟ یہاں سے آگے صرف میں ہی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔"

"کون ہو تم؟" اس کے کانوں میں صرف آگ کے بھڑ بھڑانے کی آواز تھی۔

اس عفریت نے خوفناک قہقہہ لگایا۔ "میں... تمہارا عمل ہوں۔"

"نہیں میرے اعمال ایسے کریہہ تو نہیں تھے۔" اب وہ سانس لینے کی کوشش میں ہانپنے لگی تھی۔

"میں ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہا... تمہارا عکس تمہارا غرور... تمہاری انا بن کر۔"

ناز دہشت سے کانپنے لگی۔ "میرا کیا قصور ہے؟ یہ گناہ تم نے کروائے مجھ سے۔ مجرم تم ہو گنہگار صرف تم ہو۔"

"میرا کردار بس اتنا تھا کہ میں نے تمہیں پکارا اور تم میرے پیچھے چل پڑیں... تم نے اللہ کے بجائے اپنے نفس کی اطاعت کی... تو آج مجھ پر الزام نہ رکھو۔"

اس نے مزاحمت چھوڑ کر بے چارگی سے پوچھا "کیا میں مرنے والی ہوں؟"

"ہاں..." جواب حسب توقع تھا... "لیکن پہلے انہیں زندہ کرو۔"

"کسے؟" وہ پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

وہ کریہہ عفریت جو خود کو اس کا عمل کہہ کر متعارف کروا چکا تھا' ایک نہ سمجھ میں آنے والا مطالبہ لیے کھڑا تھا۔

"زندہ کرو ان تصویروں کو' بتوں میں جان ڈالو... جنہیں اپنے ہاتھ سے بناتی تراشتی رہیں... آج زندگی دو انہیں۔"

"لیکن میں یہ کس طرح کروں؟... میں خدا تو نہیں۔" اپنی بے اختیاری کا اعتراف نہایت سہل ہو چکا تھا۔

"تو بنایا کیوں تھا؟" اس نے ڈپٹ کر کہا۔ "اب جان ڈالو۔"

"میری عبادت کہاں ہے؟" شدید بے بسی کے عالم میں وہ پکارنے لگی "میرے روزے' میری نمازیں کہاں ہیں؟"

"وہ سب اکارت گئیں... روز آخرت تمہارے منہ پر دے ماری جائیں گی۔"

"کیوں؟ مجھے معافی کیوں نہیں ملے گی؟" وہ ہاتھ جوڑے بلک رہی تھی۔

"تم ناشکری تھیں... اللہ کی نعمتوں کی' اس کی رحمت کی۔ تم نے غرور کیا' ظلم کیے۔" گناہوں کی لمبی فہرست تھی' وہ گن نہ سکتی تھی' فرد جرم عائد کیا جا رہا تھا۔ اس کے اعمال نے ملامت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"کیا تجھ تک اللہ کا پیغام نہیں پہنچا تھا...؟"

"پہنچا تھا..." وہ روتی ہوئی شکست خوردہ سی زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ عفریت نے ایک تاسف بھری نگاہ اس پر ڈالی اور اس کے ساتھ ہی زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کمرے میں پھیلتی آگ کو دیکھتا رہا پھر بولا۔

"تو جانتی ہے تیرا سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟" ناز نے سر اٹھا کر اس کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

وہ بولا۔

"ہٹ دھرمی... سب کچھ جانتے بوجھتے اپنے گناہوں پر اڑ جانا... اللہ کے غضب کو آواز دیتا ہے... تو نے بھی یہی کیا۔ تیری ماں نے تجھے روکا تھا... بتایا تھا قیامت کے دن سخت عذاب میں مصور ہوں گے۔ تو نے اسے ان پڑھ جاہل کہہ کہہ کر جھٹلا دیا۔ اب انتظار کر... عذاب کا' جھیلنے کا۔" اور تپش تو پہلے ہی اس کی ہڈیوں کے گودے میں گھسی جا رہی تھی' اس نے ایک بار پھر یاد دلانے کی کوشش کی۔

"پر میری نمازیں... میری عبادت... میرے روزے؟"

"ان سب میں بٹ گئیں تیری عبادات' جنہیں گالی دی تھی... ناحق ذلیل کیا تھا... جن کا حق مارا تھا... ظلم کیا تھا۔ بھول جا اپنی نیکیاں۔ مفلس ہے تو' کچھ نہیں ہے تیرے پاس... کچھ بھی نہیں۔"

وہ بلند آواز سے رونے لگی۔ اس کے تمام مساموں سے بے تحاشا پسینہ پھوٹ رہا تھا... پورے کمرے میں آگ پھیل چکی تھی۔ ابھی تک آگ نے اس کے پورے بدن کو نہیں چھوا تھا مگر وہ دیکھ سکتی تھی کہ وہ پگھل رہی ہے۔

اس کی نظروں کے سامنے اس کا خوب صورت مرمریں بدن موم کی طرح پگھل کر بدہیئت زاویے اختیار کرنے لگا۔ اس نے چیخنا چاہا تو آواز اس کے گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔

اسے یقین ہو گیا کہ وہ مر رہی ہے... یا شاید وہ پہلے ہی مر چکی تھی۔

✡ ✡ ✡

معراج دین گیٹ کے آس پاس ٹہل رہا تھا۔

جب وہ نیا نیا یہاں نوکری کے لیے آیا تھا تب ہی اسے بیگم صاحبہ نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ کن لوگوں کو اس گھر میں داخل ہونے سے روکنا ہے۔ چند دنوں بعد اسے معلوم ہو گیا تھا کہ گھر میں ماں بیٹی کے علاوہ کوئی نہیں رہتا اور جن لوگوں کا اس گھر میں آنا منع ہے وہ اصل میں چھوٹی بی بی کے ددھیال والے ہیں۔

اسے حیرت ہوئی تھی مگر وہ ملازم تھا۔

اسے شفیق الرحمان ایک شریف انسان لگے تھے۔

اپنے دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے گرمائش پیدا کرنے کی کوشش میں مگن معراج دین اس وقت بری طرح چونک گیا' جب گیٹ بجنے کے ساتھ اسے شفیق الرحمان کی آواز سنائی دی۔

اس نے گیٹ کھولنے کے بجائے آواز دے کر پوچھا "کون ہے؟"

جواب میں شفیق الرحمان نے اپنا تعارف کروایا اور اس سے پہلے کہ وہ انہیں بیگم صاحبہ کا حکم یاد کرواتا' انہوں نے کہا۔

"رامین نے خود مجھے فون کیا ہے معراج... تم مجھے اپنے ساتھ اندر لے چلو' اس سے پوچھ تو لو... وہ کسی مصیبت میں ہے۔"

معراج انہیں اپنے ہمراہ لے کر ڈرائیووے سے ہوتا ہوا داخلی دروازے تک آیا۔ ان کے بیل پر ہاتھ رکھنے سے قبل ہی دروازہ کھلا اور رامین وحشت بھرے انداز میں باہر نکل کر ان کا بازو پکڑ کر کھینچتی ہوئی انہیں اندر لے جانے لگی۔

"تایا جان! ماما دروازہ نہیں کھول رہیں... میں بہت دیر سے بجا رہی ہوں... وہ جواب ہی نہیں دے رہیں۔" چند ایک بار پکارنے کے بعد مایوس ہو کر شفیق الرحمان نے معراج کو دروازہ توڑنے کے لیے کہہ دیا۔

معراج بھاری ہتھوڑے سے وقفے وقفے سے لاک پر ضرب مار رہا تھا۔ ہر ضرب کے ساتھ رامین کا دل ڈوب جاتا' جانے اسے کیا ہوا وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹی اور اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئی۔

تڑک... کی آواز کے ساتھ پورا کا پورا لاک زمین پر آگرا۔ معراج دین نے شفیق الرحمان کو آگے بڑھنے کا راستہ دیا۔ قدم بڑھانے سے پہلے۔ دروازہ کھولنے سے پہلے ہی انہیں عمر کے سہارے کی ضرورت پڑ گئی۔ وہ اچانک ہی لڑکھڑائے تھے۔

ایک گہری سانس لیتے ہوئے... بالآخر انہوں نے دروازہ کھولا اور کمرے میں قدم رکھ دیا۔ کمرا بالکل خالی تھا۔ عبادت کے مقام پر انہیں نازنین نظر آئی۔ نماز پڑھتے ہوئے وہ سجدے میں ہی اپنی زندگی سے روٹھ گئی تھی شاید... اور اس وقت اوندھے منہ زمین پر گری پڑی تھی۔

ڈاکٹر صابر ان کے پڑوسی تھے۔ انہوں نے نازنین کا چیک اپ کرنے کے بعد اس کی موت کی تصدیق کر دی

تھی۔ اسے مرے ہوئے دس گھنٹے گزر چکے تھے۔ عمر نے بدقت نازنین کو بستر پر لٹا دیا تھا' اور چادر اوڑھادی تھی۔

ایک اور موت۔۔۔ ابھی عبید کے انتقال کو بھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ شفیق الرحمان نڈھال سے کرسی پر ڈھے گئے۔ ابھی تک رامین اپنے کمرے سے باہر نہیں آئی تھی۔ انہیں قدسیہ اور آمنہ کا انتظار تھا' وہ آجائیں گی تو۔۔۔

ان کی سوچ یہیں تک ٹھہر گئی۔۔۔ قدسیہ اس گھر میں آئے گی؟ آمنہ بھی۔۔۔ امی بیگم کے انتقال کے بعد اب یہ موقع آیا تھا کہ عبید کے گھر میں ان کی بہنیں اور بھائی داخل ہوسکتے تھے۔

یہ گھر۔۔۔ یہ محل۔۔۔ شاید عبید کا تھا ہی نہیں۔۔۔ انہوں نے بستر پر ابدی نیند سوتی ناز کو دیکھ کر سوچا۔ "یہ آراستہ محل تو اس ملکہ کا تھا۔۔۔" وہ کھڑے ہوگئے' شفیق الرحمان نے ناز کے چہرے سے نظر نہیں ہٹائی۔ انہیں رہ رہ کر وہ وقت یاد آرہا تھا جب نازنین نے کسی کو اپنے محل میں آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔۔۔ اور آج۔۔۔ اس وقت اس کی خواب گاہ میں کتنے ہی لوگ یونہی بلا روک ٹوک داخل ہوتے جارہے تھے۔ اپنے مردہ جسم کے اردگرد کھڑے لوگوں پر اس کا کچھ اختیار ہی نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت دیر سے لان میں چہل قدمی کررہی تھی اور اب اسے تھکن محسوس ہونے لگی تھی۔ نظروں کے عین سامنے آراستہ محل کسی قبر پر بنے کتبے کی مانند محسوس ہورہا تھا' اس کتبے کے سائے تلے ان گنت قبریں تھیں۔

وہ خالی الذہنی سے آرائشی سرخ اینٹوں سے تعمیر شدہ اس عمارت کو دیکھنے لگی' جسے اتنے سال وہ گھر کہتی اور سمجھتی رہی تھی۔ یہ عالیشان "آراستہ محل"! اپنے سابقہ مکینوں کی قابل ستائش جمالیاتی حس کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور اندر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

لان عبور کرتے ہوئے ڈرائیو وے تھا۔ اس سے منسلک سنگ مرمر کی آٹھ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد قدیم انداز کا منقش چوبی دروازہ گھر میں داخل ہونے کا ذریعہ تھا۔ وہ قریباً" دوڑتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی اور گھر میں داخل ہو کر تمام بتیاں جلادیں۔ اطالین کرسٹل کے بھاری فانوس جگر جگر کرنے لگے۔ ان کی سنہری روشنی سفید چکنے فرش پر کہیں کہیں سات رنگوں میں منقسم دکھائی دے رہی تھی۔ گویا دھنک رقص کررہی ہو۔

داخلی دروازے کے دائیں طرف وینس کا قد آدم عریاں مجسمہ تھا۔ یونانی دیومالائی داستانوں میں حسن کی دیوی کا خطاب پانے والی عورت دلبرانہ انداز سے یوں کمر لچکا کر کھڑی تھی کہ نسوانیت کا ہر پہلو اجاگر ہو رہا تھا۔ اس کی عقبی دیوار پر احمد خاں کی گولڈ کیلی گرافی آویزاں تھی۔ اس کا سر شرمندگی سے جھک گیا' وہ آگے بڑھ گئی۔ فائرپلیس کے عین اوپر دیوار پر ایک بیضوی آئینہ نصب تھا۔ اس کی نظر اپنے عکس پر نہیں پڑی۔ وہ آئینے کے فریم کو دیکھ رہی تھی۔ چائنیز سرپینٹ لکڑی کے فریم میں گدا ہوا اس آئینے کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ اس کے گرد دیوار پر حنوط شدہ بارہ سنگوں کے سر ایستادہ تھے۔ وہ مڑ کر مصری کارنر کی طرف چلی آئی۔ ہال کے اس کونے میں ہر دور کے فراعنہ تصویریا ممی کی شکل میں رکھے گئے تھے۔ مصری طرز کی لکڑی اور بید کی کرسیوں پر قلوپطرہ کی صورت دکھاتے کشنز رکھے تھے۔

ہال کے دوسرے کونے میں رومن اور یونانی ادوار کی تمام نشانیاں من و عن سجائی گئی تھیں۔ اس کونے کے آخیر سے ڈائننگ ہال شروع ہو رہا تھا' ایک اور عبرت کدہ۔

طویل بیضوی میز کے گرد بارہ کرسیاں' اس کے عقب میں پاتیو (Patio) اور گلاس سلائیڈنگ ڈور۔۔۔ اس نے لائٹ آن کی اور سلائیڈنگ ڈور کھول دیا۔

پاتیو تین اطراف سے لوہے کی گرل میں گھرا تھا۔ جس پر دوسری طرف سے لان کی بیلوں نے قبضہ جما لیا تھا۔ اس نے ایک نظر اس خوابناک ماحول کو دیکھا اور پلٹ کر ڈائننگ ہال کی دیوار پر سجی اس منی ایچر کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی لیدر شیٹ پر سورۃ الکوثر کی آیات خط نستعلیق میں کندہ کی گئی تھیں۔ کانچ کی شیلف میں روسی گڑیاں۔ قیمتی برتن اور چینی مچھیرا جو کندھوں پر لکڑی سے بندھی بالٹیاں اٹھائے ' آنکھیں میچ کر مسکرا رہا تھا ' گوتم بدھ نروان حاصل کرنے میں مستغرق۔۔۔ وہ آج ان سب چیزوں کو آخری بار دیکھ رہی تھی۔ ڈائننگ ہال سے باہر آکر رامین اپنی ماں کے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔

نازنین کے کمرے کی لائٹ روشن تھی۔ یہ ہدایت آمنہ بیگم کر کے گئی تھیں کہ ناز کے کمرے میں روشنی رہنی چاہیے۔ رامین نے ان سے کوئی بحث نہیں کی تھی۔ عود کی خوشبو کمرے کے ایک کونے میں جلتی اگربتی کے دھوئیں کے ساتھ ہوا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ روشنی اور خوشبو کے باوجود کمرے میں عجیب گھٹن کا احساس تھا۔ حالانکہ یہ آراستہ محل کا سب سے کشادہ بیڈ روم تھا۔ کھڑکی کے آخری سرے پر کڑے میں پوٹ ہولڈر لٹکا ہوا تھا جس کی تغاری میں ایک ننھا سا بونسائی رکھا ہوا تھا۔ باقی دیواروں پر کسی قسم کی کوئی پینٹنگ نہیں تھی ' صرف پورٹریٹس تھیں۔۔۔ اس کی ماں نازنین کی۔

ایک نہایت حسین اور پر اعتماد عورت ' جس کے چہرے کے تاثرات ہر تصویر میں یکساں تھے۔ بھرے بھرے ہونٹوں کے باریک کناروں پہ مچلتی مسکراہٹ ' ستواں ناک ' نرگسی آنکھوں سے چھلکتا غرور ' کمان بھنووں پر کشادہ پیشانی ' ریشمی بالوں کی ناگن لٹیں اور تنی ہوئی گردن۔۔۔ اپنے تمام ہتھیاروں سے لیس ہو کر کیمرے کی آنکھ سے آنکھ ملائی گویا چیلنج کر رہی ہو کہ "ہم سا ہو تو سامنے آئے" اور حقیقتاً" کوئی بھی تو۔۔۔ اس کی ماں جیسا نہیں تھا۔ کمرے کی ساری دیواریں ان تصویروں کے پیچھے چھپ گئی تھیں۔ بہت سی تصویریں تو ان کامیابیوں کی یادگار تھیں۔ جو اس کی ماں نے حاصل کی تھیں۔ بہترین ڈرامہ نویس کا ایوارڈ وصول کرتے ہوئے ' بہترین تجزیہ نگار کا ایوارڈ وصولتے اور مشاعروں کی ان گنت تصاویر اپنی تصویروں میں ماضی کے دریچے کھولتی گئی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصاویر۔ بھی اس دیوار کی زینت تھیں۔

ایک کامیاب عورت کی پوری زندگی ' اس کا غرور ' فخر و انبساط ' اس کے خواب اور ان کی تعبیر اور حاصل ہونے والی ساری کامیابیاں ' سب کچھ اس دیوار پر آویزاں تھا۔ وہ ہر تصویر خوب غور سے دیکھتی پورے کمرے میں گھومتی رہی۔ "کتنی خوب صورت ' کتنی خوش لباس اور ٹیلنٹڈ خاتون تھیں ماما۔۔۔ ان کے ہاتھ سے بنائی گئی ہر چیز کس قدر مکمل اور بے عیب ہے۔ ان کی لکھی ہوئی درجنوں کتابیں شاعری کے مجموعے اور دیوان ' ان کی بنائی ہوئی سینکڑوں پینٹنگز ' اسکیچز ' ملبوسات اور جیولری۔۔۔ ہر شعبے میں مہارت رکھتی تھیں۔ ہر اعزاز ملا انہیں۔۔۔ دنیا کی بہترین عورت تھیں مگر۔۔۔ ماں نہیں تھیں۔ تو پھر کون تھیں؟ مجھ سے کیا رشتہ تھا آخر۔۔۔" سوچ کے دائرے سکڑتے جا رہے تھے۔

"کیا نام دوں میں اس تعلق کو" اس نے شدت کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔

آج اک حرف ڈھونڈتا پھرتا ہے خیال
موہ بھرا حرف کوئی ' زہر بھرا حرف کوئی
دل نشیں حرف کوئی ' قہر بھرا حرف کوئی
حرف الفت کوئی دلدار نظر ہو جیسے
جس سے ملتی ہو نظر بوسہ لب کی صورت
اتنا روشن کہ سر موجہ زر ہو جیسے
تا ابد شہر ستم جس سے تہہ ہو جائیں
اتنا تاریک کہ شمشان کی شب ہو جیسے
لب پہ لاؤں تو میرے ہونٹ سیاہ ہو جائیں

اس نے نہایت بے دردی سے لب کچل ڈالے۔ اسے نفرت تھی اس عورت سے ' جو اس کی ماں تھی۔ ہر خوبی میں یکتا ایک بہترین عورت ' جسے کبھی

اچھی ماں ہونے کا اعزاز نہیں ملا۔ اسے اس اعزاز کو حاصل کرنے میں کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ ورنہ جو اس نے چاہا۔۔۔ ہمیشہ حاصل کیا تھا۔

وہ کمرے سے باہر آ گئی۔

تیز سرد ہوا کے تھپیڑے نے جہاں اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے کیے ' وہیں اس کے وجود میں ایک جادوئی طاقت سی پھونک دی۔ وہ کرنٹ کھا کر مڑی اور وینس کے مجسمے کو دونوں ہاتھوں سے زوردار دھکا دے کر نیچے گرا دیا۔ مجسمہ گرتے ہی سینکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ حسن کی دیوی کا سر اس کے قدموں میں پڑا تھا ' جسے ایک زوردار ٹھوکر مار کر اس نے سیڑھیوں سے نیچے لڑھکا دیا۔ قرآنی آیات اور کتابیں چھوڑ کر اس نے تمام آرائشی اشیا اور مجسمے دروازے سے باہر پھینکنا شروع کیں۔ یکے بعد دیگرے وہ سارے مجسمے توڑتی چلی گئی۔ سب کچھ سیڑھیوں کے سامنے ڈھیر ہو رہا تھا۔ وہ اتنی قوت سے انہیں زمین پر مار رہی تھی کہ فرش سے ٹکراتے ہی سب چکنا چور ہو جاتے۔

کانچ اور پتھر کے ٹوٹنے ٹکرانے کی آوازیں اس پر ہیجان طاری کر رہی تھیں۔ رگوں میں لہو کے بجائے لاوا دوڑنے لگا تھا۔

ذرا سی دیر میں گھر خالی ہو گیا۔ اس کی ماں کے آراستہ محل کی شان و شوکت اس کی ٹھوکروں میں آ گری تھی۔ ریشمی قالین جن کی بنت میں نوشیرواں عادل کی شکار کہانی نقش تھی رادھا کشن ' گوتم بدھ ' مصری خزانے ' چائنیز سرپینٹ ' حنوط شدہ سر ' نیوڈ پینٹنگز اور اسکیچز اور وہ تمام تصاویر جو نازنین کی خوابگاہ کی گھٹن تھیں ' اس وقت سیڑھیوں سے نیچے ڈھیر کی صورت موجود تھیں۔ رامین نے اسٹور روم سے مٹی کا تیل لا کر ان چیزوں پر چھڑکنا شروع کیا۔ کچھ چھینٹے اس کے اپنے کپڑوں پر گرے مگر اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ پورا کین انڈیلنے کے بعد اس نے دوسری سیڑھی پر کھڑے ہو کر تیلی سلگائی اور ڈھیر پر پھینک دی۔ لمحوں میں آگ بھڑک اٹھی۔

جیسے جیسے لاکھوں کا سامان راکھ میں تبدیل ہو رہا تھا ویسے ہی اس کی رگ و پے میں سرشاری بڑھتی جا رہی تھی۔ جلتا الاؤ چھوڑ کر وہ ایک بار پھر گھر میں داخل ہوئی اور پاتیو میں جا کر نوکیلے پتھر کے پے در پے وار کر کے اس سنگی ببر شیر کا منہ توڑ کر رکھ دیا جو حوض پر سجا ہوا تھا۔ شیر کا چہرہ مسخ کرنے کے بعد اس نے کچھ چھوٹے فریمز اور مورتیاں جو نظروں میں آنے سے رہ گئی تھیں انہیں بھی اٹھا کر الاؤ میں ڈال دیا۔

رامین کچھ دیر بتدریج بلند ہوتے شعلوں کو دیکھتی رہی۔ پھر سیڑھیوں سے نیچے اتر کر اس نے الاؤ کے گرد دو تین چکر لگائے کہ کوئی چیز آگ کی دسترس میں آنے سے رہ نہ گئی ہو۔

ایسا کچھ نہیں تھا۔

رامین نے ایک گہری سانس لی۔ الحمد اللہ کہہ کر اپنے ہاتھ جھاڑے اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔ بستر پر لیٹتے ہی اسے فوراً" نیند آ گئی۔

ایسی سکون کی نیند سونے کا یہ پہلا موقع تھا۔

☆ ☆ ☆
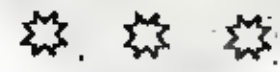
اس کی شلوار کا پائنچہ ادھڑ گیا تھا۔ وہ گرتے گرتے بچی تھی ' جب کچن میں جاتے ہوئے اس کے داہنے پاؤں کا انگوٹھا بائیں پائنچے میں اٹکا۔ اسے سینے کی غرض سے وہ سوئی دھاگا لے بیٹھی ' پر دھاگا تھا کہ ڈل کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بے دھیانی میں بار بار اپنی دائیں آنکھ بند کر کے دھاگا ناکے سے گزارنے لگتی۔ جب کچھ نظر نہ آتا دھاگے کو منہ سے لگا کر کنارہ باریک کر کے پھر سے کوشش کرنے لگتی۔ مگر بے کار۔ اس کی بائیں آنکھ بینائی سے محروم ہو گئی ہے بالآخر اسے تسلیم کرنا پڑا۔

کیسے ہوئی تھی؟ وہ یاد کرنے لگی۔ بہت عام دنوں جیسا وہ بھی ایک عام سا ہی دن تھا۔ اس کی ماما کے انتقال سے شاید پانچ چھ دن پہلے کا کوئی دن ہو گا۔ وہ ہنس پڑی۔ اس کی زندگی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ماں کے مرنے سے پہلے اور ماں کے مرنے کے بعد۔

تلخی سے مسکراتے ہوئے اس نے بے دردی سے

آنکھ رگڑتے ہوئے اپنی ماں کو خراج تحسین پیش کیا۔
"اللہ آپ کا بھلا کرے ماما...... کیا سے کیا بنا دیا؟"
پھر بےزاری سے سر جھٹک کر اس نے دھیان بٹایا اور کپڑے بدلنے چلی گئی۔ آنکھ تو پھوٹ گئی تھی۔ اب ٹانگ بھی ٹوٹ جاتی اپنا وجود اسے اتنا عزیز تو نہیں تھا مگر لنگڑی ہو کر اکیلے گھر میں مدد مدد پکارنے سے تو بہتر تھا ابھی تھوڑا سا خیال کرلے۔
کپڑے بدلتے ہوئے جانے کیوں اس نے سوچا کہ جاوید انکل کے پاس چلی جائے۔ اس کے پاپا کے گہرے دوست تھے اور آئی اسپیشلسٹ تھے۔ اس نے اگلی صبح ان کے کلینک جانے کا مصمم ارادہ کرلیا۔

٭ ٭ ٭

"عافیہ! میری بلڈ پریشر کی گولی دیجیے۔" شفیق الرحمان نے عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد جاء نماز تہ کرتے ہوئے انہیں آواز دی۔
"مجھے تو آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ چہرہ کیسا اتر گیا ہے' برسوں کے بیمار نظر آرہے ہیں......" انہوں نے پانی کے گلاس کے ساتھ گولی تھماتے ہوئے کہا۔
"برسوں کی بیماری نہیں...... پچھتاوا ہے کئی برسوں کا۔" انہوں نے گولی کھا کر گلاس ایک طرف رکھا۔
"اس کی زندگی کے کتنے قیمتی سال یونہی ضائع ہو گئے۔ عبید کے جانے کے بعد میں نے اس کی خبر ہی نہ لی......" ان کی آنکھوں میں پچھتاوا آنسو بن کر جمع ہونے لگا۔ عافیہ کو فکر ہونے لگی کہیں شفیق الرحمان کی طبیعت نہ بگڑ جائے۔
"اب ایسے بھی بے خبر نہیں تھے آپ' ہر مہینے ڈیڑھ لاکھ بھجوایا کرتے تھے۔ وہ اس کی ماں تھی۔ آپ رامین کو زبردستی تو اس سے چھین نہیں سکتے تھے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ آپ رامین کے لیے بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ شاہ زیب کو ڈھونڈنے کی کوشش کیجیے۔ وہ مل گیا تو رامین کو بہت سہارا ہو جائے گا۔" عافیہ انہیں روشن پہلو کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ عافیہ نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ یہ قدسیہ تھیں۔ انہیں سلام کرتی بھائی کے پاس بستر کے نزدیک رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ عافیہ قدسیہ کو بٹھا کر چائے کا انتظام کرنے چلی گئیں۔
"اچھا ہوا تم آگئیں۔ میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہ رہا تھا۔" شفیق الرحمان نے کہا تو قدسیہ پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہوگئیں۔
"جی کہیے بھائی جان! کیا کہنا چاہ رہے ہیں آپ؟"
"میں رامین کی شادی کرنا چاہتا ہوں......" شفیق الرحمان بنا کسی تمہید کے دل کی بات زبان پر لے آئے۔
قدسیہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگیں۔
"دیکھو! میرا کوئی بیٹا اس کے جوڑ کا ہوتا تو سب سے پہلے وہ میرے گھر آتی مگر اب اس سلسلے میں تمہیں اور آمنہ کو ہی پہل کرنی چاہیے۔"
"مگر آپا بیگم کے دونوں بیٹوں کی بات طے ہے...... اور۔" شفیق الرحمان نے قدسیہ کی بات اچک لی۔
"اور تم نے اپنے سعد کے لیے کیا سوچا ہے؟"
قدسیہ اپنے بیٹے کا نام سنتے ہی تلخی سے مسکرائیں۔
"ہونہہ' میرے سوچنے کی نوبت ہی کہاں آئی بھائی جان! ہاں مجھے اطلاع دینے کا فرض اس نے ادا کردیا ہے۔" قدسیہ کو بیٹے کی اس حرکت کا بہت رنج تھا۔ جس نافرمانی کا طعنہ وہ اپنے بھائی عبید کو دیا کرتی تھیں آج ان کے بیٹے نے بھی وہی کر دکھایا تھا اور وہ کچھ نہ کرسکی تھیں۔

٭ ٭ ٭

"بیٹا! آپ کی آنکھ پر یہ چوٹ کیسے لگی تھی؟" ڈاکٹر جاوید کا سوال سیدھا سادا مگر اس کا جواب وہ اتنے سیدھے سادے طریقے سے دے نہیں سکتی تھی۔
"انکل بہت زور سے چوٹ لگ گئی آنکھ پر...... بھاری سی چیز تھی کوئی۔" اب وہ انہیں کیا بتاتی کہ باوجود پابندیوں کے اپنے تایا سے رابطہ رکھنے پر اس کی ماں نے اس بے دردی سے اسے مارا کہ اس کی آنکھ ہی پھوڑ دی۔ سر پر کوئی باریک مگر وزنی چیز ماری تھی۔ اس

کی کنپٹی کی رگیں ابھر آئی تھیں۔ بائیں آنکھ کی پتلی کے پاس سرخ رنگ کا دھبہ پڑ گیا تھا۔ مار کھانے کے بعد وہ بمشکل اپنے بستر پر لیٹ پائی تھی۔ اس دن کے بعد بائیں آنکھ ہر منظر پہچاننے سے قاصر تھی۔
"ایسی کون سی بھاری چیز ٹکرا گئی تھی رامین؟" ڈاکٹر جاوید نے اس کا اچھی طرح معائنہ کرکے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا' ان کے سوال پر وہ خاموشی سے لب کچلتی رہی۔
"دیکھو بیٹا! تم اگر مجھے صحیح وجہ بتادو تو میں تمہارا بہتر طریقے سے علاج کرسکوں گا۔"
رامین میز کے دوسری طرف سر جھکائے بیٹھ گئی۔
"اتنا تو میں دیکھ سکتا ہوں کہ یہ چوٹ کسی ٹکراؤ کے باعث نہیں آئی۔ یہ ایک کاری ضرب ہے۔ جس کا اثر بہت گہرائی تک پہنچا ہے اور تمہاری آنکھ کے گرد نازک نسوں کا جال پھٹ کر خون کا اخراج دے رہا ہے۔ تمہیں اسی دن یہاں آنا چاہیے تھا جب یہ چوٹ لگی تھی۔"
"تو اب آپریٹ کرنا پڑے گا؟"
"نہیں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ لیزر کی مدد سے ہم بلیڈنگ وینز کی پیوند کاری کردیں گے جس کے بعد ان شاء اللہ چند ماہ میں تمہاری آنکھ دیکھنے کے قابل ہو جائے گی۔ مگر یہ بینائی مرحلہ وار بحال ہوگی۔ تم گھبرانا مت۔ وقت لگے گا مگر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"
ڈاکٹر جاوید نے اسے درد میں کمی کے لیے کچھ دوائیاں لکھ کر دیں اور کہا۔ "صبح دس بجے تم کلینک آجاؤ' ویسے تو لیزر ٹریٹمنٹ میں درد کا احساس نہیں ہوگا لیکن پھر بھی...... بہتر ہوگا تم کسی کو ساتھ لے آؤ...... اور دیکھو ٹینس مت ہونا۔ نہ ہی غصہ کرنا ہے اور رونا تو بالکل بھی نہیں۔ تمہاری آنکھ پر زور پڑے گا۔ اوکے۔"
"جی میں احتیاط کروں گی......"
وہ سر ہلاتی باہر نکل گئی۔
فجر کی نماز پڑھ لینے کے بعد رامین نے دروازہ کھولا۔ اس کی ماں کا ورثہ خاک کے ڈھیر میں تبدیل ہوچکا تھا۔ وہ ٹہلتی ہوئی اس جلے ہوئے سامان کے نزدیک پہنچی تو یونہی اچٹتی سی نگاہ ڈال کر آگے بڑھنے والی تھی کہ ایک ادھ جلی تصویر ہوا سے اڑتی ہوئی ڈھیر سے باہر آگری۔
"ماما کی تصویر" اس نے اپنے قدم وہیں روک لیے...... اور تصویر اٹھالی۔ چہرے کے اردگرد کاغذ جل چکا تھا۔
اسے یکدم پتا نہیں کیا ہوا' ماں کی شبیہہ اپنے ہونٹوں سے لگا کر وہ بےاختیار رونے لگی۔
کیا صرف یہ سامان جلا دینے سے اس کا سارا غصہ ٹھنڈا ہوگیا تھا؟ یہ کافی تھا؟ نہیں...... یہ کافی نہیں تھا۔ اس کی محرومیوں کا ازالہ تو ہوا ہی نہیں تھا۔ پھر وہ کیسے اپنی ماں کو معاف کرسکتی ہے لیکن وہ اس لیے تو نہیں رو رہی تھی کہ اس نے اپنی ماں کو معاف کردیا تھا۔ وہ تو اس لیے رو رہی تھی کہ اب کبھی بھی ان محرومیوں کا ازالہ نہیں ہوسکتا تھا۔ مرنے والوں کے ساتھ ہر امید بھی دم توڑ جاتی ہے۔

✡ ✡ ✡

کال بیل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "کون ہے؟" اس نے دروازے کے نزدیک ہو کر اونچی آواز میں پوچھا۔ جواب میں عمر بھی زور سے بولا۔

"میں ہوں عمر۔۔۔ دروازہ کھولیں آپی۔" رامین نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ "یہ امی نے کھانا بھجوایا ہے 'اف بڑے مزے کے رول ہیں' کھا کے بتائیے گا کیسے لگے۔ اور ابو کو فون ضرور کریجیے گا۔"

"میں تایا جان کو فون کرلوں گی۔۔۔ بلکہ ایسا کروں گی کل شام چکر بھی لگالوں گی۔"

"جی ٹھیک ہے۔ آپ دروازہ بند کرلیں۔ امی نے اماں جنت کی بلوایا ہے 'وہ آپ کے ساتھ یہیں رہیں گی۔ ویسے بہت اچھا ہوتا آپ ہمارے گھر چل کر رہتیں۔۔۔ یہاں اکیلے کیا کریں گی؟"

رامین اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی آرہی تھی۔ عمر کا بے تکان بولتے چلے جانا ہمیشہ اس کے لبوں پر مسکراہٹ لے آتا تھا۔

"ایک بات کہوں آپی؟"

رامین جانتی تھی وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

"ویسے اب یہ محل زیادہ اچھا لگ رہا ہے۔۔۔ زیادہ کشادہ اور پرسکون۔۔۔ آپ نے اچھا کیا۔

میں دکان والوں کو سوزوکی دے کر بھیج دوں گا۔ وہ یہ ڈھیر اٹھالیں گے اور ٹھکانے لگادیں گے۔۔۔ اوکے اب میں چلتا ہوں۔"

"تھینکس اگین۔۔۔" رامین نے مسکرا کر اسے خدا حافظ کہا۔ عمر ہاتھ ہلاتا گھر سے باہر نکل گیا۔

عمر کے جانے کے بعد اس نے عافیہ کا بھیجا ہوا سامان کھولا۔ اس میں کھانے پینے کی اتنی چیزیں تھیں کہ اسے ناشتہ یا دوپہر رات کا کھانا بنانے کی قطعاً ضرورت نہ رہی۔ ناشتہ کرنے کے بعد اس نے فون پر تایا جان سے بات کرکے انہیں اطمینان دلایا کہ وہ بالکل خیریت سے ہے اور دو ایک دن میں ان کے پاس ضرور چکر لگائے گی۔

اب وہ گھر کی مکمل صفائی کرنا چاہ رہی تھی۔ اس نے دوپٹا کمر سے کس کر باندھا اور جھاڑو ہاتھ میں لے کر شروع ہو گئی۔ پہلے خوب دل لگا کر گھر صاف کیا پھر نہانے چلی گئی۔

نہا کر اور زیادہ ٹھنڈ کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس نے پہلے زیتون کا تیل اپنے کھردرے پاؤں پر ملا پھر ہاتھوں پر بھی اچھی طرح رگڑ لیا اور پاؤں میں موزے پہن لیے۔ ابھی بھی دانت کپکپا رہے تھے۔ گیلا تولیہ ہٹا کر اس نے بال سمیٹ کر گرم شال میں اپنا پورا وجود چھپالیا اور قرآن مجید اٹھا کر پاتیو میں چلی آئی۔ سورۃ البقرہ کا صفحہ کھول کر اس نے بلند آواز سے تلاوت شروع کردی۔ کلام اللہ کی سنہری آیات خالی در و دیوار سے ٹکرا کر گونجنے لگی۔ آدھی سورت پڑھ لینے کے بعد وہ کھڑی ہو گئی اور چلتے چلتے تلاوت جاری رکھی۔ کئی بار اس کی آواز بھر آئی' پر وہ رکے بغیر اس قبرستان کی فصیلوں میں یہ کلام سمودینا چاہتی تھی' سو پڑھتی چلی گئی۔ عرصہ دراز تک ان دیواروں میں ناپاک بتوں سے اٹھنے والا تعفن جذب ہوتا رہا تھا۔ اسے یہ دیواریں بھی آج گریہ کرتی نظر آرہی تھیں۔ جو اتنا عرصہ گھر کی مالکن کو اپنے سینے پر آرائش کے بہانے مردہ جسموں کو سجانے کی اجازت دیتی آئی تھیں۔ پورے ہال میں گھومنے کے بعد وہ اپنی ماما کے کمرے میں آگئی۔ قرآن پڑھتے ہوئے اس نے پردے کھول دیے۔

جانے یہ باہر سے آتی سبز روشنی کے ہالے تھے یا پھر اس کا وہم کہ آیتیں پڑھنے کے بعد کمرے میں روشنی بڑھ گئی تھی۔ وحشت کی جگہ طمانیت کا بسیرا تھا۔ ناز کے مرنے کے بعد اس کا یہی عمل اپنی ماں کو فائدہ پہنچا سکتا تھا۔ سو وہ کررہی تھی۔

آج وہ چشم زدن میں اس گھر کو بنجر زمین سے ہرے بھرے باغ میں تبدیل ہوتا دیکھ رہی تھی۔ ایسی زمین جس پر آسمان سے بارش برس رہی ہو اور اس کی اپنی

کوکھ سے بھی چشمے پھوٹ رہے تھے۔ سبزہ سبز تر ہوتا جارہا تھا۔ تراوٹ میں ڈوبتا اس محل کا بدن اپنی برسوں کی پیاس بجھانے لگا۔ گالیوں' کوسنوں اور بددعاؤں کی جگہ پاک کلام در و دیوار کی سماعتوں میں حلاوت گھول رہا تھا۔ آج وہ خود اور اس کا گھر پھر سے زندہ ہو رہے تھے۔ اس کا رواں رواں اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔

✡ ✡ ✡

عمر اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کلینک سے باہر نکل آیا۔ رامین نے سن گلاسز پہن رکھے تھے۔ ٹریٹمنٹ کے بعد آدھ گھنٹہ اس نے کلینک میں ہی گزارا تھا۔ درد نہیں ہوا تھا' لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آنکھ کے ڈیلے کے اندر ہلکی سی پن رہ رہ کر چبھ رہی ہو۔ اس نے بائیں آنکھ کو مسلسل بند رکھا ہوا تھا۔ آج وہ عمر کو اس لیے ساتھ لائی تھی کیونکہ وہ کسی اور کو اس بارے میں کچھ بھی بتانا نہیں چاہتی تھی۔ جس طرح عمر نے سامان جلانے کے متعلق رازداری اپنائی تھی اور اپنے آپ کو قابل اعتبار ثابت کیا تھا۔ اس معاملے میں بھی وہ اسی کو ہمراز بنا سکتی تھی۔ چوٹ کی وجہ اس نے عمر کو بھی نہیں بتائی تھی لیکن وہ اتنا نا سمجھ نہیں تھا کہ خود سے اندازہ نہ لگا پاتا۔ اسے رامین سے ہمدردی تھی اور اس کا بے حد احساس بھی کرتا تھا۔

"عمر! میں ایک آنکھ سے دیکھ سکتی ہوں بھائی! پوری اندھی تھوڑی ہوں۔۔۔ چھوڑ دو میرا ہاتھ۔۔۔ میں چل لوں گی۔"

پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے اس نے عمر سے کہا جو بچوں کی طرح اس کا ہاتھ پکڑ کر چل رہا تھا اور راستے میں پڑے پتھر اور اسپیڈ بریکر کی نشاندہی بھی کرتا جارہا تھا۔ رامین کے کہنے کے باوجود عمر نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔

وہ بدستور اسے احتیاط سے چلاتا ہوا گاڑی تک لے کر آیا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھنے میں مدد دی۔ پھر دوسری طرف سے خود بھی اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ عمر نے ڈرائیور سے مارکیٹ چلنے کو کہا پھر رامین کے نزدیک ہو کر سرگوشی کی۔ "میں ابو سے کہہ کر آیا تھا کہ آپ کے ساتھ کچھ بکس لینے جارہا ہوں۔۔۔ صرف دو منٹ لگیں گے۔ میں مین مارکیٹ سے چند کتابیں لے لیتا ہوں پھر گھر چلیں گے۔" رامین نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

پانچ منٹ بعد وہ مین مارکیٹ پہنچ گئے تھے۔ عمر فوراً ہی اتر کر بک شاپ کے اندر چلا گیا۔ رامین نے اپنے دروازے کا شیشہ اتار لیا اور آنکھوں سے گلاسز ہٹا کر باہر دیکھنے لگی۔

عمر جس بک شاپ کے اندر تھا اسی سے ایک جوڑا اپنے تین چار سال کے بچے کو لیے باہر نکلا اور رامین کی گاڑی کے ساتھ کھڑی سرخ ہونڈا میں بیٹھنے لگا۔ رامین نے دیکھا' وہ لڑکی بہت خوب صورت تھی اور اس کا بیٹا بہت ہی پیارا تھا۔ اس کے شوہر پر رامین نے توجہ نہیں دی تھی مگر جب گاڑی میں بیٹھ کر اس شخص نے گردن موڑ کر اپنی کھڑکی سے باہر دیکھا تو اس کا چہرہ رامین کے بالکل سامنے آگیا۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں وہ اسے پہچان گئی تھی۔ وہ زین تھا۔

عمر نے سرعت سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا "چلیں ولایت چاچا۔۔۔" پھر اس نے رامین کی طرف دیکھا جو اپنے سن گلاسز پہن رہی تھی۔

"دیر تو نہیں ہوئی نا۔۔۔ آپ کو درد تو نہیں ہو رہا۔۔۔ سر پیچھے سیٹ سے ٹکالیں۔ بس ابھی تھوڑی دیر میں گھر پہنچ جائیں گے۔۔۔ جنت بی بی نے بہت مزے کا کھانا پکایا ہوگا۔ دونوں مل کر کھائیں گے۔"

عمر اور بھی جانے کیا کیا کہہ رہا تھا لیکن وہ خاموش تھی۔۔۔ بالکل خاموش۔۔۔!

(باقی آئندہ)

امایہ خان

ناولٹ

کیلی فورنیا ہائی وے پر "مہرزخان" نامی ایک نوجوان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ آفیسرز کے مطابق اس نوجوان کے زندہ بچنے کے امکانات کم ہیں۔

مہرز خان اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ روڈ ایکسیڈنٹ میں اس کے والدین کی وفات ہو چکی ہے۔ اب وہ کیلی فورنیا میں اپنے پرانے اور بااعتماد ملازم جیری کے ساتھ رہتا ہے۔ رضا اس کا دوست ہے۔ مہرز کا اس کے گھر بھی آنا جانا ہے۔ رضا کی چھوٹی بہن عنبر کو وہ بھی اپنی بہن سمجھتا ہے۔

رامین ایک مغموم و معصوم لڑکی ہے۔ ماں کے ظلم کی وجہ سے ہروقت وحشت زدہ رہتی ہے۔ ماں کے انتقال پر اس کی پھوپھیاں آمنہ بیگم اور قدسیہ بیگم اسے سنبھالتی ہیں۔ تایا شفیق الرحمان اسے اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کرتے ہیں مگر وہ منع کردیتی ہے۔

رامین اور مہرز کے درمیان اسکول کے پہلے دن سے ہی خوب اچھی دوستی ہو جاتی ہے۔ پھر حسن بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے مگر ایک دن رامین کے والد اسے مہرز اور حسن کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ کر بہت سختی کرتے ہیں۔ اس دن کے بعد سے رامین ان دونوں سے کھنچ جاتی ہے۔ میٹرک تک آتے آتے رامین کی سرد مہری کے باوجود مہرز اس کو پسند کرنے لگتا ہے۔

مطیع الرحمان اور صبیحہ بیگم کے دو بیٹے شفیق الرحمان اور عبید الرحمان اور بیٹیاں آمنہ بیگم اور قدسیہ بیگم ہیں۔ لاڈلی

بیگم، مطیع الرحمان کی چھوٹی بہن ہیں اور صالحہ بیگم، صبیحہ بیگم کی چھوٹی بہن ہیں، جو بیوہ اور تین بچوں کی ماں ہیں۔ صبیحہ بیگم اپنے میاں کی رضامندی سے انہیں اپنے ساتھ رکھ لیتی ہیں۔ ان کی بہت سگھڑ، مگر قدرے عام صورت بیٹی گل ناز کو صبیحہ بیگم عبیدالرحمان کے لیے لینے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ گل ناز بھی عبیدالرحمان کو پسند کرتی ہے۔ دوسری طرف لاڈلی بیگم کی خواہش ہے کہ عبیدالرحمان کے لیے ان کی بیٹی طوبیٰ کو لیا جائے۔ صبیحہ بیگم بہت ہوشیاری سے مطیع الرحمان اور اپنی ساس کو گل ناز کے حق میں راضی کرلیتی ہیں۔

لیکن عبیدالرحمان کسی شادی میں نازمین کو پسند کرلیتے ہیں، جو محسنہ اور شاکر علی کی سب سے چھوٹی اور نہایت حسین بیٹی ہے۔ شاکر علی کی ہی طرح مغرور تھی۔ محسنہ انبالہ سے تعلق رکھنے والی ایک سادہ، ان پڑھ اور کم صورت خاتون تھیں جبکہ شاکر علی خوش شکل، خوش لباس پروفیسر تھے۔ انہوں نے محسنہ اور بچوں کی کفالت کے علاوہ کبھی بیوی بچوں میں دلچسپی نہ لی مگر نازمین پر انہوں نے خوب توجہ دی، جس کے باعث وہ مزید مغرور اور خود سر ہوئی۔

عبیدالرحمان بہت مشکل سے اپنے گھر والوں کو نازمین کے لیے راضی کرپاتے ہیں۔

شادی کے بعد ناز بے تحاشا مسائل میں پھنس جاتی ہے۔ عبیدالرحمان اپنی والدہ کے فرماں بردار ہوتے ہیں اور صبیحہ بیگم بہرحال ناز کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ لاڈلی بیگم بھی شادی کے دوسرے دن ہی گل ناز کے خلاف اس کے کان بھر دیتی ہیں۔ سسرال والے اس کی خوشیوں میں اچھی خاصی رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ صبیحہ بیگم کے بارے میں نازیبا الفاظ بولنے پر ناز پر ہاتھ اٹھا دیتے ہیں۔ ناز کے دل میں سسرال والوں سے شدید نفرت پیدا ہوجاتی ہے پھر وہ حتی المقدور اس نفرت کا اظہار اپنی باتوں اور حرکتوں سے کرنے لگتی ہے۔ اس کی دوست عالیہ اسے مزید شہ دیتی ہے۔ وہ عبیدالرحمان کو ان کے گھر والوں سے برگشتہ کرنے کے لیے ایسی حرکت کرتی ہے کہ عبیدالرحمان ٹیپو سے سخت ناراض ہوجاتے ہیں اور الگ ہونے کا فیصلہ کرلیتے ہیں۔ بعد میں پتا چلتا ہے کہ یہ سب ناز کی منصوبہ بندی تھی۔ ناز، شاہ زیب اور رامین کو باپ اور ددھیال سے بدگمان کرنا شروع کردیتی ہے۔

رامین کو باپ کی طرف داری کرتے دیکھ کر وہ عبیدالرحمان کو زچ کرنے کے لیے اس پر ظلم کرنے لگتی ہے۔ الگ گھر میں آکر ناز آزاد ہوجاتی ہے۔ اور عبیدالرحمان کے منع کرنے کے باوجود اپنی پرانی ایکٹوٹیز شروع کردیتی ہے۔ وہ غلط بیانی کرکے عبیدالرحمان سے رامین کو پٹواتی ہے۔

ناز اور عبدالرحمان کے درمیان خراب تعلقات شاہ زیب کو گھر سے لاتعلق کرنے لگتے ہیں۔ وہ غلط صحبت اختیار کرنے لگتا ہے۔ عبیدالرحمان کے کہنے پر شفیق الرحمان اپنے بھتیجے کو اپنے بچوں کے ساتھ گھریلو ایکٹوٹیز میں شامل کرتے ہیں۔ ناز کو پتا چلتا ہے تو وہ شاہ زیب پر ہاتھ اٹھا دیتی ہے۔ نتیجتاً شاہ زیب گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ عبیدالرحمان اپنے دوست کے بیٹے زین سے رامین کا نکاح کردیتے ہیں۔ رامین بہت خوش ہوتی ہے کہ اب اسے اس گھر سے نجات مل جائے گی جبکہ ناز اس نکاح سے خوش نہیں ہوتی۔ وہ زین کو بہت مبہم انداز میں رامین سے بدظن کرتی ہے۔ نکاح کے بعد زین، رامین کو ڈنر پر لے جاتا ہے۔ وہاں رامین کی باتیں اور انداز دیکھ کر زین اس کی طرف سے سخت مشکوک ہوجاتا ہے اور واپسی میں اپنے والد سے کہہ دیتا ہے کہ وہ رامین کو طلاق دے رہا ہے۔ کیونکہ وہ نفسیاتی مریضہ ہے۔ اس کے والد سمجھاتے ہیں مگر وہ نہیں مانتا۔ یہ خبر عبیدالرحمان کو ملتی ہے تو وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کرپاتے اور ان کا ہارٹ فیل ہوجاتا ہے۔ تایا سے رابطہ رکھنے پر ناز، رامین کے سر پر ایسی ضرب لگاتی ہے کہ اس کی بائیں آنکھ کی بینائی چلی جاتی ہے۔ ناز کی اچانک موت کے بعد رامین اس گھر کی ساری چیزوں کو آگ لگا دیتی ہے جو ناز نے بنائی ہوتی ہیں۔ عمر کے ساتھ لیزر ٹریٹمنٹ کروا کے نکلتے ہوئے رامین کی نظر زین پر پڑتی ہے۔ وہ اپنی بیوی اور چار سالہ بچے کے ساتھ ہوتا ہے۔

—۵—

پانچویں قسط

ٹیلی فون کی بیل خالی ہال کی دیواروں سے ٹکرا کر گونج اٹھی۔ رامین کا بے حس و حرکت جسم کافی دیر ایک ہی انداز میں بیٹھے رہنے سے اکڑ سا گیا تھا۔ بیل کی آواز پر وہ چیخ کر ایک دم سیدھی ہوگئی۔ تاریک ہال میں جیسے صور پھونکا جارہا تھا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔۔۔ اور دوسری بار جب صور پھونکا گیا وہ فون تک پہنچ کر ریسیور ہاتھ میں لے چکی تھی۔

جب دوسری بار صور پھونکا جائے گا تو ہر ذی روح پھر سے جی اٹھے گا۔ کیسے؟ اسے اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا۔ کیونکہ فون کرنے والے کی آواز سن کر اسے اپنے جسم میں زندگی دوڑتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ فون اس کے بھائی شاہ زیب کا تھا۔

چھ سال بعد وہ شاہ زیب کی آواز سن رہی تھی۔ اس نے کہا۔ وہ اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھے گا۔ اس کی خوشی کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔

ماں کے مرنے کے بعد.... یہ اس کی پہلی خوشی تھی۔ وہ خود کو مبارک باد دے رہی تھی۔ ہنستی رولی سجدے میں گر رہی تھی پھر اٹھ کر مسکراتی ہوئی آسمان کو دیکھتی، چاند کو دیکھتی۔۔۔ ستارے جو پہلے سے زیادہ روشن محسوس ہونے لگے تھے ان سے کہہ رہی تھی ۔۔۔ میں بہت خوش ہوں۔ پھر اس کا سارا دھیان رب کائنات کی طرف چلا گیا۔

خوب خوب رو لینے اور شکر کرنے کے بعد اس کا دل پھول کی طرح ہلکا ہوگیا تھا۔

✲ ✲ ✲

لاس اینجلس انٹرنیشنل ایرپورٹ پر ان کے جہاز کو لینڈ کیے آدھ گھنٹہ ہوچکا تھا۔ بیگیج بیلٹ کے سامنے وہ اپنے سامان کے انتظار میں ٹرالی پکڑے کھڑی تھی اور شاہ زیب اس سے دو قدم آگے تھا۔

"تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے۔۔۔" شاہ زیب نے سامان رکھنے کے بعد ٹرالی چلاتے ہوئے رامین سے کہا۔

"کیا۔۔۔؟" رامین سوالیہ نظروں سے بھائی کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ پہلے ہی اسے اپنی شادی کے متعلق بتا چکا تھا۔ طارق ماموں اور مہ جبیں خالہ سے تو وہ اسی وقت فون پر بات کرچکی تھی۔ پھر ایسا کون سا سرپرائز رہتا ہے، وہ اندازہ نہیں لگاپائی اور سوچتی رہی۔ شاہ زیب نے چلتے چلتے ایک اور جملہ کہہ کر اس کے شوق میں مزید اضافہ کردیا۔

"ایک بہت ہی اہم شخصیت تمہیں ایرپورٹ سے ریسیو کرنے آئی ہے۔"

"بھائی! کس کی بات کررہے ہیں؟" اس نے بے حد لاڈ کے ساتھ شاہ زیب کا بازو پکڑ کر پوچھا۔

"اگر بتادوں گا تو سرپرائز تو نہ ہوا ناں۔" شاہ زیب اسے پریشان دیکھ کر مزے لے رہا تھا۔

"کوئی ہنٹ تو دیں۔" وہ دونوں چلتے ہوئے ٹرمینل کے باہر کی طرف بڑھنے لگے۔

"ہوں۔۔۔ اچھا یہ بتاؤ تمہیں نیلوفر یاد ہے؟"

"نیلوفر؟" رامین نے ذہن پر خوب زور ڈالا۔ اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ اس نام کی کوئی بھی لڑکی سے اس کی واقفیت رہی ہے۔ اس نے فوراً نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنی شکست کا اعتراف کرلیا۔

"حیرت ہے.... تم بھول گئیں اسے؟ تمہاری وہ پہلی گڑیا، نیلی آنکھوں والی جو پلکیں جھپکتی تھی۔ تم نے اس کا نام نیلوفر رکھا تھا۔"

"ہاں۔۔۔" وہ ایک دم پرجوش ہوگئی۔ "خالہ امریکہ سے لائی تھیں میرے لیے.... میری اتنی پیاری گڑیا ۔۔۔ نیلوفر!"

"ہاں وہی.... جس کے بغیر نہ تم کھانا کھاتی تھیں اور نہ سوتی تھیں...."

"جی....!" رامین نے شاہ زیب کو یاد دلانا ضروری سمجھا "اور آپ نے اسے توڑ دیا تھا ناں.... کتنا روئی تھی میں۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ جس کے ٹوٹ جانے پر ہمارے گھر میں

آنسوؤں کا سیلاب آگیا تھا۔۔۔ پھر میں نے تم سے پرامس کیا تھا کہ تمہیں بالکل ویسی ہی ایک اور گڑیا خرید کر دوں گا۔۔۔" شاہ زیب کے اعتراف جرم کرتے ہی سرپرائز کی گتھی بھی سلجھ گئی۔

"تو کیا آپ نے میرے لیے ویسی ہی گڑیا خرید لی ہے؟ مجھے یقین نہیں آرہا۔" رامین کی خوشگوار حیرت پر شاہ زیب نے مسکرا کر بس اتنا ہی کہا۔

"ابھی یقین آجائے گا۔۔۔"

☼ ☼ ☼

وہ خاموشی آج بھی اس کے اندر چھپی بیٹھی تھی۔ رامین کو کھونے کے بعد اس نے اپنے دل کے تمام دروازے جیسے مقفل کر چھوڑے تھے۔ اس نے جوگ نہیں لیا تھا، پر جانے کیا تھا؟ جو اس کے دل کو کسی اور کی طرف مائل ہی نہیں ہونے دے رہا تھا۔

رضا کے گھر گئے ہوئے ڈیڑھ مہینہ ہونے والا تھا۔ آج شاپنگ کرتے ہوئے رامین دوبارہ نظر آئی۔ اس نے بچی کو ٹرالر میں بٹھایا ہوا تھا اور خود ایک ونڈ چائم کو ہاتھوں سے چھو کر دیکھ رہی تھی۔ یہ ونڈ چائم سیپیوں سے بنا ہوا تھا۔

رامین نے طلب کرنے پر سیلز گرل نے شیلف سے ایک باکس نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمایا تو فوراً ہی وہ ادائی کے لیے کیش کاؤنٹر کی طرف چلی گئی۔

وہ یہاں کرنے کیا آیا تھا؟ اسے یاد ہی نہیں رہا تھا۔ رامین کے نظر آتے ہی اس کا ذہن جیسے مفلوج ہو جایا کرتا تھا۔ اور رامین۔۔۔ اسے تو خبر بھی نہیں تھی کہ ایک شخص پر اسے اس قدر اختیار حاصل ہے۔۔۔ اسی کیفیت میں گھرا سیپیوں سے بنے ونڈ چائم کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا جہاں کچھ دیر قبل رامین کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے سیلز گرل سے ڈسپلے میں رکھا وہی ونڈ چائم پیک کروایا اور ادائی کر کے باہر نکل آیا۔ نظر رامین کے ساتھ اس بچی کو اسٹرالر سے باہر نکالتے شخص پر جا رکی جس کو دور پارکنگ میں ہونے کے باوجود مہرز بخوبی دیکھ سکتا تھا کہ وہ رامین سے کس قدر نزدیک ہے۔ اس نے بچی کو پہلے رامین کی گود میں دیا تھا اور ہنستے ہوئے اس کے گال پر ہاتھ پھیرا تھا بہت پیار سے۔۔۔ رامین نے بچی کو پچھلی سیٹ سے بندھی کڈی سیف بوسٹر سیٹ پر بٹھایا اور وہ شخص۔۔۔ جو یقیناً" اس کا شوہر تھا، اسٹرالر کو فولڈ کر کے ڈگی میں ڈالنے لگا۔ پھر دونوں کسی بات پر قہقہہ لگاتے گاڑی میں بیٹھے اور چلے گئے۔

مہرز لب بھینچ کر وہیں کھڑا انہیں ہنستے، ملتے، باتیں کرتے وہاں سے جاتا دیکھتا رہا۔ دونوں آج بھی ساتھ تھے۔ پہلے سے زیادہ مضبوط رشتے میں بندھے ایک بیٹی کے ساتھ اور وہ۔۔۔ آج بھی اکیلا تھا۔۔۔ بالکل تنہا۔۔۔!

جیری نے مہرز کے لیے دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے اپنا بریف کیس جیری کو پکڑایا، جسے فوراً" ہی اسٹڈی میں اس کی جگہ پر رکھنے کے لیے چلا گیا۔ لاؤنج میں آکر وہ اپنا کوٹ اتارنے لگا۔ کوٹ اتار کر اس نے صوفے پر رکھا اور بیٹھ کر جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔ جیری اب اس کا کوٹ اٹھا کر اس کے وارڈ روب میں ہینگ کرنے چلا گیا۔ مہرز اپنے جوتے موزے اتار کر جیسے ہی سیدھا ہو کر بیٹھا اس کی نظر ڈائننگ ہال میں میز کے اوپر سجے چاکلیٹ کیک پر جا رکی۔ جس کے ساتھ ایک گلدان بھی رکھا ہوا تھا۔

اس نے سوالیہ نظروں سے جیری کی طرف دیکھا جو اس کے جوتے ہاتھ میں اٹھائے اس کے اگلے حکم کا منتظر کھڑا تھا۔ مہرز کی آنکھوں سے جھلکتے سوال کے جواب میں پہلے اس نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا اور پھر نہایت ادب سے گویا ہوا۔

"جناب! آپ کے پڑوسی گھر سے ایک بہت پیاری لڑکی یہاں آئی تھی، اس نے بتایا کہ مسز علوی نے خصوصی طور پر یہ چیزیں آپ کے لیے بھجوائی ہیں۔"

مہرز سوچ میں پڑ گیا۔ مسز علوی کے دو بیٹے تھے جو بیکرز فیلڈ میں نہیں رہتے تھے۔ پھر وہ لڑکی کون ہو سکتی ہے؟ وہ اٹھ کر ڈائننگ ٹیبل کے نزدیک آیا۔ ایک چمچہ اٹھا کر اس نے کیک کے کنارے سے چھوٹا سا پیس

کاٹ کر منہ میں ڈال لیا۔ ڈارک چاکلیٹ کا ہلکا سا ترش ذائقہ لائٹ کریم اور روسٹڈ آلمنڈ کے ساتھ بہترین مزا دے گیا۔

"بے حد مزے دار!" مہرز نے بے ساختہ کہا۔ جیری بے ساختہ مسکرانے لگا۔ پھر مہرز نے جیری کو تاکید کی کہ وہ اسی وقت مسز علوی کو جا کر یہ پیغام دے کر شام کی چائے مہرز ان کے ساتھ ہی پیے گا۔ جیری اس کی بات سن کر فوراً" ہی مسز علوی کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان کا گھر بھی مہرز کے بالکل ساتھ ہی تھا۔

مہرز کی امی سے مسز علوی کی بہت اچھی دوستی رہ چکی تھی۔ وہ اسے بھی بیٹے کی طرح چاہتی تھیں اور اس کی امی کے انتقال کے بعد سے اس کا زیادہ خیال رکھنے لگی تھیں۔ وہ ان کے گھر بے تکلفی سے آیا جایا کرتا تھا۔ کاروباری مصروفیت بڑھنے کے ساتھ جہاں اس کا ان کے گھر جانا کم ہوا تھا، وہیں رابطے میں بھی خاطر خواہ کمی آئی تھی۔ پھر بھی وہ جب ان سے ملتا، پچھلی ساری کسر نکال دیا کرتا تھا۔ اب شام کو وہ ان کے گھر جا رہا تھا۔

وہ لڑکی پانی کا پائپ ہاتھ میں لے کر اچھلتی کودتی لان کو پانی دے رہی تھی۔ پریشر پائپ سے نکلتی پانی کی تیز پھوار خود اس کے کنٹرول سے باہر ہو رہی تھی۔ تب ہی اچانک اس کے سامنے مسز علوی کی سیامی بلی آئی اور پانی سے بچنے کے لیے گویا کرنٹ کھا کر دوڑ پڑی۔ اس لڑکی نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ جو اتنے فاصلے پر ہونے کے باوجود مہرز کو صاف سنائی دیا۔ وہ قدرے تعجب سے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ مسز علوی بہت سوبر خاتون تھیں۔ یونیورسٹی میں پڑھاتی تھیں۔ نہ جانے یہ لڑکی ان کی کیا لگتی تھی۔۔۔ جو اتنی دیر سے اوٹ پٹانگ حرکتیں کیے جا رہی تھی اور وہ اسے روک بھی نہیں رہی تھیں۔ بلکہ چائے پیتے ہوئے گاہے بگاہے اس کے ہنستے کھلکھلاتے وجود پر ایک محبت بھری نظر بھی ڈال رہی تھیں۔ کچھ دیر وہاں بیٹھ کر مہرز اپنے گھر واپس آگیا۔

مہ جبیں نے نازنین کے غم میں اپنی طبیعت خراب کرلی تھی۔ طارق اور تابندہ دونوں بہن کے پاس آگئے تھے۔

"میں پاکستان جانا چاہتی ہوں۔" ان کی بات سن کر تابندہ اور طارق ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

"اب کیا کریں گی جاکر۔۔۔ ایک ہفتہ ہوگیا اسے دفنائے ہوئے۔" مہ جبیں نے تاسف بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ "وہ اچھی بری جیسی بھی تھی ہماری بہن تھی۔

میں، تم، تابندہ ہم سب ہمیشہ اسے غلط کہتے رہے، برا سمجھتے رہے۔ اس کی رہنمائی نہیں کی۔۔۔ اسے گلے نہیں لگایا، اپنا نہیں سمجھا۔ نہ عبید اس کی امیدوں پر پورا اترا، نہ اس کے ماں باپ اور نہ ہم اس کے ماں جائے۔۔۔ ہمیں اس سے لاکھ شکایات سہی پر جب وہ مشکل میں تھی ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے تھی۔"

"اس نے خود بھی کسی کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش نہیں کی تھی باجی! نہ وہ اچھی بیٹی تھی، نہ اچھی بہن نہ ہی اچھی بیوی اور ماں تھی۔ اس نے کسی رشتے کا حق ادا نہیں کیا۔ غلطی صرف ہماری تو نہیں۔۔۔" طارق کے لہجے میں واضح احتجاج تھا۔

"تمہاری نظر میں صرف ہماری ہی غلطی ہونی چاہیے طارق۔۔۔ ہماری لاتعلقی نے کچھ سنوارا نہیں۔۔۔ مزید بگاڑ ہی پیدا کیا۔ نازنین کو سب نے تنہا چھوڑ دیا۔ کسی برے شخص کو تنہا چھوڑ کر تو اسے اچھا نہیں بنایا جاسکتا۔"

مہ جبیں صحیح کہہ رہی تھیں۔ طارق اور تابندہ دونوں کو اپنی غلطیوں کا احساس ہونے لگا تھا۔ ان کے شرمندہ چہرے اور خاموشی اس بات کی گواہی تھے۔ مہ جبیں نے مزید کہا۔

"طلیبہ کو بڑی مشکل سے میرا نمبر ملا تھا اس لیے دیر سے بتایا اس نے۔۔۔ رامین اکیلی ہے وہاں۔۔۔ میں اس کے لیے جانا چاہتی ہوں۔ شاہ زیب بھی عرصہ ہوا گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ کسی کو نہیں معلوم کہاں ہے۔"

طارق نے چونک کر سر اٹھایا۔ "کل شام میری ایئرپورٹ پر۔۔۔ اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ خاصا اسٹیبلش ہے وہ۔ شاید پاکستان جائے۔ میں ابھی آپ کی اس سے بات کروا دیتا ہوں۔"

طارق نے اپنا سیل فون نکال کر شاہ زیب سے مہ جبیں کی بات کروا دی۔ اس نے انہیں بتا دیا کہ وہ پاکستان جانے کی تیاری کررہا ہے اور اب رامین کو لے کر ہی واپس آئے گا۔

☆ ☆ ☆

ان دونوں کو آتے دیکھ کر حرا نے ہاتھ ہلایا تو شاہ زیب رامین کو لے کر اس کی طرف چل پڑا۔ "یہ تمہاری بھابھی ہیں، حرا۔۔۔" شاہ زیب نے اپنی خوب صورت بیوی سے رامین کا تعارف کروایا جس کی گود میں سرخ و سفید پھولے پھولے گالوں والی ڈیڑھ سال کی بہت ہی پیاری بچی تھی۔ اس کی آنکھیں بالکل حرا جیسی تھیں گہری نیلی۔۔۔ رامین اسے دیکھتی رہ گئی۔

"اور یہ ہے تمہاری نیلوفر۔۔۔" شاہ نے ہاتھ بڑھا کر حرا کی گود سے نیلوفر کو لے کر اسے رامین کے بازوؤں میں دے دیا۔

"بھائی! یہ تو بالکل میری گڑیا لگتی ہے۔" اسے خوب پیار کرنے کے بعد وہ شاہ زیب سے لپٹ گئی۔

"تھینک یو بھائی۔۔۔" اس خوب صورت سرپرائز نے آنکھوں میں پانی بھر دیا تھا۔

اپنی گاڑی تک پہنچنے سے پہلے حرا اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا چکی تھی۔ اس کے دوستانہ مزاج کا بھی رامین کو اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ ایک پرخلوص اور خوش مزاج لڑکی ہے۔ حرا کو دیکھ کر اس سے مل کر پہلا تاثر یہی ابھرتا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلے ایک ڈیڑھ ہفتے میں وہ اپنے تمام ننھیال والوں سے ملاقات کرچکی تھی۔ مہ جبیں خالہ میں تو اسے اپنی نانی کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ تابندہ خالہ بھی بہت پیار سے ملیں۔ ان کا گھر لاس اینجلس میں تھا اور وہ اپنے شوہر اور دو بچوں لیلیٰ اور فرقان کے ساتھ ویک

اینڈ پر اس سے ملنے آئی تھیں۔ وہ سب لوگ اس سے یوں بے تکلفی سے پیش آرہے تھے۔ جیسے وہ ہمیشہ سے ان کے ساتھ رہتی آئی ہو۔ جبکہ وہ ابھی تک جھجک محسوس کررہی تھی۔ وہ لیلیٰ اور فرقان کو طارق کے بازو سے لٹک کر فرمائشیں کرتے دیکھتی تو مسکرا دیتی، لیکن خود اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پاتی تھی کہ بے دھڑک ان کے ساتھ گفتگو کرلیتی۔

حرا نے بہت جلد اس کا یہ گریز محسوس کرلیا۔ بظاہر تو یہ اتنی بڑی بات نہیں تھی کیونکہ وہ اتنے سالوں بعد اپنے ننھیال والوں سے مل رہی تھی یکدم تو فری نہیں ہوسکتی تھی لیکن حرا اسے ایک سائیکالوجسٹ کی نظر سے پرکھ رہی تھی۔

رامین ایک اچھی اور خوب صورت لڑکی ہونے کے باوجود پراعتماد نہیں تھی۔ زیادہ لوگوں میں وہ نروس رہتی اور ٹھیک طرح سے بات نہیں کرپاتی تھی۔ اس کی قوت فیصلہ بے حد کمزور تھی۔ اس کا مزاج بھی عجب دھوپ چھاؤں سا رہتا تھا۔ کبھی بے انتہا خوش ہوجاتی اور کبھی بے حد اداس۔۔۔ اسے اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں کا ادراک بھی نہیں تھا۔ ہیومن نیچر اور بی ہیویئر پر اس کی معلومات قابل رشک تھیں اور وہ رامین کی شخصیت کا ہر خلا محسوس کررہی تھی۔

☆ ☆ ☆

ناشتے کی ٹیبل پر رامین نیلوفر کی شرارتوں سے محظوظ ہورہی تھی جب حرا کے اشارے پر شاہ زیب نے اسے متوجہ کیا۔

"تم ناشتا کرلو پھر تیار ہوجانا، حرا تمہیں ڈرائیونگ اسکول لے کر جائے گی۔"

اس کا ردعمل حرا کی توقع کے عین مطابق تھا۔

"نہیں بھائی! میں ڈرائیونگ نہیں کرسکتی، میں ایکسیڈنٹ کردوں گی۔"

حرا نے مسکراتے ہوئے اس کا جواب سنا اور کہا۔ "تم ایکسیڈنٹ نہ کرو۔ اسی لیے پہلے تمہیں ڈرائیونگ سکھا رہے ہیں، پھر ہی کار دلائیں گے۔" وہ نیلوفر کو بے بی چیئر سے نکال کر اس کا منہ دھلانے چلی گئی۔ شاہ زیب نے گہری نظروں سے رامین کی طرف دیکھا، وہ ناشتا چھوڑ کر باقاعدہ اپنا سر پکڑے بیٹھی تھی۔

"گڑیا! یہاں ڈرائیونگ کیے بغیر چارہ نہیں۔ ہزاروں کام پڑجاتے ہیں، کہیں آنا جانا ہو تو آرام سے جاسکو گی، کسی کی محتاجی نہیں ہوگی۔"

اس نے منہ بنایا۔

"بس میں کہہ رہا ہوں۔ تم فوراً ریڈی ہوجاؤ۔۔۔ میں اس معاملے میں کچھ نہیں سنوں گا۔" شاہ زیب نے چائے کا کپ میز پر رکھا اور کرسی دھکیل کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے بڑے بھائی کی حیثیت سے اسے حکم دیا تھا جو اسے ماننا ہی تھا۔

یہ تو اسے بعد میں معلوم ہوا تھا کہ یہ آئیڈیا حرا کا تھا۔

حرا نے اسے اپنے ساتھ ہر کام میں شامل کرنا شروع کردیا۔ پیٹرول اسٹیشن پر وہ رامین سے کہتی کہ کار سے اتر کر پیٹرول بھرے اور پیسے بھی اسے ہی تھما دیتی۔ چند ایک بار اس سے کچھ غلطیاں ہوئیں۔ اس کے باوجود حرا اس کی حوصلہ افزائی کرتی رہی۔ وہ اسے اپنے قصے سنایا کرتی اور یقین دلاتی کہ جتنی بے وقوفیاں وہ کرچکی ہے، رامین اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

اسی طرح حرا رامین کو اکثر نیلوفر کے ساتھ ڈراپ کرکے خود گروسری کے لیے چلی جایا کرتی۔ اسے خود ہی نیلوفر کے لیے شاپنگ کرنی پڑتی۔ ابتدا میں وہ فیصلہ نہیں کرپاتی تھی کہ کیا خریدا جائے؟ لیکن آہستہ آہستہ خریداری آسان ہوگئی۔

اس نے ڈرائیونگ سیکھ لی اور لائسنس بھی حاصل کرلیا۔ جس دن لائسنس اس کے ہاتھ میں آیا تھا، وہ دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کرکے خوشی سے چیخیں مارتی پورے گھر میں بھاگی تھی۔ دوبار اس کا ڈرائیونگ ٹیسٹ لیا گیا۔ جن میں وہ فیل ہوگئی تھی بے حد معمولی غلطیوں پر۔۔۔ پہلی بار تو وہ تھوڑا نروس تھی بریک کے بجائے ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھ دیا، فیل ہوگئی۔ دوسری بار اس نے کار ٹرن کرتے وقت انڈی کیٹر دینے کے

بعد سائیڈ مرر میں دیکھا گردن موڑ کر نہیں۔ دوبارہ فیل ہو گئی۔ اسے بہت غصہ آیا تھا۔ اس رات ٹیبل پر چھوٹے بچوں کی طرح منہ بسور کر شاہ زیب کو پوری روداد سنانے کے بعد۔۔۔ شکوہ کیا "اتنی سی غلطی پر مجھے فیل کر دیا بھائی۔" اور شاہ زیب ہنس پڑا تھا۔

"کوئی بات نہیں پھر سے کوشش کرو۔"

اور آج وہ خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ بار بار اپنا ڈرائیونگ لائسنس دیکھ رہی تھی اور اپنی تصویر بھی، پھر یہ اطلاع فیس بک کے ذریعے ہر خیر خواہ تک پہنچی اور مبارک باد کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔

وہ اب خوش ہونا سیکھ گئی تھی۔ خوش ہونا اور خوشی کا اظہار کرنا اس نے لیلیٰ اور فرقان سے سیکھا تھا۔

خوش رہنا اور خوشی کا بے ساختہ اظہار اس چھوٹی سی فیملی کا خاصہ تھا۔ تابندہ نے اسے ہمیشہ دبے رنگ پہنے دیکھا تو ان ہی رنگوں میں چار سوٹ اسے لا کر دیے۔

خوشگوار حیرت سے وہ تمام ڈریسز نکال کر دیکھنے لگی۔ ڈل کلرز پہ خوش رنگ کڑھائی اور لیسز اور زیادہ خوب صورت لگ رہی تھیں۔ اس کی پسند کے عین مطابق تمام سوٹوں کے ساتھ بڑے دوپٹے تھے۔

"پسند آئے؟" تابندہ اسے خوش ہوتا دیکھ کر پوچھنے لگیں تو وہ فوراً" آگے بڑھ کر ان کے گلے لگ گئی۔

"تھینک یو خالہ۔۔۔ بہت اچھے ڈریسز ہیں۔"

تابندہ نے بھی اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور خوب پیار کرنے لگیں۔

"تم میرے لیے لیلیٰ سے کم تو نہیں ہو، بہت پیار کرتی ہوں میں تم سے۔۔۔ آج کے بعد یہ مت سمجھنا کہ تمہاری ماں نہیں ہے، میں ہوں تمہاری ماں۔۔۔ سمجھیں؟"

وہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر اسے اپنی ممتا کا یقین دلا رہی تھیں اور رامین ان کی آنکھوں میں اپنے لیے بے پناہ محبت دیکھ رہی تھی، اس کا دل چاہا وہ اسی طرح ان سے لپٹی رہے، اتنے برسوں کی پیاس تھی یوں پل بھر کی ممتا سے وہ کہاں سیراب ہونے والی تھی، لیکن اس کے باوجود تپتے وجود میں تپش کچھ کم ہو گئی تھی۔

باقی جتنے دن وہ ان کے گھر میں رہی تھانے بہلانے سے ان کے ساتھ لگی رہی۔ وہ جیسی تھی انہیں پیاری تھی اور قبولیت کے اس احساس نے رامین کو سر اٹھا کر بات کرنے کی وہ ہمت عطا کی جو پہلے اس میں نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

سانس لینے کے لیے آکسیجن سے بھرپور ہوا، پیاس بجھانے کے لیے صاف پانی، پیٹ بھرنے کے لیے ضروری اجزا پر مشتمل غذا اور موسم کی سختیاں جھیلنے کے لیے ایک مضبوط اور آرام دہ گھر کو اہم جسمانی ضروریات سمجھا جاتا ہے، بالکل اسی طرح یا شاید اس سے بھی زیادہ اہم نفسیاتی ضروریات کا پورا ہونا ہے۔ ماں باپ کی غیر مشروط محبت، خاندان کا معاشرے میں باعزت مقام، اپنی انا اور خود داری عزت نفس کی تسکین کے لیے بے حد اہم ہے۔ انسانی جسم سوکھی روٹی، گندے پانی اور غلیظ محلے میں پل بڑھ کر جوان ہو سکتا ہے پر والدین کی محبت کے بغیر ذہنی نشوونما ہرگز نارمل نہیں رہتی۔

اپنے پاپا کی "کم بولو۔۔۔ سنو زیادہ" کی تلقین سن کر وہ خاموش رہنے کی کوشش کرتی اور جب کبھی بولنے کا موقع آتا تو اکثر اوٹ پٹانگ بات منہ سے نکل جاتی۔

"تم نے یہ کیوں کہا۔۔۔ ایسے کیوں کہا، یہ نہ کہیں۔" ایسے فقرے سن سن کر اس نے اپنے بارے میں یہی رائے قائم کر لی تھی کہ اسے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے اس لیے چپ ہی رہے تو بہتر ہے۔ اپنی گفتگو کی پذیرائی نہ ہوتے دیکھ کر وہ اپنے خول میں سمٹنے لگی جس قدر وقت گھر کے کام کاج کے بعد بچ جاتا اس کا مشغلہ کتابیں پڑھنا رہ گیا تھا۔

اس کے بعد ڈرائنگ میں مہارت ایک ایسا ہنر تھا جس نے گھر سے باہر کالج میں اسے توجہ کا مرکز بنا دیا تھا۔ مگر جو کمی ماں باپ کی محبت پوری کر سکتی ہے وہ تمام دنیا کی تعریف و توصیف، پذیرائی اور پسندیدگی نہیں کر سکتی۔ ایک طرف وہ باپ کو ماں پر تنقید کرتے سنتی تو خود کو ان کی پسند کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش میں لگ جاتی اور ناز اسے مسترد کر دیتیں۔ ان کی محبت پانے کے لیے وہ گدھوں کی طرح گھر کا ہر کام کرتی چلی جاتی کہ اس سے انہیں آرام ملے گا۔ آٹا گوندھنے سے لے کر کھانا پکانے تک، کچن صاف کرنے سے لے کر گھر کے کونے کونے کی صفائی کرنے تک، حتیٰ کہ باتھ روم اور قالین دھونے تک اس نے کبھی پس و پیش سے کام نہیں لیا تھا۔ اس کے باوجود وہ ناز کے دل میں جگہ بنانے میں ناکام رہی تھی۔

ناز کو تو اس کی شکل بھی پسند نہیں تھی۔ جب بھی وہ غور سے اس کا چہرہ دیکھتیں فوراً" ہی رگڑ کر منہ دھونے کی تاکید کر کے اسے وہاں سے ہٹا دیتیں۔ اس کا دل بجھ کر رہ جاتا، نہ ہی اس کی عادات نہ شکل و صورت۔۔۔ کچھ بھی ایسا نہیں تھا جس کی بنا پر وہ اپنی ماں کے لیے قابل قبول ہو، بچپن میں کی جانے والی یہ ساری کوششیں نوجوانی تک آتے آتے ماند پڑنے لگیں۔ بے حسی کی چادر خود پر اچھی طرح لپیٹ کر بے نیازی کا ڈھونگ رچا کر اسے تسکین ملنے لگی۔ جب ناز اسے مارتے مارتے تھک جاتیں اور وہ کمال ضبط کا مظاہرہ کرتی۔ آنکھ سے ایک بھی آنسو نہ گرنے دیتی تو وہ تلملا کر رہ جاتیں۔ اس وقت رامین کو تسکین ملتی۔

نماز پڑھنے میں شروع سے پکی تھی۔ وجہ بے حد عجیب سی تھی کہ اسے سچے خواب دیکھنے کا شوق تھا جو نظر آتے، پر سچے تھے یا نہیں۔۔۔ اسے کبھی سمجھ نہیں آیا تھا۔ بچپن میں نانی امی یعنی محسنہ نے ایک بار سونے سے پہلے اسے حضرت یوسف علیہ السلام کا وہ قصہ سنایا تھا جس میں وہ اپنے بھائیوں کے متعلق مستقبل کی پیش گوئی کرتا ایک خواب دیکھتے ہیں اور والد سے اس کا مطلب پوچھتے ہیں۔ پورا واقعہ سن لینے کے بعد رامین نے ان سے پوچھا تھا کہ "سچے خواب کیسے نظر آتے ہیں؟"

"سچے خواب معصوم لوگ کو نظر آوے ہیں۔۔۔ نہ برا دیکھو نہ برا سوچو، نہ کرو نہ ہی بولو۔۔۔ آپ ہی سچے خواب آویں گے۔" اللہ کی سادہ بندی نے سادہ سی بات کہی جو رامین کے دل میں بیٹھ گئی محسنہ نے مزید سمجھایا کہ ہر برائی سے بچنے کے لیے نماز پڑھنا ضروری ہے۔

زین کے اپنی زندگی میں آنے کے بعد تو وہ ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔ جتنا اونچا اڑ رہی تھی اسی تیزی سے منہ کے بل زمین پر گرا دی گئی تھی۔۔۔ اس رات وہ بہت لڑی تھی اللہ سے۔

وہ روتی لڑتی بے دم سی ہو کر فرش پر گر گئی تھی۔ یہ دکھ، یہ تکلیف اتنی بڑی نہیں تھی۔ اس کا ادراک اگلی شام اسے تب ہوا جب عبید الرحمان کے ہارٹ اٹیک کی خبر سننے کو ملی۔ پاپا کی موت نے ہر چیز پس پشت ڈال دی۔

اس نے سب کچھ سوچا، پر یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس کی ماں مر جائے گی۔ اپنی موت کی بارہا دعا مانگی پر یہ خواہش کبھی نہیں کی تھی کہ ماما اس دنیا سے چلی جائیں۔ وہ تو ان کے سامنے مرنا چاہتی تھی جانے کیوں اسے یقین تھا کہ اس کے مرنے کے بعد ناز نین کو اپنے کیے کا پچھتاوا ضرور ہو گا۔ جب وہ اس کے نیل و نیل بدن کو اپنے ہاتھ سے غسل دیتیں تو انہیں معلوم ہوتا کہ ان کے ہاتھوں نے کیسی کاری ضربیں لگائی ہیں، شاید انہیں پتا چلتا کہ اس کی آنکھ بینائی سے محروم ہو گئی ہے۔ اس کے لمبے بالوں کے ٹوٹے گچھے اگر ان کی انگلیوں میں پھنس جاتے تو شاید انہیں افسوس ہوتا، شاید وہ اس کے لیے روتیں۔ اس کے مردہ جسم سے لپٹ کر۔۔۔ شاید ایک بار اسے پیار کر لیتیں۔۔۔ بس ایک بار۔۔۔ لیکن ان کی موت کے ساتھ ہی ازالے کا ہر امکان ختم ہو گیا۔

شاہ زیب اسے لے کر کیلی فورنیا آگیا۔ وہ گھر، گلی، کوچہ، شہر وہ دیس چھوٹ گیا تھا، پر اس سے منسلک ہر اچھی بری یاد اس کے ساتھ یہاں تک چلی آئی تھی۔ تنہائی کے چند لمحے اسے واپس ماضی میں دھکیل دیا کرتے۔ وہ اس تکلیف سے گزر چکی تھی۔ پر وہ تکلیف نہیں گزری تھی۔ وہ درد آج بھی اس کے اندر

تھا۔ پھر حرا اس کی تنہائیوں میں کچھ غیر محسوس انداز سے دخیل ہونے لگی۔ وہ رامین کی پیدا کردہ نا تھی کرتی تھی ہر اس کام میں جو اس کے آنے سے قبل وہ اکیلی کرتی آئی تھی۔ وہ تکلفاً "اسے اپنے ساتھ پارٹیز میں چلنے کے لیے نہیں کہتی تھی بلکہ نیلوفر کو تیار کر کے فوراً" اس کی گود میں دے کر کار میں بیٹھنے کا کہہ دیتی۔ رامین سے کسی بھی قسم کی ہمدردی یا ماضی کے متعلق کوئی سوال کیے بغیر وہ اس کے ساتھ آنے والے دن کی پلاننگ کرتی۔ مشورہ مانگتی' مدد طلب کرتی۔ یوں جب ویک اینڈ پر لیلیٰ اور تابندہ خالہ اسے لینے کے لیے آئے تو وہ انکار کے بہانے ڈھونڈنے لگی۔ اس کے بغیر حرا اکیلی کیسے سب کچھ سنبھال پاتی' پر اس وقت وہ حیران ہی رہ گئی جب حرا نے خود اس کی طرف سے ہامی بھرلی اور اسے اپنا سامان پیک کرنے کے لیے کہا۔ یعنی وہ چاہتی تھی کہ رامین لاس اینجلس ضرور جائے۔

حرا نے جان بوجھ کر اسے اتنا مصروف رکھنا شروع کردیا تھا کہ وہ اندازہ ہی نہیں لگا پائی تھی کہ یہ سب کچھ اس کے منصوبے کے مطابق ہو رہا ہے۔ اب اس کے ویک اینڈز دونوں خالاؤں کے گھر آنے جانے میں گزرنے لگے تھے اور وہاں اسے سوچنے کے مواقع ذرا کم ہی میسر آتے تھے۔ لیلیٰ کی ہنس مکھ طبیعت سے اس کے اپنے مزاج پر بہت مثبت اثر ہو رہا تھا۔ دھیرے دھیرے... آہستہ آہستہ... نرمی سے...

شاہ زیب نے اسے آئی اسپیشلسٹ کو دکھایا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کی بے حد ہمت افزائی کی تھی۔

☼ ☼ ☼

ہلکی میوزک کی آواز سرسراتی ہوا کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ رامین نے چونک کر سر اٹھایا۔ "اس وقت گانے کون سن رہا ہے؟" آواز یقیناً" ساتھ والے گھر سے آرہی تھی۔ اپنی کتاب بند کرکے وہ بستر سے نیچے اتری' سلیپرز پہنے اور دروازے میں کھڑی ہوگئی۔

مہ جبیں خالہ کے گھر کا عقبی لان نہایت وسیع و عریض تھا اور اس کے کمرے سے لے کر گھر کے آخری سرے تک جو حصہ لان کی طرف تھا' اس کی دیواریں نہیں تھیں بلکہ گلاس سلائیڈنگ ڈورز تھے۔ لان کے اختتام پر تین فٹ اونچی دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کر نشیب میں پورا شہر دکھائی دیتا تھا۔

یہاں اس لین میں تمام گھر اسی طرز پر تعمیر تھے جس گھر سے رات کے پونے بارہ بجے کوئی غزل سنائی دے رہی تھی۔ وہ چلتی ہوئی اس باؤنڈری وال تک آئی اور سامنے دیکھنے لگی۔ اس گھر کے آخری سرے پر موجود کمرے میں روشنی تھی اور اس کا گلاس ڈور بھی کھلا ہوا تھا جس غزل کو سنتے ہی وہ بے اختیار اپنے کمرے سے باہر نکل آئی تھی اس کی آواز اب اور واضح سنائی دے رہی تھی۔

وہ پل کہ جس میں محبت جوان ہوتی ہے
اس ایک پل کا تجھے انتظار ہے کہ نہیں

ابھی تک وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ پائی تھی' لیکن اگر وہ شخص پلٹتا تو رامین کو ضرور دیکھ سکتا تھا۔ رات کے اس پہر وہ ایک غیر شخص کو یوں گھور گھور کے کیوں دیکھ رہی ہے۔ انتہائی غیر اخلاقی حرکت تھی۔ اپنے آپ کو دل ہی دل میں سرزنش کرتی وہ فوراً" ہی وہاں سے ہٹ گئی۔ برآمدہ پار کرتے ہی اشعار کے الفاظ مبہم سے ہوگئے' اس کے لبوں نے بے اختیار وہی غزل چھیڑ دی... پھر وہ رک گئی... ٹھہر گئی۔

اسے کوئی یاد آیا تھا۔ گم صم سی بے چہرہ یاد کو سوچتی اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور دروازہ کھلا رہنے دیا۔ ہلکی سی خنک ہوا کے خوشگوار جھونکے اس کے ساتھ اندر آئے تھے۔

اسی پل بارہ کا گھنٹہ بجا۔ اس نے سائڈ ٹیبل سے اپنا موبائل اٹھایا' اس میں بھی تاریخ تبدیل ہوچکی تھی۔ 23 اکتوبر۔ رامین کے دل کی دھڑکن تھم سی گئی۔ کئی منزلوں کے تھکے ہوئے مسافر کی طرح وہ بستر کا سہارا لے کر نیچے بیٹھتی چلی گئی اور بہت دیر سے رکی ہوئی سانس کو ایک آہ کے ساتھ سینے سے خارج کیا۔

وہ یہ دن بھول سکتی تھی؟ نہیں... کبھی بھی نہیں...! یہ سچ تھا کہ بیتے ہوئے سالوں میں اس نے اس دن کبھی اسے یاد نہیں کیا تھا' مگر یہ بھی سچ تھا کہ وہ اسے کبھی بھول نہیں پائی تھی۔ 23 اکتوبر ہمیشہ سے بہت خاص دن ہوا کرتا تھا۔ اس دن... کسی بھی لمحے اچانک مہرز کا خیال ایسے آتا تھا' جیسے دھند میں چلتے ہوئے اچانک روشنی دکھائی دے اور ہر منظر واضح کردے۔

اس رات وہ کتاب پڑھنے کے بجائے اپنے اسکول کے دنوں کے بارے میں سوچتی ہوئی نیند کی وادیوں میں اتر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

صبح اٹھ کر اس نے ڈارک چاکلیٹ براؤن کیک بنایا۔ اس کی اچھی سی ڈریسنگ کی۔ بھنے ہوئے بادام کے ساتھ سجاوٹ کرنے کے بعد میز پر رکھ دیا۔ خالہ کی عادت تھی۔ وہ اکثر کچھ نہ کچھ بنا کر پڑوسیوں کو بھجوایا کرتی تھیں' اب بھی انہوں نے ایسا ہی کیا۔ دو کوارٹر پلیٹس میں الگ الگ کیک کے پیس کاٹ کر رکھے اور رامین سے کہا۔

"ہمارے ساتھ دائیں والے گھر میں جیری کو یہ پلیٹ اور گرین ٹی کا تھرماس دے دینا' کہنا آپ کے رز ماسٹر کے لیے ہے اور بائیں والے گھر میں مسز ہلی کو خود پکڑا کر آنا' اوکے..." اسے اچھی طرح سمجھا کر انہوں نے دروازہ کھول کر اسے باہر بھیجا تھا۔ جیسے انہوں نے کہا تھا اس نے ویسا ہی کیا اور گھر واپس آگئی۔

لنچ کے بعد اس نے اپنے لیے ایک پیس پلیٹ میں ڈالا اور ماچس اٹھا کر کمرے کے اندر آگئی۔ دروازہ لاک کرنے کے بعد اس نے کیک کی پلیٹ ٹیبل پر رکھی اور زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ماچس کی ڈبیا سے ایک تیلی نکال کر اس کیک کے بیچ میں موم بتی کی طرح سیدھی کھڑی کردی۔ پھر دوسری تیلی سلگا کر کیک پر لگی تیلی کو آگ دکھائی اور زیر لب گنگنانے لگی' ہیپی برتھ ڈے ٹو یو گاتے ہوئے اس نے خود ہی تیلی کو پھونک مار کر بجھا دیا اور تالیاں بجاتے ہوئے زیر لب مسکرا کر مہرز کو وش کیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ سرگوشی کبھی اس کی سماعتوں تک نہیں پہنچ پائے گی۔

شام کو شاور لے کر باہر آئی تو مہ جبیں اس کے کمرے میں آگئیں ۔ تولیے سے اپنے بال پونچھتے ہوئے وہ ان سے ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتی جارہی تھی۔ مہ جبیں اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ یہاں آنے کے بعد اس میں کافی تبدیلی آئی تھی۔ حرا نے اس پر بہت محنت کی تھی جو صاف نظر آرہی تھی۔ ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ ہمیشہ کے لیے اسے اپنے پاس رکھ لیتیں۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے نے تو ایک امریکن لڑکی سے شادی کرلی تھی اور ایک بیٹے کا باپ بھی بن گیا تھا جبکہ دوسرا بیٹا آج کل کسی فلسطینی لڑکی میں دلچسپی لے رہا تھا۔ ورنہ رامین انہیں اتنی پیاری لگی تھی کہ اسے اپنی بہو بنانے میں وہ ایک منٹ نہ لگاتیں' لیکن اس وقت انہیں اس سے ایک شکایت تھی جس کا اظہار کرنے وہ اس کے پاس آئی تھیں۔

"تم اگلے ویک اینڈ میرے پاس نہیں آرہیں نا۔"

رامین نے سر پر تولیہ لپیٹ کر ان کے چہرے کو دیکھا جس پر پیار بھری خفگی نظر آرہی تھی' وہ ان کے پاس چل کر آئی اور ان کے گھٹنوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر زمین پر ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

"سوری خالہ... مجھے سان فرانسسکو جانا ہے۔ ساری بکنگ ہوچکی ہے اب اگر میں نہ گئی تو لیلیٰ مجھ سے زندگی بھر بات نہیں کرے گی۔

آپ بھی میرے ساتھ چلیں نا۔ بھائی بھابھی تو جا نہیں رہے ہیں۔ آپ چلیں گی تو مجھے بھی بہت مزا آئے گا... چلیے نا..."

رامین کے اصرار پر انہوں نے بے بسی سے گردن نفی میں ہلاتے ہوئے اس سے کہا۔ "بہت مشکل ہے بیٹا... یونیورسٹی میں فائنل سمسٹر چل رہے ہیں۔ میرا جانا بہت مشکل ہے۔"

"میری تو مجبوری ہے مگر شاہ زیب اور حرا کو تو تمہارے ساتھ جانا چاہیے ۔ وہ دونوں کیوں نہیں

جارہے؟"

"پہلے وہ بھی چل رہے تھے۔" رامین انہیں تفصیل بتانے لگی۔ "لیکن پھر حرا بھابھی کی امی آگئیں آنٹی کے گھٹنوں میں درد رہتا ہے۔ وہ اتنے گھنٹے تک گاڑی میں سفر نہیں کرسکتیں۔ اس لیے بھائی بھابھی نے اپنا جانا کینسل کردیا۔ اب صرف میں جارہی ہوں۔"

"اچھا یہ بتاؤ۔ تمہاری آنکھ کا کیا حال ہے؟" انہوں نے ایک ہاتھ سے اس کا گال سہلاتے ہوئے پوچھا۔ رامین زمین سے اٹھ کر ان کے پاس بستر پر بیٹھ گئی۔ "پہلے سے کافی بہتر ہے۔ آہستہ آہستہ ہی بہتر ویژن ہوگا۔"

"تمہیں ڈرائیونگ میں پرابلم تو نہیں ہوتی؟" ان کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

"ارے نہیں خالہ! بہت مزا آتا ہے۔ اپنی پرنسز کو لے کر اس کے ساتھ شاپنگ کرتی ہوں' گروسری خریدتی ہوں اور ڈزنی لینڈ کا تو پاس بنوالیا ہے۔ تقریباً ہر روز وہیں پہنچی ہوتی ہوں۔"

"ہاں نیلوفر بہت الیچ ہوگئی ہے تم سے۔"

"جی بہت زیادہ۔"

"بھابھی مجھ سے کہتی ہیں تم نے ہماری بیٹی کو بگاڑ کے رکھ دیا ہے۔ ہر وقت اچھو اچھو کرتی رہتی ہے۔ ہمیں تو کسی خاطر میں نہیں لاتی۔" رامین ہنستے ہنستے انہیں ساری بات بتارہی تھی۔ مہ جبیں بھی مسکرا کر بولیں۔

"حرا بھی بہت اچھی لڑکی ہے۔ شاہ زیب نے پسند کی شادی کی تھی نا؟"

"جی لو میرج ہے دونوں کی۔" رامین نے ٹھہر ٹھہر کر ان کی بات کی تصدیق کی۔ "ویسے خالہ۔ ان دونوں کا آپس میں پیار اور سلوک دیکھ کر مجھے احساس ہوا ہے کہ شادی شدہ زندگی ایسی مشکل بھی نہیں بس اس کی کامیابی کا انحصار دونوں فریقین کے احساس ذمہ داری پر ہوتا ہے۔ ورنہ میں سمجھتی تھی کہ لو میرج کا حشر میرے والدین کی طرح ہوتا ہے۔"

مہ جبیں نے چونک کر اسے دیکھا' تو کیا یہی وجہ تھی کہ رامین مسلسل شادی سے انکار کررہی ہے؟ وہ اسے سمجھانے کی غرض سے بولیں۔

"نہیں رامین! تم غلط سمجھتی تھیں اور شکر ہے کہ اپنے اس نظریے کی تصحیح تم نے خود ہی کرلی۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ ہمارے والدین کی بھی آپس میں نہیں بنتی تھی حالانکہ وہ سراسر ارینجڈ میرج تھی۔"

"لیکن مجھے حیرت ہوتی ہے خالہ۔ کہ اگر میرے ماما پاپا کو ایک دوسرے سے محبت تھی تو وہ ایک ساتھ خوش کیوں نہیں رہ سکے۔ یہ رشتہ کیا اتنا کچا ہوتا ہے کہ غلط فہمی یا چند ناپسندیدہ عادات کو بنیاد بنا کر اسے توڑا جاسکے۔"

مہ جبیں' رامین کو الجھتے دیکھ کر سنجیدگی سے اس کی بات سن رہی تھیں۔ اس کے خاموش ہوتے ہی انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں رامین۔ محبت کا رشتہ ایسا کچا بھی نہیں ہوتا کہ اتنی آسانی سے توڑ لیا جائے' اسی لیے تو عبید نازنین کو طلاق نہیں دے سکا۔ اس نے تمہاری ماں سے محبت کی تھی۔"

"نہیں خالہ۔ میں نہیں مانتی۔" اسے ان کی بات سے ہرگز اتفاق نہیں تھا۔ "آپ نہیں جانتیں' پاپا ماما کو کس بری طرح زدوکوب کیا کرتے تھے۔ یہ محبت نہیں ہوسکتی۔"

"غصے کا جذبہ بے حد طاقت ور ہوتا ہے بیٹا۔ یہ انسان کو انسان نہیں رہنے دیتا۔ اسی لیے تو حرام ہے۔ اس کے باوجود تم سوچو تو سہی کہ عبید نے نازنین کو وہ تین لفظ کبھی نہیں کہے۔ جن کی دھمکی ہر مرد اپنی بیوی کو دیتا ہے۔ میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ کم از کم عبید کی حد تک یہ شادی محبت کی تھی۔ لیکن نازنین کے بارے میں مجھے یقین نہیں ہے کہ وہ عبید سے محبت کرتی تھی۔"

اور یقین رامین کو بھی نہیں تھا لیکن جو حق عبید کے پاس موجود تھا وہ نازنین کے پاس بھی تھا۔ اگر عبید کے نازنین سے علیحدہ نہ ہونے کی خواہش محبت سمجھا جارہا

ہے تو کیا یہی چیز ناز کو عبید سے الگ ہونے سے نہیں روک رہی تھی؟ مہ جبیں نے جیسے رامین کی سوچ کو پڑھ لیا۔

"اس کے پاس عبید کے علاوہ ایسا کوئی نہیں تھا' جو اسے سہارا دے سکتا۔ ہم بھائی بہنوں سے اس کی بنتی نہیں تھی' وہ اپنے سسرال والوں سے بھی بہت پریشان تھی۔" مہ جبین نے اندازہ لگایا تھا اور رامین نے فوراً ہی اس خیال کی تردید کردی تھی۔

"میں نے کبھی اپنے ددھیال والوں کو بلا تکلف ہمارے گھر آتے جاتے نہیں دیکھا۔ ایک دوبار تایا جان پاپا کے بہت بلانے پر آئے تھے ورنہ اور کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ماما کا روکھا رویہ برداشت کرسکے۔ ہم لوگ بھی انتہائی اہم مواقع پر دادی کے گھر جاتے اور وہاں جاکر بھی مجھے کسی سے بات کرنے یا کھیلنے کی اجازت نہیں تھی' ماما گھر سے ہی سمجھا کرلے کر جایا کرتی تھیں کہ میرے پاس سے ہلنا مت۔۔۔ اور اپنے گھر میں ماما ہر طرح سے آزاد تھیں۔ اس لیے میرا نہیں خیال کہ وہ سسرال والوں سے تنگ ہوکر یہاں آنے کا سوچ رہی تھیں۔"

"تو پھر۔۔۔ اور کیا وجہ ہوسکتی ہے؟" مہ جبیں نے پُرسوچ انداز میں کہا اور رامین تلخی سے مسکرادی۔

"آپ اور تابندہ خالہ تھیں اس کی وجہ۔۔۔" مہ جبیں نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"میں نے ماما کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا خالہ۔۔۔ امریکا سے واپس آنے کے بعد وہ پاپا سے آپ دونوں کا نام لے کر جھگڑا کیا کرتی تھیں۔ وقار خالو اور آپ کا جوائنٹ اکاؤنٹ تھا شاید۔۔۔ اور تابندہ خالہ بھی اپنے گھر کے تمام فیصلے خود کرتی ہیں۔۔۔ حیدر خالو ان کے آگے پیچھے پھرتے ہیں' میں نے ہمیشہ ماما کو اپنی لائف کا آپ لوگوں سے موازنہ کرتے دیکھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ماما آپ دونوں جیسا بننا چاہتی تھیں' بہت آئیڈیلائز کرتی تھیں وہ آپ دونوں کو۔۔۔"

مہ جبیں تاسف سے مسکرا دیں' لیکن کہا کچھ نہیں۔۔۔ وہ اپنی مری ہوئی بہن کی بیٹی سے یہ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ تمہاری ماں مادہ پرست تھی۔ صرف ظاہر کو دیکھتی تھی۔ چیزوں کی گہرائی اور اصلیت پر اس نے کبھی توجہ ہی نہیں دی تھی۔

"یہاں امریکا میں میاں بیوی کا جوائنٹ اکاؤنٹ ہونا "مجبوری" ہوتا ہے۔ شوہر آفس میں سارا دن گزارتا ہے اور بیوی کے لیے ڈرائیونگ سیکھنا' گھر کے اندر باہر کے سارے کام دیکھنا' بچوں کو اسکول لے جانا اور واپس لانا' گروسری کا سامان خریدنا' بلز جمع کروانا۔۔۔ "مجبوری" ہوتا ہے۔ یہ سب وہ اپنی خوشی سے نہیں کرتی' جس مجبوری کو ناز اپنی بہنوں کی آزادی سمجھ کر جیلس ہورہی تھی' خود ان سے کہیں بہتر حال میں زندگی بسر کررہی تھی۔

تابندہ کے شوہر حیدر کا اپنی بیوی کے آگے پیچھے پھرنا تو ناز کو نظر آگیا مگر وہ یہ نہیں جانتی کہ دس سال تک تابندہ نے کیا کیا سہا تھا' سگریٹ' شراب اور گرل فرینڈز کی لمبی قطار' تابندہ کو منہ دکھائی میں اپنے شوہر کی بد خصلتیں تحفتاً ملی تھیں۔

بہت کچھ سہا تھا تابندہ نے۔۔۔ پھر بھی مستقل مزاجی اور ثابت قدمی سے اپنے شوہر کو سدھارنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ اس نے صبر سے وہ انتہائی سخت وقت گزار لیا تھا جس کے بعد حیدر ایک بے دام کے غلام کی طرح اس کے قدموں میں آبیٹھا۔ ناز نے بہن کی مشکل نہیں دیکھی تھی۔ اس کو ملنے والا "اجر" اسے نظر آگیا تھا۔ صبر کا پھل تو اسی کو ملتا ہے جو "صبر" کرے۔ جو اپنی ذرا سی تکلیف پر واویلا شروع کردے اسے "صبر و شکر" کی نعمت نہیں ملتی۔ نہ ہی اجر کی دولت اس کا نصیب بنتی ہے' ناشکری کے عدسے الٹے ہوتے ہیں' ہر بڑی شے کو چھوٹا کرکے دکھاتے ہیں۔ ہر نعمت چھوٹی لگتی ہے۔

☆ ☆ ☆

روانگی سے ایک رات قبل ہی تابندہ خالہ اور ان کی فیملی شاہ زیب کے گھر آگئی۔ گھر میں یکایک ہی رونق اور چہل پہل بڑھ گئی تھی۔ لیلیٰ' رامین کے ساتھ پیکنگ کروا رہی تھی۔ وہ اپنے ساتھ کچھ کپڑے بھی لائی تھی' جو اس نے سیدھے اس کے سوٹ کیس میں ڈال دیے تھے۔

"اف بس کرو لیلیٰ! میں کیا کروں گی اتنے کپڑوں کا۔ تین چار دن کی تو بات ہے۔ بس تین جوڑے کافی ہیں۔ باقی واپس رکھ دو۔" رامین نے اوپر رکھے ہوئے دو تین ایمبرائڈڈ سوٹ اٹھا کر بیڈ پر رکھ دیے جنہیں لیلیٰ نے زور سے گردن ہلاتے ہوئے واپس سوٹ کیس میں رکھا۔

"تم سمجھ کیوں نہیں رہیں۔ دو سوٹ تو سفر کرنے میں ہی مسک جائیں گے۔ آنے اور جانے کا دن۔ باقی وہاں دریا کنارے اگر کپڑے بھیگ گئے تو چینج کرنے کے لیے جوڑے تو ہونے چاہئیں۔" وہ چڑ گئی تھی۔

"دریا میں نہانا نہیں ہے مجھے۔ جو کپڑے بھیگ جائیں گے۔ میرے سوٹ کیس میں جگہ نہیں ہے۔ نکالو انہیں۔۔۔ کیمرہ رکھنا ہے مجھے۔۔۔" رامین اب تھوڑی خفا ہوکر کہہ رہی تھی' لیکن لیلیٰ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔

"تم سوٹ کیس ذرا میڈیم سائز کا لے لو لیکن کپڑے کم نہیں ہوں گے۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

یہ کہتے ہی لیلیٰ اس کا جواب سنے بغیر ہی حرا سے دوسرا بیگ لینے کے لیے چلی گئی۔ رامین شکست خوردہ انداز میں ہاتھ میں پکڑا دوپٹا ایک طرف پھینک کر بستر پر بیٹھ گئی۔ اسے جھنجلاہٹ ہورہی تھی' پتا نہیں کیوں؟ اس نے ایک نظر اپنے کپڑوں سے بھرے سوٹ کیس کی طرف دیکھا' نہ چاہ کر بھی اسے وہ وقت یاد آیا جب اسے کپڑوں کی ضرورت ہوتی تھی اور اسے نہیں ملتے تھے۔ وہ ضرورتیں جو پوری ہونے کے لیے اس قدر انتظار کرنا پڑتا تھا کہ وہ ضرورت ہی ختم ہوجاتی تھی۔ آج بن چاہے بن مانگے اس کے ارد گرد آسائشوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس کی ڈریسنگ ٹیبل پر پرفیومز کی بھرمار تھی جن میں سے ایک بھی اس نے خود اپنے لیے نہیں خریدا تھا' الماری میں کپڑوں اور ہینڈ بیگ کی بہتات تھی۔ وہ بھی حرا کی محبت۔۔۔ خالاؤں کے تحفے۔۔۔ بھائی کا دلار۔۔۔ اس نے اپنے کانوں کی لوؤں کو دونوں ہاتھوں سے چھو کر اطمینان کیا' شاہ زیب کے گفٹ۔۔۔ ڈائمنڈ سٹڈز۔۔۔ شکر ہے موجود تھے ——— اپنی ماں کو ہمیشہ نئے کپڑوں' زیورات کی شاپنگ میں ہلکان ہوتا دیکھ کر وہ اس قدر اوب چکی تھی کہ اسے ان قیمتی چیزوں میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔

اپنی ماں کو ہیرے سونے کے ڈھیر پر بیٹھ کر روتے دیکھا تھا اس نے۔ یہ خزانے اسے خوش نہیں رکھ پائے تھے۔

ان سب نعمتوں کی اس نے خواہش کی ہو یا نہ کی ہو ۔۔۔ بہرحال اسے وہ مل رہا تھا' جو اس کے نصیب میں تھا۔ شکر کرنا بھی واجب تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر احساس تشکر سے نم ہوتی آنکھوں کو بند کرکے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور اللہ سے کہا۔ "تھینک یو۔۔۔ تھینک یو سوچ فار ایوری تھنگ۔"

"یور ویلکم۔۔۔" کمرے میں داخل ہوتی لیلیٰ نے رامین کا فقرہ سن کر جواب دیا تھا۔ رامین نے اس کی آواز سن کر آنکھیں کھولیں اور پھر۔۔۔ اسے ہنسی آگئی۔

"شکر ہے۔۔۔ موڈ ٹھیک ہوگیا۔" اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو وہ بھی شرمندہ ہوگئی۔

"سوری یار میں نے خوامخواہ تمہیں ڈانٹ دیا۔"

۔۔۔ لیلیٰ ۔۔۔ مسکرا کر تمام کپڑے بیگ میں سلیقے سے رکھنے لگی۔ "ویسے تم نے اچھا کیا یہ ہیر کٹ بہت سوٹ کررہا ہے تم پر' یو آر لکنگ سو پریٹی۔" کپڑے تہہ کرکے رکھتے ہوئے اس نے رامین کو ایک نظر دیکھ کر اس کے نئے ہیر کٹ پر تبصرہ کیا تھا جس کے جواب میں رامین نے مدھم آواز میں صرف تھینکس کہا۔

——— لیلیٰ نے ایک پرفیوم اٹھا کر کپڑوں کی تہہ پر رکھنے کے بعد اس کی دو کتابیں بھی سوٹ کیس میں رکھیں اور اسے بند کردیا۔

"کیمرا ہینڈ بیگ میں رکھ لیتی ہوں۔۔۔ اس بڑے سے ہینڈ بیگ کا کچھ تو فائدہ ہو۔۔۔"

لیلیٰ کے پاس سوائے اس کی بات مان لینے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

Merced River کے کنارے سے ذرا فاصلے پر موجود ڈھلان کے آخری سرے پر پڑاؤ ڈالا گیا۔ سب آپس میں اچھی طرح گھلنے ملنے لگے۔

وہ کچھ دیر بے مقصد کھڑی رہی پھر سب سے الگ ہو کر ذرا دور تنہائی میں جا کر بیٹھ گئی۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر اس نے اپنا چہرہ بازوؤں پر ٹکا لیا اور دل سے اس منظر کو پوری جزئیات کے ساتھ دیکھنے اور محسوس کرنے لگی۔ شرڑ شرڑ کی مسلسل آواز پیدا کرتے دریا کا شور‘ اس کا راستہ روکتے چھوٹے بڑے پتھر‘ دریا کے دوسرے کنارے پر جا بجا اونچے درختوں کی قطاریں۔۔۔ اور تیز رفتار مرسڈیز۔

کچھ دور لڑکے لڑکیاں دوڑتے بھاگتے ڈھلان سے اتر کر دریا کے کنارے آ کر کھڑے ہو گئے اور مرسڈ کے تیز بہاؤ کی مخالف سمت میں تیرتی ٹراؤٹ مچھلیوں کو دلچسپی سے دیکھنے لگے۔

فرقان نے ایک بچے کی دیکھا دیکھی اپنی ٹی شرٹ اتاری اور دریا کے بیچ میں کھڑا ہو کر اپنی ٹی شرٹ کی جھولی بنا کر ٹراؤٹ پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

سمندر کے کنارے سی گل یہاں سے وہاں اڑتے ہوئے پل کے اوپر بھی پرواز کر رہے تھے۔ لیلیٰ نے ہاتھ پھیلا کر اپنے سر پر اڑتے پرندے کی نقالی میں یہاں سے وہاں بھاگنا شروع کر دیا۔ رامین اس کی شرارتیں دیکھ کر ہمیشہ کی طرح اپنی ہنسی پر قابو نہیں رکھ پائی۔

ایک بھرپور ہنسی ہنس کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔۔۔ ماضی کے تمام دریچے ایک کے بعد ایک کھلتے گئے۔ ان پرانی یادوں میں وہ ایک چہرہ بھی سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

اب وہ اکثر دن کے مختلف حصوں میں کبھی نہ کبھی اسے یاد آ ہی جاتا تھا۔ یہ دوستی اس نے اپنی مرضی سے نہیں توڑی تھی۔۔۔ پاپا کا حکم تھا‘ اس نے مان لیا۔ لیکن آج اپنی مرضی سے۔۔۔ اسی دوستی کو یاد کرتے ہوئے ڈھونڈنے کے باوجود اسے کوئی قابل گرفت بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ کیا پاپا کو اس کا مہرز اور حسن کے ساتھ بیٹھنا برا لگا تھا۔۔۔

اس دن وہ روتی ہوئی گھر میں واپس آئی تھی تو ماما نے حیران ہو کر اسے دیکھا تھا‘ پھر عبید سے سوال کیا۔ ”کیا ہوا ہے؟“

عبید کا پارہ گھر پہنچنے تک قدرے نیچے آ گیا تھا۔

”کچھ خاص نہیں۔۔۔ بس میں نے اسے منع کر دیا ہے کہ آئندہ یہ کسی لڑکے سے نہ بات کرے گی۔“

”مکافات عمل سے ڈرتے ہیں؟“

”اس بکواس کا مطلب؟ شاہ زیب اور رامین دونوں ایک ہی اسکول میں رہیں گے۔۔۔ میں دونوں کو الگ الگ پک نہیں کر سکتا۔۔۔“

”تو ڈرائیور سے بلوا لیجیے گا۔۔۔“ ناز مزے سے کہتی لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”میں اپنی بچی کو کسی کے بھروسے نہیں چھوڑ سکتا۔۔۔ تم میری بات کا جواب دو پہلے۔۔۔ مکافات عمل سے کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔ ایسا کون سا گناہ کیا ہے میں نے۔۔۔ جو میری بیٹی کے آگے آئے گا؟“ جواباً ناز ناگن کی طرح پھنکاری۔

”مجھے بہکایا آپ نے۔۔۔ جھوٹے وعدے کیے محبت کے‘ خواب دکھائے۔۔۔ اپنے جال میں پھنسایا۔۔۔ میری خواہش کو پورا کرنے کا دعویٰ کیا۔۔۔ میں نادان تھی کم عمر تھی آپ کی باتوں میں آ گئی۔۔۔ اسی لیے آپ خوفزدہ ہیں کہ آپ کی بچی کے آگے بھی یہی آئے گا۔۔۔ جس طرح آپ نے میری زندگی برباد کی۔۔۔ آپ کی بیٹی کی بھی ہو گی۔۔۔“

”میں نے۔۔۔ میں نے تمہاری زندگی برباد کی ہے اس پرانے بوسیدہ مکان سے اٹھا کر لایا ہوں تمہیں بیاہ کر تمہیں سر آنکھوں پر بٹھایا‘ ہر خواہش پوری کی میں نے تمہاری۔۔۔ اور تم کہتی ہو میں نے تمہاری زندگی برباد کر دی؟“

رامین چھپ کر والدین کا جھگڑا سن رہی تھی۔ اسے تجسس تھا یہ جاننے کا کہ پاپا نے آخر اسے منع کیوں کیا تھا مگر اس دھواں دار جھگڑے کو سن کر بھی وہ کوئی نتیجہ نکال نہیں پائی۔

”زندگی تو میری برباد ہوئی تم جیسی ناشکری عورت سے شادی کی میں نے۔۔۔ جس حسین چہرے کی محبت میں مبتلا ہو کر میں نے اپنی ماں کا دل دکھایا آج اس پر تھوکنے کو جی چاہتا ہے۔“ انہوں نے ناز کو بازوؤں سے پکڑ کر سختی سے جھنجھوڑ ڈالا ”اور تم۔۔۔ میری اور میری بیٹی کی فکر مت کرو۔۔۔ جو گناہ میں نے کیا اس کی سزا تم ہو اور تمہیں میں ساری عمر بھگتوں گا۔ رہا سوال میری بیٹی کا۔۔۔ تو کان کھول کر سن لو۔۔۔ وہ تمہاری طرح ”بدکردار“ نہیں ہے۔ وہ میری بیٹی ہے اور کبھی میرا سر جھکنے نہیں دے گی۔۔۔“

بدکردار کا خطاب پا کر نازنین کچھ بھی بولنے کے قابل نہیں رہی تھی اور رامین۔۔۔ اس کے لیے تو پاپا کا ایک ہی جملہ کافی تھا‘ جس نے زندگی کے ہر موڑ پر اپنی بازگشت سنائی تھی۔

”رامین میری بیٹی ہے اور وہ کبھی میرا سر جھکنے نہیں دے گی۔“

اس کے بعد اس نے ہر اس کام سے اجتناب کیا تھا جس میں پاپا کی ذرا سی بھی خفگی کا امکان تھا۔ اس کا دوست چھن گیا اور وہ جبراً خود کو محصور رکھنے لگی۔ وہ دوست جس کے ساتھ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز اس نے شیئر کی تھی‘ اپنے دل کی ہر بات‘ ہر نیا تجربہ پہلے اس کے گوش گزار کیا تھا۔ اس رشتے کی ڈور کاٹتے ہوئے اس کے اپنے ہاتھ لہولہان ہو گئے تھے اور آج تک ان ہاتھوں میں خون کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔

رامین نے آنکھیں کھول کر چہرے پر پھیلے پانی کو آستین سے پونچھا اور بے خیالی میں اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے جیسے لہو کی غیر موجودگی کا اطمینان کرنے لگی۔

اس کا مہرز سے ملنے کا دل چاہنے لگا۔ جانے کیوں وہ یہ خواہش کر رہی تھی۔ اسے افسوس تھا دوستی ٹوٹ جانے کا۔۔۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ افسوس تو اس زیادتی پر تھا‘ جو اس نے مہرز کے ساتھ کی تھی۔ کاش ہم دوبارہ مل سکیں۔۔۔ ویسے ہی مل بیٹھیں‘ میں اسے سب کچھ بتاؤں جو مجھ پر گزری ان تمام سالوں میں۔۔۔ میں اس سے پوچھوں۔۔۔ وہ کہاں رہا؟ میں اس سے اپنے کیے کی معافی مانگوں اور وہ مجھے معاف کر دے۔۔۔ ایک لمحہ مکمل ہونے سے پہلے ہی۔۔۔ جیسے ہمیشہ وہ میری خطائیں معاف کرتا آیا تھا۔ ”کاش۔۔۔!“

وہ پوری سچائی کے ساتھ اپنے رب سے دعا مانگ رہی تھی۔

”یہاں کیوں بیٹھی ہو۔۔۔ چلو دریا کا پانی اتنا ٹھنڈا ہے‘ پیر ڈال کے بیٹھتے ہیں۔۔۔“ لیلیٰ نے زبردستی اس کا بازو پکڑ کر اسے کھڑا کیا۔ ڈھلان سے اتر کر دونوں دریا کے کنارے بیٹھ کر پانی میں ہاتھ ڈال کر اس کی ٹھنڈک کے مزے لینے لگیں۔

”دیکھو! مجھ پر پانی مت پھینکنا۔۔۔“ رامین نے پہلے ہی لیلیٰ کو وارننگ دے دی۔ لیلیٰ مسکرائی۔

”ابھی تک تو مجھے اس کا خیال نہیں آیا تھا۔۔۔ لیکن آئیڈیا برا نہیں ہے۔“ اور اس سے پہلے کہ رامین سمجھ پاتی‘ لیلیٰ نے ایک ہاتھ سے چلو بھر پانی اس پر اچھال دیا۔ چہرے پر پانی پڑتے ہی رامین بدک کر پیچھے ہٹی۔

”اف۔۔۔ کیا کر رہی ہو لیلیٰ؟“ اس کی آنکھ میں پانی چلا گیا تھا اور انگلیوں سے آنکھ رگڑتے ہوئے لیلیٰ کو اس سرگرمی سے باز رکھنے کی پوری کوشش بھی کر رہی تھی۔ چند ایک حملوں کے بعد بالآخر لیلیٰ خود ہی رک گئی۔

”ریور کراس کریں؟“ لیلیٰ کے ایسے سوال‘ محض سوال نہیں ہوتے تھے۔ اس بات کا اعلان ہوا کرتے تھے کہ وہ یہ کام تو ضرور کرے گی۔

رامین کا دل چاہا سر پیٹ لے‘ ایک اور فضول آئیڈیا۔ لیکن اسی وقت ان کے پیچھے سے ان کے گروپ میں شامل کچھ لڑکے لڑکیاں بھاگتے ہوئے ڈھلان سے اترے اور دریا کے کنارے آ کر کھڑے ہو گئے۔ رامین کے ساتھ لیلیٰ بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب سیدھے ایک لائن میں کھڑے ہوئے اور گیٹ سیٹ گو کہتے ہی بھاگ

کھڑے ہوئے۔

رامین ان سب کو آگے پیچھے دوڑتے بھاگتے دیکھنے لگی۔۔۔۔۔ بیچ دریا میں ایک لڑکی کا پیر مڑ گیا اور توازن خراب ہوتے ہی وہ غڑاپ پانی کے اندر گر پڑی۔ رامین نے بے اختیار ہنستے ہوئے لیلیٰ کو دیکھا' وہ بھی اسی لڑکی کی طرف۔ دیکھ رہی تھی' جسے اس کا دوست ہنستے ہوئے سہارا دے کر اٹھا رہا تھا۔ خلاف توقع لیلیٰ اس منظر کو دیکھ کر مسکرا نہیں پائی تھی۔

رامین نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا' پھر اس سنہری بالوں والی امریکن لڑکی کی طرف۔ جس نے دریا میں گرنے کے بعد بھیگ کر اب اپنے دوستوں پر پانی اچھالنا شروع کر دیا تھا اس کا خاص ہدف وہی نوجوان تھا' جو پہلے پانی سے باہر آنے میں اس کی مدد کر رہا تھا۔ وہ لڑکی بے تکلفی سے اس پر پانی اچھالتی ہنستی ہوئی اس کی کمر سے لپٹ گئی تھی۔

"ٹریکسی کو تو بہانہ چاہیے رضا سے لپٹنے کا۔۔۔۔" لیلیٰ کا تبصرہ سن کر رامین نے حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔ لیلیٰ جیسی لڑکی کے منہ سے پہلی بار وہ کوئی طنزیہ جملہ سن رہی تھی۔ اس نے پھر سے دریا سے واپس آتے اس نوجوان اور لڑکی کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

"رضا۔۔۔۔ ہاں یہی نام تو تھا نرگس آنٹی کے بیٹے کا۔ اسے یاد آگیا۔ ایک بار وہ عید ملن پارٹی اٹینڈ کرنے ان کے گھر گئی تھی۔ لیکن اس کا نام یاد نہیں رکھ پائی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں کنارے پر اترتے' لیلیٰ نے رامین کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"چلیں۔۔۔۔ اوپر ہام کے ساتھ چل کر بیٹھتے ہیں۔" لیلیٰ یہ کہتے ہی مڑ کر چڑھائی چڑھنے لگی۔

رامین نے ناسمجھی کے عالم میں پہلے لیلیٰ اور پھر رضا کی طرف دیکھا۔ رضا نے بھی شاید لیلیٰ کا یکدم پلٹ کر واپس جانا نوٹس کیا تھا۔ وہ ٹریکسی کا ہاتھ پکڑ کر کنارے تک آنے میں اس کی مدد تو کر رہا تھا لیکن اس کی نظریں لیلیٰ پر تھیں' جو پیٹھ موڑے سیدھی اوپر چڑھتی جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

جس وقت وہ لوگ اپنے کیبن تک پہنچے اندھیرا پھیل چکا تھا' رامین نے گاڑی سے اتر کر اپنے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر خود کو ذرا سا اونچا کیا اور دلچسپی سے کیبن کے آس پاس دیکھنے لگی۔ کچھ ہی فاصلے پر دوسرے کیبنز بھی دکھائی دے رہے تھے۔ مرسڈ کا پانی پرسکون جھیل کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔

اس کا سامان کیبن میں پہنچ گیا وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی تو دیکھا کیبن کے باہر بڑے سے ڈیک پر کچھ فرنیچر کے ساتھ باربی کیو گرل اور پکنک ٹیبل بھی موجود تھی۔ کیبن بھی بے حد کشادہ آرام دہ تھا۔ وہ مزے سے اپنے سویٹر کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ادھر ادھر گھومنے لگی۔

فرقان اس کے پاس کچھ کہتا ہوا آیا۔۔۔۔ وہ اپنے خیالات میں مگن تھی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"سوری میں نے سنا نہیں۔۔۔۔ کیا کہا تم نے؟" اور جواباً" فرقان غصے میں چلاتے ہوئے بولا تھا۔

"اس کی رضا سے لڑائی ہوئی اور اب وہ بچوں کی طرح باتھ روم میں بند ہو کر رو رہی ہے۔۔۔۔"

"لیلیٰ رو رہی ہے؟" رامین کو یقین نہیں آیا۔

جب اس نے رضا سے ٹریکسی کو اس کی حد میں رکھنے کا مطالبہ کیا تھا۔ وہ ایک بے ضرر سی' نہایت حسین مگر جلد بے تکلف ہو جانے والی لڑکی تھی اور دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی اس کے ساتھ کام کرتی تھی اور رضا نے خود دعوت دے کر اسے یہاں بلایا تھا۔ لیلیٰ کا یوں شک کرنا اسے اپنی تذلیل ـــ محسوس ہوا اور اس نے فوراً" لیلیٰ کو ڈانٹ دیا۔

اپنے ترش رویے کی بدصورتی کا اسے بعد میں احساس ہوا تو اس کی تلافی کرنے کی غرض سے وہ لیلیٰ کی پسندیدہ چاکلیٹس لے کر آیا تھا۔

★ ★ ★

شاہ زیب رات کو تھکا ہارا گھر میں داخل ہوا۔ حرا اس کے لیے کھانا گرم کرنے کے لیے کچن میں آگئی۔ کام کے دوران وہ شاہ زیب کے بارے میں

سوچتی رہی۔ کتنا بدل گیا تھا وہ۔ بیٹی کی پیدائش کے بعد تو اس کا غصیلا مزاج جیسے جادو کی چھڑی سے غائب کر دیا گیا تھا اور ایسا کیوں ہوا تھا؟ وہ شاہ سے پوچھے بغیر رہ نہ سکی تھی اور شاہ زیب بھی اس سے کچھ چھپا نہیں سکا تھا۔

اپنا ماضی' اپنی محرومیاں۔۔۔ ماں' باپ کے جھگڑے ذہنی انتشار اس نے اپنا دل جیسے اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔ جن حالات سے وہ گزر چکا تھا اس کا ہلکا سا سایہ بھی اپنی اولاد پر نہیں پڑنے دینا چاہتا تھا۔ اس کا سلوک بیوی کے ساتھ اچھا تھا۔ غصہ کا وہ تیز تھا۔ لیکن خیال بھی بہت رکھتا تھا۔ حرا کو اپنے فیصلے پر کبھی پچھتاوا نہیں ہوا۔ شاہ زیب ہر لحاظ سے ایک اچھا شوہر ثابت ہوا تھا۔ اچھا باپ ثابت ہوا تھا۔ اگر کوئی کمی بیشی تھی بھی تو وہ خود ہی احساس کرتا اور اسے درست کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

وہ دونوں پہلی بار فلائٹ میں ملے تھے۔ حرا اپنے امی' ابو کے ساتھ اپنے رشتہ داروں سے ملنے جا رہی تھی۔ جو سوات میں رہتے تھے۔ شاہ زیب بھی پشاور جا رہا تھا۔ فلائٹ کے دوران یا ایرپورٹ پر ان کی آپس میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

دوبارہ اس نے حرا کو مینگورہ میں دیکھا تھا۔ وہ اپنی کزن کے ساتھ شاپنگ کرنے یہاں آئی تھی۔ شاہ زیب بھی وہیں ٹھہرا تھا۔ ایک' دو دن رسمی علیک سلیک میں گزر گئے تھے۔ پھر شاہ زیب نے ایک صبح ناشتے کے دوران اسے اپنے متعلق سب کچھ بتانا شروع کیا۔ وہ تھوڑا گھبرائی۔ ان دو' تین دنوں میں اسے اندازہ تو ہو گیا تھا کہ شاہ زیب اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ لیکن وہ اس حد تک سنجیدہ تھا کہ اپنے بارے میں سب کچھ بتا کر اسے یوں اچانک پروپوز کر دے گا۔ یہ گمان اسے ہرگز نہیں تھا۔

شاہ زیب نے گھر چھوڑنے کے بعد اپنے ایک دوست کے پاس رات گزاری تھی۔ جس نے صبح عبیدالرحمان کو فون کر کے اپنے گھر بلا لیا تھا۔ عبید کے اصرار کے باوجود اس نے گھر واپس آنے سے انکار کر دیا۔ عبید اسے یوں اس کے حال پر چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے۔ بہت سوچ کر انہوں نے یہ حل نکالا کہ شاہ زیب کو اپنے دوست عباس رضوی کے پاس بھجوانے کا انتظام کروا دیا' جو نارتھ کیرولینا میں رہتا تھا۔

شاہ زیب کو پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے عباس رضوی نے اسے ایک جیولری اسٹور کھلوانے میں مدد فراہم کرنا شروع کر دی۔ اس اسٹور میں زیادہ تر ڈائمنڈ جیولری ہوتی تھی۔ پھر شاہ زیب کو ایک ایسی کمپنی کے ساتھ بزنس کرنے کا موقع ملا' جو پاکستان کے اندر سوات اور مینگورہ میں موجود کانوں میں کان کنی کی غرض سے پاکستانی حکومت کے ساتھ اگریمنٹ کر چکی تھی۔ ان کانوں سے نکلنے والے پتھروں کو خام حالت میں امریکہ لایا جاتا اور وہاں انٹرنیشنل اسٹینڈرڈ کو مد نظر رکھتے ہوئے مہارت سے تراشا جاتا تھا۔ جس کے باعث اس کی مارکیٹ ویلیو میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا۔ شاہ زیب بھی اسی سلسلے میں دو' تین بار پاکستان آ چکا تھا۔ لیکن وہ لاہور نہیں گیا تھا' نہ ہی اس نے رامین اور اپنی ماما سے رابطہ کیا تھا۔ صرف اس کے پاپا جانتے تھے کہ وہ یہاں آیا ہوا ہے۔

چند سالوں بعد اب وہ دوبارہ سوات آیا تھا اور مینگورہ میں قیام کر رہا تھا۔ اس امریکن کمپنی کی معرفت اس کی رسائی ان کانوں تک ہو گئی تھی۔ لیکن پھر ایک رکاوٹ آڑے آ گئی۔ اس کمپنی کا حکومت کے ساتھ لین دین میں کچھ جھگڑا ہو گیا اور معاملہ کورٹ تک جا پہنچا تھا۔ شاہ زیب کا کام کھٹائی میں پڑ گیا۔ ان ہی دنوں وہ حرا سے ملا' وہ اسے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ حرا اپنی فیملی کے ساتھ امریکہ میں ہی سکونت پذیر تھی اور اپنے رشتہ داروں سے ملنے پاکستان آئی تھی۔

چند ہی دنوں میں خوب صورت نیلی آنکھوں والی حرا نے شاہ زیب کا دل جیت لیا تھا۔ وہ نرم خو اور حساس طبیعت کی لڑکی تھی۔ شاہ زیب نے اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور پروپوز بھی کر دیا۔

عبیدالرحمان اس سے ملنے کے لیے آئے اور

رامین کے نکاح کی خوش خبری دیتے ہوئے اسے اس موقع پر گھر واپس چلنے کو کہا۔

شاہ زیب رامین کے نکاح کا سن کر بہت خوش ہوا اور اس نے پاپا کو حرا کے متعلق بھی بتادیا کہ وہ بھی اب شادی کرنا چاہتا ہے۔ شاہ زیب کی خواہش نے عبید کو سخت برہم کردیا تھا۔ ان کا پکا ارادہ تھا کہ رامین کی شادی کے بعد وہ اپنی بہن قدسیہ بیگم کی بیٹی کا رشتہ مانگیں گے۔ دن رات محنت سے شاہ زیب اپنے آپ کو اسٹیبلش کرچکا تھا۔ اگر عبید اس کی سرپرستی سے ہاتھ اٹھا بھی لیتے تو اسے کوئی پروا نہیں تھی۔

وہ کوئی بھی پریشر قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔

اسے ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھ کر عبید نے اسے رامین کے نکاح میں بھی شرکت کرنے سے منع کردیا۔ شاہ زیب ان کے جذباتی ہتھکنڈوں سے اس قدر دلبرداشتہ ہوا کہ اپنی ماں، بہن سے ملے بغیر ہی امریکہ واپس چلا آیا۔ صرف یہی نہیں، اس کے بعد اس نے عبید سے بھی کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں رکھا تھا۔ نارتھ کیرولینا سے اپنا کاروبار سمیٹ کر وہ کیلی فورنیا آکر اپنا ہائم میں سیٹل ہوگیا۔ یہاں اسے نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرنا پڑا۔ حالات بہتر ہونے کے بعد اس نے حرا سے شادی کرلی۔

حرا کے ماں، باپ نے شاہ زیب کے بارے میں ہر طرح سے تسلی کرنے کے بعد اپنی بیٹی اس سے بیاہی تھی۔ حرا کے والد شاہ زیب کو بہت پسند کرنے لگے تھے۔ یوں ان دونوں کی شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں آئی تھی۔ دونوں خالاؤں اور ماموں کا ان کی زندگی میں کوئی اہم رول نہیں رہا تھا۔ شاہ زیب کو ان سے ملنے کا شاید اسی لیے خیال بھی نہیں تھا۔

اسے اپنی بہن کی فکر تھی۔ وہ بھی اس کے نکاح کے بارے میں سن کر اسے تھوڑا اطمینان رہنے لگا تھا کہ جلد ہی وہ بھی اپنی زندگی میں سیٹل ہوجائے گی۔ اپنی دعاؤں میں وہ اس کے لیے دنیا بھر کی خوشیاں مانگا کرتا تھا۔ لیکن۔۔۔ کبھی کبھی صرف دعا کرنا ہی کافی نہیں ہوتا۔ اپنی ذمہ داری اور فرائض کو دعا مانگ کر ادا نہیں کیا جاتا۔ عمل سے کیا جاتا ہے۔ حقوق صرف ہمارے تو نہیں ہوتے۔ دوسروں کے بھی ہوتے ہیں اور ان حقوق کی ادائیگی کا ایک وقت ہوتا ہے۔ جس کے گزر جانے کے بعد قضا نہیں پچھتاوا اور افسوس لازم ہوجاتا ہے۔ جیسے شاہ زیب کے ساتھ ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر چلنا سکھانے والا باپ اس دنیا سے چلا گیا اور اسے خبر بھی نہ ہوئی تھی۔ اسے جنم دینے والی ماں نے بھی آخری دم تک اس کا انتظار تو کیا ہوگا۔ پر وہ پلٹ کر گیا ہی نہیں۔ وہ ان دونوں سے ناراض ہوکر گیا تھا۔ کبھی نہ واپس آنے کے لیے اور وہ دونوں اس کا انتظار کرتے کرتے اس جہان سے چلے گئے تھے۔ کبھی نہ واپس آنے کے لیے۔

وہ بہت پچھتا رہا تھا۔

بہت پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا وہ حرا کے شانوں پر سر رکھ کے۔۔۔ بہت رویا تھا۔ اسے چپ کرواتے ہوئے حرا بھی ضبط کھو بیٹھی تھی۔ بنا دیکھے، بنا جانے ہی اسے شاہ زیب کے والدین پر بہت ترس آرہا تھا۔ جنہوں نے اپنی زندگی لڑائی جھگڑوں میں گزار دی تھی۔ ہر نعمت کو اپنے ہاتھوں سے راکھ کا ڈھیر بنادیا تھا۔

جب اسے ایئرپورٹ پر طارق ماموں سے اپنے والدین کے انتقال کی خبر ملی تھی۔ اپنے گھر پہنچتے ہی اس نے رامین کو فون ملا کیا تھا۔ اس سے بات کی تھی۔ تسلی کے الفاظ اس کے پاس نہیں تھے۔

اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتا وہ خود میں رامین کا سامنا کرنے کی ہمت پیدا نہیں کرپارہا تھا۔ ایسے میں حرا نے اسے سنبھالا تھا۔ سمجھایا تھا۔ جب تک اس کے پاکستان جانے کے انتظامات ہوئے وہ بہت حد تک سنبھل گیا تھا۔ اس لیے وہاں پہنچنے کے بعد نہایت اہم فیصلے کرنے میں اسے دیر نہیں لگی تھی۔

آراستہ محل کو بیچ دیا گیا رامین کی رضامندی سے۔

ٹرے میں کھانا اور پانی کا گلاس رکھ کر حرا اپنے بیڈ روم میں آئی تو شاہ زیب سونے کے لیے کپڑے تبدیل

کرکے باتھ روم سے باہر آچکا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک نڈھال سی مسکراہٹ نمودار ہوئی شاہ زیب کے چہرے پر پھر اس نے کہا۔

"سوری یار مجھے جانا چاہیے تھا تمہیں۔ بہت تھک گیا ہوں اس لیے بالکل بھی کچھ کھانے کا دل نہیں چاہ رہا۔ آئی ایم سوری۔"

"کوئی بات نہیں... میں واپس لے جاتی ہوں۔" اس نے ٹرے بستر سے اٹھائی اور دروازے سے باہر نکلتے ہوئے یکدم مڑ کر پوچھا۔

"گرم دودھ لادوں؟ یوں خالی پیٹ سونے سے اور زیادہ نڈھال ہوجائیں گے۔"

شاہ زیب نے اثبات میں سرہلایا۔

پانچ منٹ بعد وہ دودھ گرم کرکے لے آئی۔ شاہ زیب نے مگ ہاتھ میں لے لیا اور گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔

"شاہ زیب! میں رامین سے متعلق ایک ضروری بات کہنا چاہتی ہوں آپ سے..." کچھ لمحوں بعد اس نے ذرا جھجکتے ہوئے شاہ زیب سے کہا تو وہ لی دی سے نظر ہٹا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہاں کہو... کیا کوئی مسئلہ ہے؟"

"نہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اصل میں... میں یہ سوچ رہی تھی کہ ہمیں رامین کی شادی کردینی چاہیے۔" حرا نے اتنا کہہ کر تھوڑا وقفہ لیا پھر کہا۔

"امی کو رامین بہت اچھی لگی ہے۔ وہ میرا کزن ہے نا... اس کے لیے سوچ رہی تھیں۔"

"کون۔ ہاشم کی بات کررہی ہو کیا؟" شاہ نے پہلے سوال کیا پھر اسے یاد آگیا۔

ہاشم حرا کی خالہ کا بیٹا تھا اور نیویارک میں آرکیٹیکٹ تھا اور ہر طرح سے رامین کے لیے موزوں بھی۔ لیکن... شاہ زیب اس سے آگے سوچتے ہوئے رک سا گیا۔

"تم نے آنٹی کو بتایا ہے کہ رامین کو ڈائیورس ہوچکی ہے؟" حرا نے اطمینان سے کمفرٹر کھولا اور کہا۔

"ہاں... وہ جانتی ہیں کہ رخصتی سے پہلے ہی رامین کو ڈائیورس ہوگئی تھی۔ شاہ زیب! یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے کہ جو کسی کے لیے قابل اعتراض ہو۔ آپ جانتے تو ہیں میری فیملی کو..."

شاہ زیب کو اس بات سے اتفاق تھا کہ حرا کی فیملی نہایت سلجھی ہوئی تھی۔

"تم نے رامین سے اس بارے میں کچھ کہا؟" شاہ زیب کے لیے رامین کی مرضی جاننا بھی ضروری تھا۔

"پوچھا تھا میں نے رامین سے... خاص "ہاشم" کا نام لے کر نہیں، مگر ایسے ہی کہ شادی کے بارے میں وہ کیا سوچتی ہے؟"

"تو کیا کہا اس نے؟"

"اس نے صاف انکار کردیا۔ شاہ زیب... وہ کہتی ہے اسے زندگی بھر شادی نہیں کرنی ہے... آپ اسے سمجھائیے نا۔"

رامین کا جواب سننے کے بعد شاہ زیب کو فیصلہ کرنے میں ایک لمحہ لگا تھا بس اس نے قطعی لہجے میں حرا سے کہا۔

"دیکھو حرا... ڈونٹ ٹیک می رانگ، لیکن آج کے بعد تم اس بارے میں کچھ نہیں کہوگی... نہ مجھ سے نہ رامین سے۔ اگر وہ نہیں چاہتی تو ہم میں سے کوئی اسے مجبور نہیں کرے گا۔ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی نہ سہی۔ میں ساری زندگی اس کے لاڈ اٹھاؤں گا اور اس کی ہر خواہش پوری کروں گا اور جب تک وہ خود نہیں چاہے گی۔ کوئی اسے شادی کرنے کے لیے فورس نہیں کرے گا۔" وہ نہایت نرم لیکن مضبوط لہجے میں اسے سمجھا رہا تھا۔

"حرا! میں چاہتا ہوں رامین اپنی زندگی کا ہر فیصلہ اپنی مرضی سے کرے۔ میں اس کے ساتھ روا رکھی گئی ہر زیادتی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ اینڈ آئی ہوپ کہ تم میری فیلنگز کو سمجھنے کی کوشش کروگی۔" اس نے حرا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"ہاں ایک بات ضرور اس تک پہنچا دینا... کہ اسے اپنے تمام فیصلے کرنے کی آزادی ہے۔ اسے کوئی پسند

آئے اور وہ اس سے شادی کرنا چاہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور اگر وہ ساری زندگی اسی طرح رہنا چاہتی ہے... تو بھی... ہم اسے سر آنکھوں پر بٹھائیں گے... اوکے۔ کہہ دوگی نا تم؟"

شاہ زیب کو یقین دہانی کی ضرورت تھی، حرا نے گہری مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے اپنے محبوب شوہر کی طرف دیکھا اور بولی۔

"آں جان من، ام اس کو بول دے گا۔" حرا کی پشتو لہجے میں دی جانے والی گارنٹی شاہ زیب نے بھی مسکراتے ہوئے وصول کی تھی۔

☆ ☆ ☆

ناشتا سب نے مل کر ڈیک پر ہی کیا تھا۔ سوائے لیلیٰ اور رامین کے... لیلیٰ تو رضا کو نظر انداز کررہی تھی۔ اس لیے اور رامین کو اسے اکیلا اندر چھوڑ کر جانا گوارا نہیں تھا۔ اس لیے وہ بھی کچن کاؤنٹر پر اس کے ساتھ ہی ناشتا کرنے لگی تھی۔

دس بجے تک پورے گروپ کا ______ Mariposa جانے کا ارادہ تھا۔ چائے کافی سرو کردی گئی تھی۔ کچھ اپنے ہاتھوں میں مگ اٹھا کر ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ رامین کپڑے تبدیل کرچکی تھی۔ مگر لیلیٰ کو ابھی تیار ہونا تھا۔ ناشتا ختم کرکے وہ تیزی سے اٹھی اور کمرے میں تیار ہونے چلی گئی۔ رامین وہیں اسٹول پر بیٹھی کافی کی چسکیاں لے رہی تھی کہ رضا اس کے پاس آیا اور نہایت شائستگی سے گویا ہوا۔

"رامین آئم سوری... میں آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا... لیکن میرے ایک دوست نے ابھی ابھی ہمیں جوائن کیا ہے۔ کیا اس کے لیے بریک فاسٹ بن سکتا ہے۔"

"اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ میں ابھی بنادیتی ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے اسٹول سے اتر کر اسٹوو کے پاس آکر کھڑی ہوگئی اور رضا شکریہ کہتے ہوئے واپس ڈیک پر چلا گیا۔ فریج سے ناشتے کی چیزیں نکال کر وہ پلٹی تو نظر گلاس وال سے باہر نظر آتے رضا کے دوستوں پر

جا رکی، ایک نیا اضافہ تھا تو سہی... کرسی پر بیٹھا ہوا۔ جس کے پیروں کے پاس ایک بیگ بھی رکھا ہوا تھا۔ لیکن صورت اس کی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ اس کی طرف پشت کیے بیٹھا تھا۔ اس کے باوجود کچھ تھا جو رامین کو جانا پہچانا سا محسوس ہوا تھا۔

براؤن لیدر جیکٹ... اس کے ذہن میں صبح دکھائی دینے والے شخص کا سراپا ابھرا تھا۔ اوہ تو یہ رضا کے دوست ہیں۔ معما حل کرتے ہی وہ ناشتا بنانے میں پھر سے مصروف ہوگئی۔

ناشتا بنانے کے بعد اس نے رضا کی طرف دیکھا، جو اپنے دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں ایسا مگن ہوا تھا کہ رامین سے تھوڑی دیر پہلے کی گئی درخواست بالکل ہی بھلا بیٹھا تھا۔ اس نے چیز آملیٹ کی پلیٹ اپنے ہاتھ میں پکڑی اور کافی کا مگ لے کر ڈیک پر آگئی۔ نووارد کے دائیں طرف کھڑے ہوکر اس نے جیسے ہی پلیٹ اس کے آگے رکھی۔ اس شخص نے رامین کو دیکھا اور رامین نے اسے، اور دونوں ہی اپنی جگہ جم گئے تھے۔

وہ اجنبی نہیں تھا۔ ہرگز نہیں۔ وہ نووارد شخص... اسے وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ لیکن یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کے سامنے ہے۔ ٹھٹک کر رک جانے کے بعد... سانس لینا، پلکیں جھپکنا، وہ سب بھول گئی تھی۔ اس کا تو دل بھی دھڑکنا بھول گیا تھا۔

پیئے ہیں سات سمندر مگر وہی ہے پیاس
نگاہ بھرتی نہیں ہے کسی کو پاکر بھی

یہ کیفیت چند سیکنڈ پر مشتمل تھی اور اس شخص نے یک دم اپنا رخ موڑ کر اس کے اور اپنے درمیان بندھی نظروں کی ڈور کو جھٹکا دے کر واپس کھینچ لیا۔ اس کے حصے کی ڈور لپک کر آنکھ میں واپس آئی تو مجبوراً" پلکیں جھپکنا پڑ گئی تھیں۔ اپنے بڑھتے قدم واپس پلٹنا آسان نہیں تھا اور ٹھہرے وقت کے ساتھ ٹھہرنا بھی ناممکن... لرزتے جسم اور ڈگمگاتے قدموں سے کیبن میں آتے ہوئے اس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنے چہرے پر بکھری لٹوں کو پیچھے ہٹایا۔ کچھ سوچا اور

ایک بار پھر مڑ کر اس شخص کی طرف دیکھنے لگی۔

وہی چہرہ۔ وہی انداز۔۔۔ ہاں وہ وہی تھا۔ آس پاس کسی نے بھی نوٹس نہیں لیا کہ وہ کسے نوٹس کر رہی ہے۔ سوائے اس ایک شخص کے جو اس کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مہرز سب کچھ جان کر بھی انجان بنتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے سے گریزاں۔۔۔ اور وہ۔۔۔ سراپا انتظار۔۔۔ نہایت بے قراری سے اس کی توجہ کی طالب۔

مہرز خاموشی سے ناشتا کرتا رہا۔۔۔ سر جھکائے۔۔۔ اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر اپنے سامنے کھڑی رامین کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اس کا بے گانہ رویہ دیکھ کر رامین کو شک سا ہونے لگا۔۔۔ شاید وہ غلط سمجھی ہے۔۔۔ لیکن وہ سو فیصد وہی تو تھا۔ بالکل بھی نہیں بدلا تھا کہ اسے پہچاننے میں کسی بھی قسم کی کوئی دقت نہیں پیش آئی تو پھر وہ اس کی طرف دیکھتا کیوں نہیں۔۔۔

کیا میں بدل گئی ہوں؟ میری صورت بدل گئی ہے؟ وہ بھی اس قدر کہ مہرز مجھے پہچان نہیں سکا۔ یا پھر وہ ابھی تک مجھ سے خفا ہے۔ میری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس لیے مجھے پہچان کر بھی انجان بن رہا ہے۔

الگ الگ سہی دنیا کا اور دوست کا غم
کبھی یوں ہی ذرا دیکھو انہیں ملا کر بھی

ایک طویل ترین تھکی ماندی سانس۔۔۔ اس کے سینے سے خارج ہوئی گئی۔ بالکل بے آواز۔۔۔ گونگا دکھ۔۔۔ دل میں بھاری پتھر کی طرح آن بیٹھا۔ آنکھوں میں دھندلا غبار بھرتا چلا گیا۔ چاہنے کے باوجود وہ رو نہ سکی۔

عجیب قحط پڑا اب کے سال اشکوں کا
کہ آنکھ تر نہ ہوئی خون میں نہا کر بھی

اپنی بے بسی پر ہنستے ہوئے اس نے ہمیشہ کی طرح خود سے بے تحاشا نفرت محسوس کی تھی۔

"میں اسی قابل ہوں۔"

سخت طیش کے عالم میں خود کو اچھی طرح لعنت ملامت کرنے کے بعد اس نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

☆ ☆ ☆

یہ جو ریگ دشت فراق ہے' یہ رکے اگر۔۔۔
یہ رکے اگر تو نشاں ملے
کہ جو فاصلوں کی صلیب ہے' یہ گڑی ہوئی ہے کہاں کہاں
مرے آسماں سے کدھر گئی' تیرے التفات کی کہکشاں
مرے بے خبر' مرے بے نشاں
یہ رکے اگر تو پتا چلے
میں تھا کس نگر تو رہا کہاں
کہ زماں و مکاں کی یہ وسعتیں
تجھے دیکھنے کو ترس گئیں
وہ میرے نصیب کی بارشیں
کسی اور چھت پہ برس گئیں

مہرز بھی کبھار ایک اچٹتی سی نگاہ رامین پر ڈال لیتا اور پھر اپنے سیل فون پر میسج کرنے لگتا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنا فون جیکٹ کی جیب میں واپس رکھ لیا اور داک مین کان سے لگا لیا۔ رامین اور وہ دونوں ایک دوسرے کو نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن سوچ وہ ایک دوسرے کے بارے میں ہی رہے تھے۔ لیکن کسی شخص سے تجدید تعلقات کی آرزو میں ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ عرصۂ جدائی دکھائی نہ دینے کے باوجود بہرحال اپنا وجود رکھتا ہے۔ ہر گزرتا لمحہ مابین فاصلہ بڑھاتا چلا جاتا ہے اور یہ دوری' یہ خلا آمنے سامنے آتے ہی درمیان میں حائل ہو جاتا ہے۔ ہاتھ بھر کے فاصلے پر کھڑے دوست تک رسائی ناممکن لگنے لگتی ہے۔ بچھڑے ہوؤں کے درمیان سکوت بھر جائے تو ہر صدا کھو جاتی ہے۔ دشت سکوت پار کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔

شٹل اپنے روٹ پر رواں دواں اور مسافر۔۔۔ کچھ ایک دوسرے سے گفتگو میں مصروف۔۔۔ کچھ باہر دیکھتے ہوئے اپنے خیالوں میں مگن۔۔۔ اور وہ دونوں ہر تھوڑی دیر بعد ایک دوسرے پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر ادھر ادھر دیکھنے لگتے۔ دونوں ایک ہی کام کر رہے تھے اور دونوں۔۔۔ اسی کوشش میں تھے کہ ایک

دوسرے کو خبر نہ ہونے دیں۔ جس میں کسی حد تک کامیاب بھی تھے۔ رامین بالآخر سر جھٹک کر باہر دیکھنے لگی۔ اس نے جتنی دفعہ مہرز کو دیکھا تھا وہ کہیں اور ہی متوجہ نظر آیا تھا۔ مایوس ہو کر اس نے بھی منہ پھیر لیا۔

بس لاٹ میں آ کر شٹل رک گئی۔ رضا کے گروپ میں سات لوگ تھے اس کے علاوہ دو فیملیز تھیں۔ بس کے رکتے ہی آٹومیٹک دروازہ کھل گیا اور وہ سب اترنے لگے۔

رامین کو رش میں گھسنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ وہ صبر سے اپنی سیٹ پر بیٹھی رہی۔ جب تمام لوگ نکل کر آگے بڑھے تب اس نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالا اور شٹل کے دروازے تک پہنچ گئی۔ اترتے ہوئے اس کی نظر سامنے کھڑے مہرز پر پڑی۔ وہ اپنا بیگ پیر کے پاس رکھ کر اپنی جیکٹ اتار رہا تھا۔

سورج کھل کر چمک رہا تھا۔ اکتوبر میں یوسیمیٹی کے دن گرم ہی محسوس ہوتے ہیں جبکہ راتیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔ اسے بھی گرمی لگ رہی ہو گی ورنہ بس میں تو اے سی آن تھا۔ وہ ایک قدم نیچے اتری۔ مہرز نے ایک کندھے پر اپنا بیگ لٹکایا۔ دوسرے ہاتھ میں جیکٹ پکڑتے ہوئے اس کی نظر رامین سے الجھ گئی۔ اب کی بار لاکھ چاہنے کے باوجود وہ فوراً" اس سے نگاہ ہٹا نہیں سکا۔۔۔ اور وہ لمحہ اسیری تھا۔ کتنی کوشش کی تھی ان آنکھوں کے حصار سے بچنے کی۔۔۔ سوال کرتی شکوہ کناں آنکھیں۔۔۔ اس کی لاتعلقی پر اداس تھی وہ یا پھر۔۔۔ وہ آگے کچھ نہیں سوچ سکا کہ اب کی بار پہلے نظر چرانے والی رامین تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بھی یکدم تبدیل ہوئے تھے۔ مہرز مبہم سا مسکرایا۔ برسوں بعد وہ شناسا بیگانگی دکھائی دی تھی رامین کے چہرے پر۔ اب وہ اسے مکمل نظر انداز کر رہی تھی جبکہ مہرز بار بار اسے ہی دیکھے جا رہا تھا۔ اسے صاف نظر آ رہا تھا کہ رامین خفا ہے۔۔۔ اور یہ دیکھ کر اسے اچھا لگ رہا تھا۔ لاتعلقی کا اظہار بھی تعلق ہونے کا اعتراف ہوتا ہے۔

☆ ☆ ☆

رضا' حیدر انکل کے ساتھ کچھ کولڈ ڈرنکس اور اسنیکس لینے اندر چلا گیا۔

ان کا ارادہ ٹرام میں بیٹھ کر پورے ماری پوسا کا چکر لگانے کا تھا۔ معلوم نہیں یہ اتفاق تھا یا رامین کی ہمیشہ کی طرح رش سے بچ کر کھڑے ہونے کی عادت۔۔۔ کہ وہ کود کر اوپر چڑھنے والوں میں سب سے آخری نمبر پر تھی اور جو سیٹ اسے ملی' وہ مہرز کے عین مقابل تھی۔ اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی ایک ایسے شخص کی نظروں کے سامنے جمے رہنے میں' جو اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے دوبارہ غصہ آنے لگا۔ ہمیشہ کی طرح صرف اپنے آپ پر'

امبر فرقان کے ساتھ ہی تھی۔ اس گروپ میں اور کوئی اس کی عمر کا تھا بھی نہیں' یہ دونوں بچے لیلیٰ اور رامین کی ذمہ داری تھے۔ رامین نے فرقان کو آواز دے کر گروپ کے نزدیک رہنے کو کہا۔

"مجھے رضا کے ساتھ ہائکنگ کرنی ہے۔" لیلیٰ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے ادھر ادھر بھٹکنے کی تم ہم کے ساتھ ٹرام پر رہو گے سمجھے۔" فرقان برا سا منہ بنا کر وہاں بھاگتا ہوا حیدر کے پاس چلا گیا' شاید یہی درخواست دہرانے۔۔۔ رامین نے اسے کچھ فاصلے پر کھڑے حیدر خالو سے بات کرتے دیکھا اور جیسے ہی خالو نے اثبات میں سر ہلایا فرقان "یاہو" کا زبردست نعرہ لگاتا پلٹ کر لیلیٰ کی جانب آیا۔

"پاپا سے اجازت مل گئی ہے۔ تمہیں میرے ساتھ ہائکنگ پر چلنا ہو گا۔۔۔!"

"نو وے۔" لیلیٰ نے فوراً" انکار کیا تھا۔ اس کی رضا سے ناراضی چل رہی تھی اور وہ اس کے ساتھ کسی تفریح میں شریک نہیں ہونا چاہتی تھی۔

"میں پاپا کو منع کر دوں گی' تمہیں جانا ہے تو جاؤ۔۔۔

میں نہیں آؤں گی۔" وہ دونوں آپس میں الجھتے جھگڑتے دوبارہ حیدر کے پاس چلے گئے تھے۔ رامین تابندہ کے ساتھ ٹرام میں آکر بیٹھ گئی۔ باقی سب لوگ بھی ایک ایک کرکے آتے گئے اور ٹرام بھر گئی۔ پھر چل بھی پڑی لیکن مہریز نظر نہیں آیا تھا اب تک۔۔۔ رامین جو اس بار سب سے آخری سیٹ پر بیٹھی تھی اپنے آگے پیچھے تمام لوگوں کو باآسانی دیکھ سکتی تھی۔ جسے وہ نظر انداز کرنا چاہ رہی تھی' فی الحال وہ نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتی تھی۔ اسے بے نام سی الجھن ہونے لگی۔

اوپن ایر ٹرام۔۔۔ گہرے سبز رنگ کے بڑے سے ٹریکٹر کے پیچھے کوچ پر تیس چالیس سیٹیں نصب تھیں اور چڑھنے کے لیے دونوں جانب سے رستے چھوڑے گئے تھے تمام سیاح ٹرام کے رکتے ہی نیچے اترتے' تصویریں اتارتے اور دس منٹ تک واپس ٹرام میں پہنچ جاتے' جو نہ پہنچ پاتا' ٹرام اس کے لیے رکنے والی نہیں تھی' اسے وقت کی پابندی سے مطلب تھا۔

ست روی سے ٹرام چلتی ہوئی کلوتھسن ٹری کے نزدیک پہنچ گئی۔ مجبوری تھی۔ وہ گروپ کے ساتھ تھی جو وہ کرتے' اسے بھی وہی کرنا تھا۔ جبکہ اس کا دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ وہ اکیلی کچھ دیر اس جنگل کے کسی خاموش حصے میں جاکر بیٹھ جائے۔ اتنے سارے لوگوں کے درمیان ان کی باتوں کی آواز اسے پوری طرح محظوظ نہیں ہونے دے رہی تھیں۔

ایک گہری سانس لے کر اس نے اپنی خواہش کو دبانے کی بھرپور کوشش کی۔

آخری پڑاؤ فالن واوتا ٹری کے پاس تھا۔ اس نے ٹرام سے اتر کر ڈھیر ساری تصویریں اتاریں۔

ریسٹ روم کے پاس دس منٹ کا قیام اور پھر واپسی کا سفر۔۔۔ یہاں رضا اور اس کا پورا گروپ اتر گیا۔

انہیں ہائکنگ کرتے واوتا لاجز تک پہنچنا تھا۔ حیدر کے حکم پر لیلیٰ کو بھی فرقان کے ہمراہ جانا تھا۔ اس لیے تابندہ نرگس اور ان کے شوہر حضرات ٹرام میں رامین کے ساتھ بیٹھے رہے اور لیلیٰ فرقان فقرہ بازی کرتے ٹرام سے اتر گئے۔ رامین کی ہمت ہی نہ ہوئی کہ خود سے کہہ سکے "میں بھی جانا چاہتی ہوں۔"

منتظر نگاہوں سے وہ لیلیٰ کو دیکھتی رہی' جو فرقان سے الجھنے میں اتنی مصروف تھی کہ اسے رامین سے پوچھنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ وہ لحہ بہ لحہ اس گروپ کو ٹرام سے دور ہوتے دیکھنے لگی۔ ٹرام چلنے لگی تو نرگس آنٹی نے اچانک اسے مخاطب کیا۔

"ارے رامین! تم بھی چلی جاتیں نا سب کے ساتھ ہائکنگ پر۔۔۔ ہماری تو ہمت نہیں اتنا چلنے کی تم تو جا سکتی ہو۔" تابندہ خالہ کو بھی خیال آیا۔

"وہ لوگ ابھی زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔۔۔ وہ دیکھو سامنے جارہا ہے پورا گروپ۔" انہوں نے ایک طرف اشارہ کیا اور رامین تو جیسے تیار بیٹھی تھی۔

"خالہ میں جاؤں!"

"ہاں ہاں فورا" جاؤ۔۔۔" رامین اجازت ملتے ہی فورا" اٹھی' اپنا ہینڈ بیگ خالہ کو دے دیا اور صرف کیمرا ہاتھ میں لے کر ٹرام سے اتر گئی۔ ٹرام چل پڑی تو رامین نے اس راستے کی جانب دیکھا جہاں کچھ دیر پہلے پورا گروپ نظر آرہا تھا۔ وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس طرف بڑھنے لگی۔

اس نے گروپ کی تلاش میں ہر طرف نظر دوڑائی' ہائکنگ ٹریل پر تیز تیز چلتی ہوئی کافی آگے آگئی لیکن بے سود' جانے وہ سب کس طرف نکل گئے تھے۔ پروگرام تو یہی طے ہوا تھا کہ وہ سب ایر گروسے فطرلوپ تک جائیں گے۔ اس نے رضا کو کہتے سنا تھا' وہ قریبا" پانچ میل کی مسافت تھی' ناری پوسا سے واوتا لاجز تک یہ رستہ پیدل چلنے والوں کے لیے تھا۔ قدرتی مناظر کے حسن سے لطف اندوز ہوتے اترائی میں دو ہزار فٹ اتر جانا اتنا مشکل نہ ہوتا۔ نہ ان سب کے لیے اور نہ ہی رامین کے لیے۔۔۔ اگر وہ ان کے ہمراہ نکلی ہوتی یوں اکیلی انہیں یہاں سے وہاں ڈھونڈتی نہ پھر رہی ہوتی۔

وہ الٹے قدموں واپس ہولی۔ اپنا موبائل اپنے ہینڈ بیگ میں ہی چھوڑ دیا تھا اور ہینڈ بیگ کو خالہ کے پاس۔

"کیا بے وقوفی کردی میں نے۔" اپنے آپ کو کوسنے کا یہ سنہری موقع وہ کیسے جانے دیتی۔ بہرحال غلطی تو اس نے کی تھی۔ اب کف افسوس ملتے رہنے سے کوئی فائدہ تو تھا نہیں' ایک ہی راستہ بچا تھا اس کے پاس کہ اگلی ٹرام میں سوار ہو کر واپس چلی جاتی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اسی مقام پر آکر کھڑی ہو گئی جہاں سے ٹرام گزری تھی۔ ٹرام ٹریک پر فی الحال دور دور تک کسی ٹرام کا نام و نشان نہیں تھا۔ اب سوائے انتظار کرنے کے اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

ٹریک سے ہٹ کر وہ کچھ پل ادھر ادھر دیکھتی رہی' پریشانی کے عالم میں اسے کچھ دیر پہلے کی خواہش یاد آئی' جب وہ اکیلی اس جنگل میں وقت گزارنے کے بارے میں سوچ رہی تھی اور اب وہ اکیلی تھی۔۔۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑا۔ بجائے کڑھنے کے وہ اتنا وقت کسی جگہ سکون سے بیٹھ کر بھی تو گزار سکتی ہے۔ یہی سوچتی وہ مڑ کر ریسٹ روم کیبن سے آگے جاکر ڈھلان کے سرے پر آگئی' یہاں اس کے عقب میں جنگل تھا اور سامنے واوتا ویلی دکھائی دے رہی تھی۔

اس نے اپنا کیمرا ہاتھ میں لیا اور تصویریں لینے لگی۔ اپنی تنہائی سے اچھی طرح لطف اندوز ہوتی وہ ہر منظر کو کیمرے میں قید کررہی تھی۔۔۔ بہت مزا آرہا تھا اسے۔۔۔ کوئی گیت گنگناتے اس نے ایک منظر کو ذرا بہتر انداز سے فوکس کرنے کے لیے زمین پر بکھرے کچھ بڑے پتھروں میں سے ایک پتھر پر پاؤں ٹکا کر خود کو اٹھایا۔ ابھی کلک کرنے ہی لگی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی "رامین۔۔۔؟"

اتنی دیر سے خود کو تنہا سمجھنے والی رامین اپنا نام سن کر چونکی اور بے ساختہ ہی مڑ کر دیکھا۔ یوں ایک دم ہلنے سے توازن خراب ہوا تھا اور وہ جو ایک چھوٹے سے پتھر پر اپنے جسم کا پورا بوجھ ڈال کر کھڑی تھی' پہلے لڑکھڑائی اور پھر گر پڑی۔ اس نے ہاتھ سے کیمرا چھوڑ کر پیر پکڑ لیا اور چیخ اٹھی "اف۔"

آواز کس نے دی تھی' فورا" ہی معلوم ہو گیا جب اس کے زمین پر گرتے ہی مہریز "اوہ نو آئی ایم سوری" کہتا اس کے سامنے آکر بیٹھا تھا۔ "تم ٹھیک ہو رامین! پیر دکھاؤ مجھے۔۔۔"

رامین نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے پیر کو پکڑے ہوئے آنکھیں میچ کر اپنے ہونٹوں کو دانتوں تلے سختی سے دباتے ہوئے اپنی تکلیف کو ضبط کرنے کی پوری کوشش کررہی تھی۔ مگر چوٹ اچھی خاصی تھی۔ اسے زور کا چکر آیا تو اس نے پاؤں چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

"تم پلیز اپنا پاؤں تو سیدھا کرو پہلے۔۔۔" مہریز کی آواز سن کر اس نے ذرا سی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ وہ بے حد پریشان تھا اس کے لیے۔ لیکن فی الحال اس کی ہدایت پر عمل کرنا رامین کے بس میں نہیں تھا۔ اس کا پیر ابھی تک ٹانگ کے نیچے دبا ہوا تھا اور وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پارہی تھی کہ اسے خود سیدھا کر سکتی۔ مہریز کے دوبارہ کہنے پر اس نے گہری سانسیں کھینچ کر درد سے کراہتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی۔

"مہریز! مجھ سے ہلا نہیں جارہا۔۔۔" یہ سن کر وہ کچھ دیر تو اسے ناکام کوشش کرتے دیکھتا رہا پھر اٹھ کر اس نے ایک ہاتھ کو رامین کے گھٹنے پر رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے دبے پاؤں کے ٹخنے کو جکڑا اور آہستگی سے ٹانگ کو سیدھا کردیا۔ باوجود کوشش کے ایک ہلکی سی کراہ نکل ہی گئی۔ مہریز نے ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھا پھر دو زانو ہو کر اس کے متاثرہ پاؤں کا جائزہ لینے لگا۔

رامین کے ٹخنے اور ایڑی کے درمیان کا حصہ فورا" سوج گیا تھا۔ اس کے پاؤں میں موچ کے ساتھ ٹخنے پر بھی چوٹ آئی تھی۔ مہریز نے نرمی اور احتیاط کے

ساتھ انگلیوں کی پوروں سے وہ باریک پتھر ہٹائے جو رامین کے پاؤں میں کھب گئے تھے۔ نرم تلووں پر ان پتھروں کے نشان ــــ نظر آرہے تھے۔ جو سلیپرز رامین پہن کر آئی تھی یہاں کے لیے ہرگز موزوں نہیں تھے۔ اسے معلوم تھا۔ لیکن کیبن میں اچانک مہرز کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کے ذہن نے جیسے کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور وہ اپنے جاگرز پہننا بھول گئی تھی۔ مہرز نے باریک سنگ ریزوں کو جھاڑنے کے بعد انگلیوں سے پیر کو ذرا سا سہلایا تاکہ تکلیف کا احساس کم ہو سکے۔

پاؤں کی ایڑی کے کنارے ٹخنے تک آتی ایک نس ابھر آئی تھی۔ چند لمحوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ پیر کس جگہ سے مڑا ہے۔ مہرز کو لگا وہ اس کا پاؤں ٹھیک کر سکتا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے رامین سے بغیر کچھ کہے دونوں ہاتھوں سے اس کا پیر اور ٹخنہ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ جواب تک میندی آنکھوں سے اپنے درد میں کمی کا انتظار کر رہی تھی۔ پاؤں کے پکڑے جاتے ہی پوری آنکھیں کھول کر یکدم سیدھی ہو بیٹھی۔

"یہ تم کیا کرنے لگے ہو......؟" مہرز نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اسی دم اس کا پیر پنجوں سے پکڑ کر گھما دیا۔ رامین تکلیف سے تڑپ اٹھی۔

"مہرز کے بچے' میرا پیر چھوڑو۔" کہتے ہوئے اس نے اپنا پیر چھڑانے کے لیے مچلنا شروع کر دیا لیکن مہرز کی گرفت مضبوط تھی۔ اس کے اس طرح مچلنے پر وہ جھلا گیا۔

"تم دو منٹ سیدھی نہیں بیٹھ سکتیں؟ بند کرو یہ کتھک۔"

"تم میرا پاؤں تو چھوڑو......"

"نہیں چھوڑوں گا' جب تک تم تمیز سے سیدھی ہو کر نہیں بیٹھو گی۔" اب وہ باقاعدہ ڈانٹ رہا تھا رامین ساکت ہو گئی۔ مہرز نے کام جاری رکھا۔ پہلے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں سے ٹخنے پر چڑھی نس کو دبایا اور اس کا پنجہ ایک بار پھر مخالف سمت میں موڑ دیا۔ یہ مہرز کی ڈانٹ کا اثر تھا شاید...... جو اس بار زیادہ تکلیف ہونے کے باوجود رامین کے حلق سے آواز نہ نکلی تھی۔ لیکن آنکھ کے کناروں سے دو آنسو بے اختیار پھسل پڑے تھے۔

مہرز نے اس کا پیر چھوڑ دیا۔ رامین آنکھیں بند کر کے سر جھکائے درد کی لہروں کے مدھم ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ کچھ دیر یونہی گزر گئی۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر مہرز کی طرف دیکھا' جو اپنا بیگ کھول کر کچھ سامان نکال رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے پیر کو دیکھا۔ حیرت انگیز طور پر درد کا احساس آہستہ آہستہ معدوم ہو رہا تھا۔ اس نے ہمت کر کے اپنا پاؤں آگے پیچھے گھما کر دیکھا۔ ذرا سی چیخ پکار کی آواز کے ساتھ پیر با آسانی ہل جل کرنے لگا۔ موچ ٹھیک ہو گئی تھی لیکن چوٹ لگنے کے باعث ہڈی میں ابھی تک درد ہو رہا تھا۔ اس نے پیر پیچھے کر کے اسے ہاتھ سے سہلانا شروع کر دیا۔

"تم یہاں اکیلی کیا کر رہی تھیں...... باقی سب لوگ کہاں ہیں؟" مہرز نے اپنے بیگ سے بینڈیج رول باہر نکال کر اس کے پیروں کے نزدیک رکھی۔ رامین بر ستی نظریں جھکائے ہوئے بولی تھی "کوئی نہیں ہے سب چلے گئے ہیں۔"

"تمہیں اکیلا چھوڑ کر؟" وہ حیران ہوا "ایسا کیسے ہو سکتا ہے......؟" مہرز کا پوچھنا غضب ہو گیا' رامین پھٹ پڑی۔

"کیوں؟ تم نے بھی تو یہی کیا تھا' میں تم سے بات کرنا چاہتی تھی اور تم...... بغیر کچھ سنے چلے گئے تھے۔" اسکول کے باہر مہرز کا رویہ اسے آج بھی یاد تھا۔

"میں کہیں گیا نہیں تھا' وہیں پر تھا۔"

"مجھے تو نظر نہیں آئے تم۔"

"تم نے دیکھنے کی کوشش نہیں کی ہو گی...... ورنہ میں وہیں تھا' تمہارے آس پاس۔"

"کیا فائدہ ایسے...... پاس ہونے کا جب انسان دکھائی ہی نہ دے...... میں تم سے کچھ کہنا چاہتی تھی تم پھر بھی نہیں رکے......"

"تم آواز دے لیتیں' شاید رک جاتا۔"

"سب کچھ میں کرتی۔ کیوں؟" وہ بری طرح چڑ گئی تھی "اور آواز تو میں نے اب بھی نہیں دی' پھر

کیوں آئے ہو؟" اس کی آواز رندھ گئی۔
"دوست کڑے وقت میں خود پہنچ جایا کرتے ہیں' انہیں بلانا نہیں پڑتا۔" مہرز لب کچلتی اپنے آنسو روکنے کی کوشش میں مصروف رامین کو نرمی سے ہر بات کا جواب دے رہا تھا "تمہیں میری ضرورت پڑی تو میں آگیا۔"
"تو پہلے کیوں چلے گئے تھے؟" اب کی بار رامین نے اپنے آنسوؤں کو بہنے دیا اور مہرز کے لیے اسے روتا دیکھنا کسی امتحان سے کم نہیں تھا۔
"اب نہیں جاؤں گا۔" مہرز نے اس کے پیر پر کوئی ٹیوب لگائی۔ پھر کہا "آئم ایم سوری۔۔۔ میری وجہ سے تمہیں چوٹ لگ گئی۔۔۔ لیکن پلیز تم رو مت ۔۔۔ مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے۔"
"کوئی بات نہیں غلطی تمہاری تو نہیں ہے' یہ سلیپرز نہیں پہننے چاہیے تھے مجھے۔۔۔"
"تو تم نے معاف کردیا مجھے۔۔۔" مہرز ہلکے سے مسکرایا تھا۔
"اب یوں پیر پکڑ کر معافی مانگو گے تو معاف کرنا ہی پڑے گا۔" رامین اتنی دیر میں پہلی بار کھل کر مسکرا رہی تھی' پھر اس نے اپنا پاؤں ذرا سا پیچھے کرتے ہوئے کہا۔ "تم رہنے دو میں خود لگا لوں گی۔۔۔"
لیکن مہرز نے اسے ایسا کرنے نہیں دیا۔ فوراً" اس کا پاؤں پکڑ کر اپنے گھٹنے پر رکھا اور تحکمانہ انداز میں کہا "ابھی میں بینڈیج کروں گا۔ تم بالکل سیدھی بیٹھی رہو' سمجھیں۔"
کریم ملنے کے بعد وہ اس کے پیر پر بینڈیج لپیٹنے لگا پھر اس کا پاؤں اپنے گھٹنے سے ہٹا کر نیچے رکھ دیا۔
"تھینکس۔۔۔" اسے واقعی بے حد آرام مل رہا تھا' لیکن ابھی وہ ایک پاؤں پر سارا بوجھ ڈال کر کھڑی نہیں ہوسکتی تھی۔ مہرز نے کھڑے ہوکر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ مجبوری تو تھی۔ اسے اٹھنے کے لیے مہرز کا سہارا درکار تھا' سو اپنا ہاتھ خاموشی سے اس کے ہاتھ میں دے دیا۔
وہ اب پہلے کی طرح پریشان نہیں تھی۔ بظاہر اس چھوٹے سے حادثے نے ان کے درمیان موجود گرہ کو کھول دیا تھا۔ سب کچھ ٹھیک ہوگیا تھا لیکن۔۔۔ اس ساری گفتگو میں۔۔۔ جو دونوں نے آغاز میں کی تھی۔۔۔ وہ سمجھ نہیں پائے تھے۔ رامین اس سے ماضی کے حوالے سے شکوہ کررہی تھی جبکہ مہرز۔۔۔ حال میں ہی رہا تھا۔ وہ آج صبح رامین کو دیکھ کر چونکا تھا لیکن اتنا حیران نہیں ہوا تھا جتنی وہ نظر آرہی تھی۔ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں وہ رامین کو پہچان کر بھی انجان بن رہا تھا تو اس کی وجہ سوائے جھجک کے اور کچھ نہیں تھی۔ وہ یوں بے تکلفی سے اسے سب کے سامنے مخاطب نہیں کرسکتا تھا۔ اسے اندازہ تو ہوگیا تھا کہ رامین اس کا گریز دیکھ کر ہرٹ ہوئی تھی۔ مہرز دوڑتا ہوا نیچے آرہا تھا' جب اس نے رامین کو پہاڑ کے ایک طرف وادی کی تصاویر کھینچتے دیکھا تھا۔ اس کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ رامین سے خیر خیریت پوچھ کر وہ آگے بڑھ جاتا لیکن رامین کو چوٹ لگ گئی تھی اور یہ جان کر کہ وہ اکیلی رہ گئی ہے' وہ اسے یہاں چھوڑ کر تو نہیں جاسکتا تھا۔ اپنے ہاتھ کا مضبوط سہارا دے کر وہ اسے چلاتا ہوا ٹرام ٹریک تک لا رہا تھا راستے میں رامین نہایت بے تکلفی سے اپنی تمام بے وقوفیوں کی تفصیل سناتی رہی اور وہ سر جھکائے سنتا رہا' مسکراتا رہا۔
جب رامین نے اپنی بات ختم کی تو مہرز نے اپنا موبائل نکالا اور رضا کا نمبر ملایا۔ انہیں بتانا ضروری تھا کہ رامین خیر خیریت سے ہے اور ٹرام کے ذریعے ہی ماری پوسا سے واپس شٹل میں وادنا پہنچے گی۔ شٹل کو ابھی مزید آدھا گھنٹہ لگنا تھا۔ رضا نے ساری صورت حال اچھی طرح سمجھ کر حیدر انکل کو بھی فون پر بتادی تھی۔
ٹرام آچکی تھی۔ رامین مہرز کی مدد سے اس میں سوار ہوئی' اس کے آرام سے بیٹھ جانے کے بعد مہرز بھی کندھے سے بیگ اتار کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اپنا بیگ اس نے رامین اور اپنے درمیان رکھ لیا تھا۔ کوچ مسافروں سے بھر گئی اور پھر واپسی کا سفر شروع ہوگیا۔ مہرز کو لگا وہ ٹرام میں نہیں' کسی ٹائم مشین میں

بیٹھ گئے ہیں۔ رامین۔۔۔ جو اسکول میں بلا تکان اس کے ساتھ باتیں کیا کرتی تھی۔ اپنے بچپن کا ہر نیا انکشاف پہلے اس کے گوش گزار کرتی تھی۔
"کل پاپا نے مجھے نئے شوز دلائے ہیں' یہ دیکھو۔"
"ٹارزن کی واپسی" میں نے تو پڑھ لی ہے تمہارے لیے لائی ہوں۔۔۔ لو!"
"تمہیں پتا ہے ہفتے کو میں رکشے پر بیٹھی تھی' اتنا مزا آیا۔۔۔" وہ تالی بجا کر اپنے ہاتھ ان دیکھے ہینڈل پر جما لیتی اور بولتی جاتی۔ "یوں پھٹ پھٹ پھٹا پھٹ چلاتا گھماتا شور مچاتا وہ ہمیں نانی کے گھر لے گیا۔۔۔" اور کبھی کہتی۔
"کل رات پاپا ہمیں برگر الیون لے کر گئے تھے' لبرٹی میں۔۔۔ اف کیا بتاؤں مہرز! کتنے مزے کا برگر تھا۔" اور بھی بہت کچھ۔۔۔ باتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔۔۔ وہ سلسلہ جہاں رکا تھا جب رامین کے پاپا اس دوستی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر گئے تھے' آج وہیں سے دوبارہ شروع ہو رہا تھا۔ مہرز نہیں جانتا تھا کہ رامین کا ذہن اسے آج بھی اسی مقام پر سمجھ رہا ہے' جہاں یہ دوستی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ اسی ٹرانس میں تھی۔ اس ٹائم مشین میں بیٹھنے کے بعد اس نے پہلی بات وہیں سے شروع کی۔۔۔ جہاں آخری بات ختم کی تھی' تب جب وہ کلاس فور میں تھے اور مہرز اس کی یادداشت پر حیران ہوکر سن رہا تھا۔ وہ جو بھی کہہ رہی تھی' جیسے کہہ رہی تھی وہ صرف سن رہا تھا۔
"تمہیں پتا ہے' اس دن کے بعد میں نے رات کو پہلی بار جگنو اپنے ہاتھ میں پکڑا تھا۔ وہ بھورا بے ڈھنگا عجیب سا کیڑا ہوتا ہے۔ اف مہرز! بڑا مزا آیا اور پتا ہے میں نے بھائی کے ساتھ پتنگ بھی اڑائی تھی۔ اف! میرا ہاتھ کٹ گیا اتنی زور سے۔۔۔ یہ دیکھو۔۔۔"
اس نے سی کی آواز نکالتے ہوئے مہرز کے سامنے اپنی انگلی پیش کی۔۔۔ اور وہ جو اس تیز گام ایکسپریس کی نان اسٹاپ گفتگو میں بھول ہی گیا تھا کہ اسے بھی کچھ کہنا چاہیے' رامین کے سیدھے ہاتھ کی انگلی پر ہلکے

سے کٹ کا نادیدہ نشان بڑے غور سے دیکھتے ہوئے افسوس کرنے لگا اور تب ہی اس کی نظر کلائی پر پڑی۔
"یہ ہاتھ کیسے جلا تمہارا؟" رامین نے بھی اس نشان کو دیکھا اور کہا "یہ۔۔۔ یہ تو میں فرنچ فرائز تل رہی تھی مہمانوں کے لیے' ساتھ چولہے پر پانی ابل رہا تھا' پانی اچھل کر کڑاہی میں گرا اور کڑاہی کا تیل اچھل کر میرے ہاتھ پر۔۔۔ بہت بڑا آبلہ پڑ گیا تھا' اب تو بہت سال ہوگئے ہیں۔ پر یہ نشان جاتا ہی نہیں۔"
مہرز نے دیکھا' رامین اپنے پرانے زخم کو دیکھ کر تھوڑی افسردہ ہوگئی تھی' کہیں کھوسی گئی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا رامین کے ہر ہر زخم کے ساتھ کیسی یادیں وابستہ ہیں۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بالکل چپ چاپ ان درختوں کو دیکھنے لگی۔۔۔ مہرز نے تھوڑی دیر تک انتظار کیا شاید وہ دوبارہ بات شروع کرے گی۔ جب ایسا نہ ہوا تو وہ خود ہی پوچھ بیٹھا۔
"اور تو۔۔۔ تمہیں کھانا وغیرہ بنانا آتا ہے؟ سیکھا ہے تم نے؟"

امایہ خان

ناولٹ

جو سچ پوچھو تو ہم تم زندگی بھر ہارنے آئے
ہمیشہ بے یقینی کے خطرے کانپتے آئے
ہمیشہ خوف کے پیراہنوں سے اپنے پیکر ڈھانپتے
آئے
ہمیشہ دوسروں کے سائے میں اک دوسرے کو

چھٹی اور آخری قسط

چاہتے آئے
برا کیا ہے اگر اس کوہ کے دامن میں چھپ جائیں
جہاں پر جا کے پھر کوئی کبھی... واپس نہیں آتا
چلو اس کوہ پر...

بند آنکھوں کے کناروں پر نمکین سیال کے قطرے اسی انتظار میں تھے کہ وہ پلکیں اٹھائے تو انہیں رہائی نصیب ہو۔ وہ اس نظم کو گا نہیں رہی تھی محسوس بھی کر رہی تھی۔ نظم ختم ہوئی اور اس نے آہستگی سے ایر فون ہاتھ سے پکڑ کر نیچے کھینچ دیے۔ اب وہ تھوڑی شرمندہ ہو رہی تھی۔ اپنے سامنے میز پر فرائیڈ فش اور چپس کی پلیٹ سے آگے مہرز کی کلائی پہ بندھی گھڑی کا ڈائل چمکتا نظر آ رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ کب سے بیٹھا تھا۔ رامین نظر اٹھا نہ سکی۔ وہ خود اپنے لیے گایا کرتی تھی اور ابھی یہ سوچ کر اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ مہرز نے اسے گاتے ہوئے سن لیا ہے۔ اس نے بنا اس کی طرف دیکھے خاموشی سے کولڈ ڈرنک کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

مہرز بغور اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے پڑھا تھا کہیں... کہ جو لوگ چھوٹی چھوٹی بے وقوفانہ باتوں پر دل کھول کر ہنستے چلے جاتے ہیں وہ اندر سے بہت دکھی ہوتے ہیں اور آج رامین کو دیکھ کر... اس طرح دکھی دیکھ کر وہ بے چین تھا اور... مضطرب بھی۔

کیوں بھر آتی ہیں اس کی آنکھیں یوں بار بار؟ کیا دکھ ہے اسے... جو اپنے آنسوؤں کو ہر دم قہقہوں کے پیچھے چھپانے کی کوشش کرتی رہتی ہے؟ وہ مہرز کے سامنے اتنی دیر تک ہنستی رہی۔ خوش ہوتی رہی اور اب... اس کی پلکوں پر ٹھہرے آنسوؤں کے قطرے... چمک کر اپنی موجودگی کا احساس دلا گئے

وگرنہ اس نے تو بظاہر چھپانے کی بہت کوشش کی تھی۔ کچھ دیر یوں ہی دونوں خاموش بیٹھے رہے اپنی اپنی سوچوں میں غرق۔

"تم اداس کیوں ہو؟ مجھے بتاؤ پلیز۔" رامین نے ایک نظر مہریز کے فکرمند چہرے کو دیکھا اور فوراً" ہی نظریں ہٹالیں۔ وہ کافی حد تک خود کو سنبھال چکی تھی۔ اس کے پرانے زخم پر جو کھرنڈ جمنے لگا تھا' وہ انہیں کھرچنا نہیں چاہتی تھی۔ اب اسے اپنی زندگی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ خوش رہنا چاہتی تھی۔

مگر اس کے باوجود۔۔۔ اسے اپنی حساس طبیعت پر اختیار نہیں تھا۔ کوئی بھی خوشی یا درد کا پہلو ہوتا' وہ اسے دل کی گہرائیوں سے محسوس کرنے میں بالکل بے بس ہوجاتی۔ اسے رونا کیوں آیا تھا؟ معلوم نہیں' اور اسے کوئی بہانہ نہیں سوجھ رہا تھا کہ اپنی حالت کی کیا توجیہہ پیش کرے کہ مہریز کو مطمئن کرسکے۔ اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے سامنے سے ایک فرنچ فرائز اٹھایا۔ اس کا کنارہ کترتے ہوئے پہلے خوامخواہ ادھر ادھر دیکھتی رہی اور پھر اچانک ہی۔۔۔ اس نے مہریز کی شرٹ کی طرف انگلی اٹھائی اور کہا۔

"تم اس نیوی بلیو شرٹ میں بہت اچھے لگ رہے ہو۔" مہریز کو اپنے سوال کے جواب میں اپنی تعریف سننے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ اس نے جن نظروں سے رامین کو دیکھا اس سے رامین کو اندازہ ہوگیا کہ دھیان بٹانے کی یہ کوشش رائیگاں ہی گئی ہے۔ وہ پھر بھی اڑی رہی۔

"تمہاری تصویر کھینچوں؟" وہ ہاتھ میں کیمرا اٹھا کر بولی تھی۔ مہریز نے ہلکے سے مسکرا کر شعر پڑھا۔

اس کی عادت وہی ہر بات ادھوری کرنا
اور پھر بات کا مفہوم بدلتے رہنا

اور پھر رامین کے ہاتھ سے کیمرا لے کر میز پر رکھ دیا۔ ایک تو ایسا حسب حال شعر' اوپر سے فرار کی کوئی راہ نہ پاکر رامین کا موڈ یکدم آف ہوگیا تھا۔ وہ نروٹھے انداز میں مہریز کو گھورتی ہوئی کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

جانے کس عمر میں جائے گی یہ عادت اس کی
روٹھنا خود سے تو اوروں سے الجھتے رہنا

مہریز کے شعر پڑھنے سے رامین حیران ہوتی دوبارہ سیدھی ہوکر بیٹھ گئی' کچھ دیر اسے یوں ہی تکتی رہی اور پھر ہنس پڑی۔ مہریز بھی کھل کے مسکرا رہا تھا۔

"کہاں سے یاد کیے یہ اشعار؟" اس کا موڈ بہت اچھا ہوگیا تھا۔

"سوچا کبھی تم ملیں تو سناؤں گا تمہیں۔"

"رئیلی۔"

"تمہیں شاعری سے دلچسپی ہے؟" اب وہ فنگر فش اٹھا کر اسے ساس میں ڈبو رہی تھی۔ "میں حیران ہوں تم GiKi میں مکینیکل انجینئرنگ کررہے تھے یا اردو ادب میں ایم اے۔"

مہریز نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ چونک کر وہیں خاموش ہوگیا۔ جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا ابھی تک اس نے رامین سے ایسا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ اسکول کے بعد وہ کہاں رہا؟ کیا کیا؟ اس نے اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ پھر وہ کیسے جانتی تھی کہ مہریز نے Giki سے گریجویشن کیا ہے۔ وہ حیرانی سے رامین کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اتنی حیرت دیکھ کر وہ بھی پوچھ بیٹھی۔

"کیا ہوا۔۔۔ تم Giki کے ففتھ بیچ میں ہی تھے نا۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" اس کا سوال سن کر رامین اطمینان سے مسکرائی اور ٹشو پیپر سے اپنے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولی۔

"اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ تم ہی اتنے پاپولر ہو کہ جب گوگل سرچ پر میں نے تمہارا نام ٹائپ کیا تو Giki کا پیج کھل گیا اور ففتھ بیچ میں تم مل گئے تھے۔"

وہ ہاتھ جھاڑتی اٹھ کھڑی ہوئی اور مہریز کے لیے یہ وضاحت ایک اور دھچکا ثابت ہوئی کہ رامین نے اسے تلاشنا چاہا تھا کیوں؟ اس کے ساتھ چلتے وہ مسلسل یہی سوچتا رہا۔"

☆ ☆ ☆

بس لاٹ میں شٹل کے انتظار میں دونوں بینچ پر بیٹھ گئے۔

دس' بیس۔۔۔ حتی کہ تیس سیکنڈز بعد مہریز نے سر اٹھایا تو وہ اسی کو دیکھے جارہی تھی۔ ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر گھٹنے پر اپنی کہنی ٹکائے۔ ہاتھ کی اوک میں چہرے کو تھامے ہوئے' نہایت محویت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"تم ہمیشہ اسی طرح مسکراتے ہو۔ بالکل بھی نہیں بدلے۔۔۔ ابھی تک ویسے ہی ہو۔"

"اچھا؟ یعنی کیسا ہوں میں؟" مہریز نے دلچسپی سے پوچھا۔

"تم بہت اچھے ہو مہریز۔۔۔ بہت اچھے۔۔۔" اس کے سنجیدہ لہجے میں ملنے والے جواب پر وہ مسکرانا بھول کر حیرانی سے اسے دیکھنے لگا مگر وہ کہتی رہی۔

"تمہارے لیے دوسروں کو معاف کردینا کتنا آسان ہے۔ ہر ایک کا گناہ بھول جاتے ہو اور اپنی ذرا سی کوتاہی بھی یاد رکھتے ہو۔" وہ اسے دیانت داری سے سراہ رہی تھی۔

"ورنہ جو کچھ میں نے تمہارے ساتھ کیا تھا' تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میری شکل دیکھنا بھی پسند نہ کرتا۔۔۔ اور ایک تم ہو کہ سب کچھ بھلا کر اپنی دوستی نبھانے پہنچ جاتے ہو' تمہیں غصہ نہیں آتا مجھ پر۔۔۔"

"نہیں۔۔۔" وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔ یہ اس کی بے بسی کا اعتراف تھا۔ جس سے محبت کرتے ہیں اس کی ہر بری بات بھی اچھی لگنے لگتی ہے تو پھر ناراضی کیسی؟ لیکن رامین اسے مہریز کی فراخ دلی سمجھ رہی تھی۔

"اسکول ختم ہونے کے بعد۔۔۔ میں نے کئی بار تمہیں خواب میں دیکھا مہریز۔۔۔ لیکن۔۔۔ تم نے کبھی مجھ سے بات نہیں کی۔۔۔ کبھی بھی نہیں۔۔۔ تم ہمیشہ مجھے دور' دور ہی نظر آئے۔۔۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ضرور تم مجھ سے خفا ہو۔۔۔ میں نے تمہارا دل دکھایا تھا نا؟"

"تم نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا جس کے لیے تمہیں شرمندہ ہونا پڑے۔۔۔ غلطی میری تھی' مجھے تمہاری بک سنبھال کر رکھنی چاہیے تھی۔" وہ ہمیشہ کی طرح اسے ہر خلش سے آزاد کرنے کے لیے ایسی باتیں کررہا تھا اور کسی حد تک کامیاب بھی رہا تھا۔ رامین کے سر سے کچھ بوجھ تو ندامت کا سرک ہی گیا۔

اسی وقت بس آگئی اور دونوں اس میں سوار ہوگئے۔

واؤنا ہوٹل کے پاس شٹل نے انہیں اتار دیا۔ آہستہ آہستہ چلتے وہ دونوں لاجز کی طرف جارہے تھے۔ رامین کا پاؤں پہلے سے بہتر ہوگیا تھا کیونکہ وہ چلتی رہی تھی۔ اب اس نے مہریز کا ہاتھ نہیں پکڑا تھا۔ لیکن مہریز کو اس کی وجہ سے اپنی رفتار کم رکھنی پڑ رہی تھی۔ پھر آدھے گھنٹے بعد وہ کیبن تک پہنچ گئے۔ لاج کی سیڑھیاں ریلنگ کے سہارے چڑھتی جب وہ ڈیک پر پہنچی تو مہریز اس کے ساتھ چلتا ہوا گلاس ڈور تک آیا۔ اس کی توجہ رامین کے پیر کی جانب تھی جو بظاہر ٹھیک نظر آرہا تھا۔ تب ہی رامین کی آواز پر مہریز نے چونک کر سامنے دیکھا۔

"یہ کیا ہورہا ہے؟" اس کی آواز میں حیرت تھی اور حیرانی تو مہریز کو بھی ہوئی جب اس نے لاؤنج میں تمام لوگوں کے بیچ رضا کو لیلیٰ کے سامنے گھٹنے ٹیکے فرش پر بیٹھا دیکھا۔

☆ ☆ ☆

احسان تیرا ہوگا مجھ پر دل چاہتا ہے وہ کہنے دو
مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے' مجھے پلکوں کی چھاؤں میں رہنے دو

لیلیٰ کو تعجب ہوا تھا۔ تیز میوزک کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ لاؤنج میں رضا کے سب دوست کھڑے ہوئے تھے۔ سب لوگوں کے چہروں پر عجیب پُراسراری مسکراہٹ تھی۔ اس نے باری باری سب کی طرف دیکھا۔ پھر شیشے کے پار ڈیک پر موجود کرسیوں اور میز کو خالی دیکھ کر وہ کرسی کی جانب بڑھ گئی۔ اس نے اوپن کچن میں اپنا پہلا قدم رکھا ہی تھا

کہ میوزک بند ہو گیا۔ اس نے چونک کر پیچھے دیکھا تو سامنے رضا ہاتھوں میں ایک خوب صورت نازک سی کلی تھامے کھڑا تھا اور وہیں پس منظر میں اس کی اور رضا کی فیملی بھی کھڑی تھی۔ لیلیٰ نے الجھ کر، تھوڑا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ میوزک بند ہوتے ہی یکدم چھا جانے والی خاموشی بے حد معنی خیز محسوس ہو رہی تھی۔ ہر کوئی چپ چاپ کھڑا ان ہی کی طرف متوجہ تھا اور پھر... رضا اس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔

" Will you marry me "

لیلیٰ کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے ہی رہ گیا۔ کیسی فلمی صورت حال تھی۔ رامین اور مہریز بھی حیران تھے۔ وہاں تمام لوگ لیلیٰ کے جواب کے منتظر تھے اور لیلیٰ گونگوں کی طرح کھڑی تھی۔ رضا نے دوبارہ پوچھا۔ "لیلیٰ مجھ سے شادی کرو گی؟"

لیلیٰ نے اپنے سامنے زمین پر گھٹنے ٹیکے رضا کو نظر بھر کر دیکھا۔

"لیلیٰ! جلدی جواب دو پلیز... میرے گھٹنے دکھنے لگے ہیں۔" رضا نے بڑی تکلیف دہ شکل بنا کر اسے کچھ بولنے پر اکسانا چاہا۔

لیلیٰ نے تابندہ کو اجازت طلب نظروں سے دیکھا تھا۔ ... تابندہ اور حیدر دونوں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا... ان کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے اور یہی حال رضا کے والدین کا بھی تھا۔ لیلیٰ نے ادھر سے سگنل ملتے ہی رضا کے ہاتھ سے پھول لے کر " Yes " کہہ دیا سب لوگ تالیاں بجا کر انہیں مبارک باد دینے لگے۔

رضا اٹھ کر کھڑا ہوا اور اپنے دوستوں کی ہوٹنگ سن کر عجیب سی شکل بناتے ہوئے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ رامین نے آگے بڑھ کر لیلیٰ کو گلے لگا لیا اور مہریز نے رضا سے ہاتھ ملا کر مبارک باد دی۔ پھر دونوں اپنے والدین کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے باری باری دونوں کو لپٹا کر خوب پیار کیا۔ سب لوگ بہت خوش تھے اور اپنی خوشی کا کھل کر اظہار بھی کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ فرقان جو ہمیشہ بہن سے لڑتا رہتا تھا۔ اس وقت خوشی سے چھلانگیں لگا رہا تھا۔

یہاں آنے سے پہلے کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ چار دن کا ٹرپ ایک سیلیبریشن پر اختتام پذیر ہو گا۔

☼ ☼ ☼

اس نے لاؤنج میں رکھے بڑے صوفے پر ٹیک لگا کر اپنے پاؤں بھی اوپر اٹھا لیے تھے۔ اپنی شال کو ٹخنوں تک ڈال کر رامین نے سکون بھری سانس لی اور مہریز کی طرف دیکھا، جو ٹی وی کا ریموٹ ہاتھ میں لیے نہایت انہماک سے خبریں سن رہا تھا۔

"ویسے میں نے فیس بک پر بھی ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی تمہیں... لیکن تم ملے ہی نہیں۔ کیا تم نے فیس بک جوائن نہیں کیا ہے؟"

"جوائن تو کیا ہے... لیکن مجھے صرف فرینڈز ہی ڈھونڈ سکتے ہیں۔ میری سیٹنگ ہی ایسی ہے۔" اس کی نظریں ٹی وی سے ہٹی نہیں تھیں۔

"اپنی سیٹنگ کرو۔ پھر ایڈ کرنا مجھے... ویسے تم میرا نام ٹائپ کر کے دیکھنا... میں مل جاؤں گی تمہیں۔" وہ تھوڑی دیر سیدھا لیٹ کر پھر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "آئی ایم شیور تم نے مجھے کبھی ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی ہو گی۔ تمہیں تو سرے سے یاد ہی نہیں ہو گا کہ اس دنیا میں رامین نام کی کوئی مخلوق بھی ہوا کرتی تھی ہے نا۔" وہ خود سے تمام نتائج اخذ کر لینے کے بعد رسماً" اپنی تائید چاہ رہی تھی۔

وہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ اس لمحے مہریز نے کہنا چاہا کہ وہ اسے کبھی بھول ہی نہیں پایا تو یاد کرنے یا رکھنے کا کیا سوال؟ جو لڑکی اس کے خوابوں میں رہتی تھی۔ جس کی ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو اس نے بہت سنبھال سنبھال کر رکھا تھا۔ اس سے اپنی عقیدت کا اظہار وہ ایک جملے میں تو نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ کہہ پایا تو بس یہی۔

"تم اتنا نیگیٹو کیوں سوچتی ہو؟"

"کیونکہ میں حقیقت پسند ہوں۔" جھٹ سے جواب آیا۔ "مجھے اپنے حوالے سے کوئی خوش فہمی

نہیں ہے۔"

آخری فقرہ کہتے ہوئے جانے کیوں اس کا لہجہ سخت اور کھردرا سا ہو گیا۔ مہرز نے اس کا تلخ لہجہ محسوس کرنے کے باوجود جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا۔ "فرقان کہاں چلا گیا؟"

"زندگی ہمیشہ ہمیں سرپرائز کرتی رہتی ہے۔ ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ جیسا میرے ساتھ ہوا۔"

لیلیٰ اور رامین کیبن کے پچھلے حصے میں بیٹھ کر باتیں کر رہی تھیں۔ تابندہ' حیدر اور انکل' آنٹی سونے جا چکے تھے۔ اپنے جذبات رامین پر عیاں کرنے کے بعد وہ دلی طور پر اس سے اور قریب ہو گئی تھی۔ دوپہر میں کیا ہوا تھا۔ وہ پوری تفصیل اسے سنانے لگی۔

"اس لمحے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے اپنا وجود مٹی میں رول دیا ہے۔ نادانستگی میں خود کو کافی ڈی گریڈ کر لیا ہے میں نے۔۔۔ اب وہ کبھی میری عزت نہیں کرے گا۔ میں کبھی اس سے نظریں ملا نہیں سکوں گی اور دیکھیں کیا ہوا۔" لیلیٰ کے چہرے پر تسکین بھری مسکراہٹ ابھری۔ پل بھر میں اس کا چہرہ روشن ہو گیا۔

"اس نے ساری دنیا کے سامنے میری محبت کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ مجھ سے مجھ ہی کو مانگ کر کیسے میری ذات پر میرا یقین پھر سے قائم کر دیا' مجھے کیسے معتبر کر دیا۔ میں نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا کہ رضا مجھ سے یوں اظہار محبت کرے گا۔"

"تم بہت خوش قسمت ہو۔" رامین کو اس پر رشک آنے لگا۔ "رضا تمہیں بہت چاہتا ہے۔"

"ہاں۔۔۔" لیلیٰ کی آنکھوں میں قندیلیں جگمگا رہی تھیں۔ اس نے ایک نظر رامین کی طرف دیکھا اور کہا۔ "ویسے خوش قسمت تو تم بھی بہت ہو۔"

"کس لحاظ سے؟"

"جس لحاظ سے میں خوش قسمت ہوں۔"

ان دونوں کے سامنے درختوں کے تاریک جھنڈ سے اوپر بارہویں کا نامکمل چاند بہت صاف اور روشن نظر آ رہا تھا۔ لیکن رامین کو جانے کیوں وہ زرد سا دکھائی دیا۔ "شاید میری بینائی کا قصور ہے۔" اس نے سوچا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر لیلیٰ کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"تم میرا موازنہ اپنے ساتھ مت کیا کرو۔ نہ تو میں خوش قسمت ہوں اور نہ ہی اپنی قسمت سے خوش ہوں۔ مجھے تمہاری طرح ٹوکرے بھر کے محبت نہیں ملی ہے۔ دنیا میں ایسا کوئی نہیں ہے جو مجھ سے محبت کرتا ہو۔" اس کی آواز میں نہ دکھ تھا' نہ مایوسی۔۔۔ بے تاثر لہجہ میں 'سپاٹ انداز سے کہا گیا جملہ فوری طور پر لیلیٰ کا خیال تبدیل نہیں کر سکا تھا۔ وہ اپنے موقف پر قائم رہی۔

"ہر انسان کے لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کم از کم ایک ایسا شخص ضرور پیدا کیا ہے جو اس سے بے حد محبت کرتا ہے۔ اس کی تمام برائیوں' بدصورتیوں اور خامیوں کے باوجود۔۔۔ وہ اس سے پیار کرتا ہے' اس کی چاہت رکھتا ہے اور اپنی بے لوث محبت سے وہ کبھی دستبردار نہیں ہوتا۔"

رامین نے دھیرے سے گردن موڑ کر لیلیٰ کو دیکھا جو انتہائی ٹھوس لہجے میں اس کی تردید کر رہی تھی۔

"اللہ نے تمہارے حصے کی محبت اکٹھی دینے کا پلان بنایا ہوگا۔ اس لیے تمہیں فی الحال اپنی زندگی محبت سے خالی لگ رہی ہے۔ جب وہ ایک شخص تمہیں مل جائے گا۔ جسے اللہ نے صرف تمہیں چاہنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ پھر تمہارے تمام شکوہ شکایت دم توڑ دیں گے۔"

"اللہ نے ایک ایسا شخص بھیجا تھا۔ مگر پھر وہ بھی مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔" رامین کی آواز میں آنسوؤں کی نمی گھلنے لگی۔

لیلیٰ نے مڑ کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے دبایا۔ "نہیں رامین۔۔۔ جو تمہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ تمہارا تھا ہی نہیں۔ اسے تم سے کبھی بھی محبت نہیں تھی۔ جو ہم سے محبت کرتا ہے نا اسے ہم لاکھ دھتکاریں۔ تب بھی وہ ہمیں تنہا نہیں چھوڑتا۔"

رامین بے اختیار رو پڑی تھی۔ لیلیٰ نے اسے گلے

لگا لیا۔ روتے روتے رامین نے کہا تھا۔ "میں دعا کرتی ہوں تم رضا کے ساتھ ہمیشہ خوش رہو۔"

"اور میری دعا ہے' اللہ محبت پر تمہارا یقین قائم کر دے' ایسا کہ متزلزل نہ ہو۔"

☆ ☆ ☆

آج صبح دس بجے اس کی نہایت اہم میٹنگ تھی۔ ایک کورین کمپنی ان کے اسٹور میں اپنی الیکٹرونکس پروڈکٹس رکھوانا چاہتی تھی۔ یہ میٹنگ مہرز نے کل رات فون پر کنفرم کی تھی یوسیمیٹی میں۔۔۔ اور پھر وہ رات میں ہی وہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔ خوش قسمتی سے اسے فلائٹ بھی مل گئی تھی۔ جس کی وجہ سے پوری رات خراب ہونے سے بچ گئی اور اسے آرام کرنے کا وقت بھی مل گیا تھا۔ پارکنگ لاٹ میں اپنی کار پارک کرنے کے بعد اس نے ایک بار پھر گھڑی کو دیکھ کر اطمینان کیا۔ وہ بالکل ٹھیک وقت پر یہاں پہنچا تھا۔ لیکن کورین کمپنی کا ڈیلیگیشن اس سے پہلے یہاں پہنچ چکا تھا۔ اسی لمحے جب وہ کار کا دروازہ بند کر رہا تھا' اسے اپنے مینیجر کا میسج موصول ہوا اور اس کے قدموں کی رفتار خود بخود تیز ہو گئی۔ اپنے آفس کی طرف جاتے ہوئے اس کا فون دوبارہ رنگ دینے لگا۔ اس نے نمبر دیکھے بغیر کال ریسیو کی اور لفٹ میں سوار ہو گیا۔

"مہرز۔۔۔ کہاں ہو تم۔۔۔" دعا سلام کیے بغیر رامین نے استفسار کیا اور وہ اس کی آواز سنتے ہی مسکرانے لگا۔

"رامین؟" مہرز بے یقینی۔۔۔ حیرت اور خوشی۔۔۔ بیک وقت ان تینوں کیفیات کا شکار ہوا تھا۔

"ہاں میں رامین بات کر رہی ہوں۔۔۔ کہاں ہو تم؟" اس نے 'کہاں' کو لمبا کھینچ کر ادا کیا تھا جس سے صاف ظاہر ہوا کہ وہ بے چینی سے اس کی منتظر ہے اور اس سے پہلے کہ مہرز جواب دیتا' وہ پھر سے بول اٹھی۔

"خیر جہاں بھی ہو' فوراً "لاج" میں آجاؤ' میں نے اتنا زبردست ناشتہ بنایا ہے تمہارے لیے۔" لفٹ تیسری منزل پر پہنچ کر رک گئی اور مہرز نے اس کی بات ختم ہوتے ہی کہا۔

"میں نہیں آسکتا رامین! میں یہاں اپنے کام پر واپس آگیا ہوں اور۔۔۔"

"تم واپس چلے گئے ہو؟" رامین کی آواز یک دم دھیمی ہو گئی۔ سارا جوش و خروش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"کچھ کہے بغیر؟ مجھ سے ملے بغیر۔۔۔ بتائے بغیر۔۔۔ تم واپس چلے گئے؟" رامین کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

"مجھے بہت ضروری کام تھا رامین۔۔۔ میں رک نہیں سکتا تھا۔" مہرز اپنے آفس کی طرف بڑھنے لگا۔

"تو نہ رکتے۔" وہ غصے میں آگئی۔ "کم از کم بتا تو سکتے تھے' کچھ کہہ کر تو جا سکتے تھے۔ میں یہاں بے وقوفوں کی طرح انتظار کر رہی ہوں۔ ڈھونڈ رہی ہوں تمہیں۔" وہ سخت ناراض ہو گئی تھی۔ مہرز کے پاس وضاحت دینے کا وقت بالکل نہیں تھا۔ اپنے آفس کا دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے رامین سے کہا۔

"رامین! میں اس وقت تم سے بات نہیں کر سکتا۔"

"تو مت کرو بات۔۔۔ مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تم سے بات کرنے کا۔" رامین نے اس کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا اور غصے میں فون بند کر دیا تھا۔ مہرز نے ایک گہری سانس لے کر اپنے فون کی جانب دیکھا اور اسے آف کر کے جیب میں واپس رکھتے ہوئے اپنے آفس میں داخل ہو گیا۔ جہاں کورین ڈیلیگیشن اس کی آمد کا منتظر تھا۔

میٹنگ ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی' اس کے بعد مہمانوں نے اس کے اسٹور کا جائزہ لیا اور اس کا مزید ایک گھنٹہ ان ہی کے ساتھ گزرا تھا۔ دوپہر کے ڈیڑھ بجے واپس اپنے آفس میں آکر بیٹھتے ہوئے اس کے ذہن سے ہر چیز محو ہو گئی تھی۔ اپنا کام' آرڈرز' سیلز' پرچیزنگ حتیٰ کہ چند گھنٹوں پہلے میٹنگ میں کن شرائط پر ڈیل کی گئی تھی۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ رامین کی آواز اس کے ذہن و دل کو جکڑے ہوئے۔۔۔ بار بار وہ شکوے دہرا رہی تھی۔ اسے کام کر کے تھکن محسوس

نہیں ہوتی تھی۔ کبھی بھی نہیں۔۔۔ لیکن آج وہ محض آدھے دن کے بعد ہی خود کو نڈھال محسوس کرنے لگا تھا۔

رامین کی ناراضی بالکل بجا تھی۔ مہرز کچھ کہے بغیر اسے ملے بغیر ہی واپس آگیا تھا۔ اس اچانک واپسی کی وجہ بظاہر وہ میٹنگ تھی، لیکن یہ جھوٹ وہ دنیا کے سامنے تو پیش کرسکتا تھا۔ خود اپنے روبرو وہ ایک تلخ حقیقت کے ساتھ پیش ہوا تھا۔ آج بھی رامین کو۔۔۔ کسی اور کے ساتھ دیکھنا اسے کسی اور کی ملکیت تصور کرنا۔۔۔ اس کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ ہرگز نہیں ہے۔

اگلا تمام دن۔۔۔ روٹھی ہوئی، خفگی سے منہ پھیرے ایک لڑکی سے نظر ہٹا نہیں پایا تھا، جو اس کے دل میں رہ رہی تھی۔ یوں ہی اپنے مینیجر کی بات سنتے ہوئے وہ رامین کو منانے کے لیے ذہن میں جملے ترتیب دینے لگ جاتا اور سامنے کھڑا مینیجر دیواروں کو ساری تفصیلات سے آگاہ کرتا رہتا، جو مہرز سے زیادہ غور سے اس کی بات سن رہی تھیں۔ وہ پورا دن اسی آنکھ مچولی میں گزرا تھا۔ جب مہرز کے دل نے دماغ کو کام نہیں کرنے دیا تھا۔

رات کو اسے ڈنر پر جانا تھا۔ اپنے اسٹور سے نکل کر باہر پارکنگ میں اپنی کار تک جاتے ہوئے اس نے رامین کو فون ملایا اور پھر کنیکٹ ہونے سے پہلے ہی کاٹ دیا۔ اس نے سوچا رات کو واپس آکر وہ اس سے اطمینان سے بات کرے گا۔ دو، تین گھنٹوں کی تو بات تھی۔ کار کو ریسٹورنٹ کے رستے پر ڈال دیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ واپسی پر بھی وہ رامین کو کال نہیں کرپائے گا۔

ڈنر کرنے کے بعد جب وہ ریسٹورنٹ سے باہر آیا تو اسے ایک کال موصول ہوئی تھی جس نے یک دم اس کا موڈ خوشگوار کردیا تھا۔ نیویارک سے آنے والی کال نے اس کے آئندہ چار دنوں کا شیڈول مرتب کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جیری کو آنے والے ویک اینڈ کے لیے ہدایات دیتے ہوئے وہ بے حد پرجوش تھا۔

مہرز بہت خوش تھا اور خوش کیوں نہ ہوتا، ایک بہت اہم شخص اس ویک اینڈ اس کے پاس آنے والا تھا۔

✫ ✫ ✫

مہرز نہایت سنجیدگی سے نظریں سڑک پر جمائے خاموشی سے ڈرائیو کررہا تھا۔ ایئرپورٹ پر اس کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے تو بے اختیار حسن کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ سچی خوشی آنکھیں نم کردیا کرتی ہے۔

”کیسا ہے یار؟“ اپنے بچپن کے دوست سے برسوں بعد ملاقات ہورہی تھی۔ حال چال پوچھتے مہرز نے اس کے کندھے پر اپنا بازو پھیلا کر ساتھ چلنا شروع کردیا۔ حسن ٹرالی دھکیلتے ہوئے ایئرپورٹ سے باہر نکل آیا۔ مہرز اسے وہیں رک کر انتظار کرنے کا کہہ کر اپنی کار لانے پارکنگ کی طرف روانہ ہوا۔

”واؤ۔۔۔“ اپنے سامنے بلیک اسپورٹس کار کو رکتے اور اس میں سے مہرز کو برآمد ہوتا دیکھ کر حسن بے اختیار کہہ اٹھا۔ ”زبردست گاڑی ہے یار۔“ مہرز نے اس کا چھوٹا سا سوٹ کیس اٹھا کر پچھلی سیٹ پر رکھ دیا اور حسن ستائشی انداز میں گاڑی پر ہاتھ پھیر کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتا رہا۔

”چلو بیٹھو بھئی۔“ مہرز نے حسن سے کہا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ پھر کار اسٹارٹ کرکے سڑک پر لے آیا۔

اب تک پیش آنے والے اہم واقعات میں حسن کی شادی اور ایک بیٹے کی پیدائش کی تفصیل سنتے ہوئے وہ خوش دلی سے مسکراتا رہا تھا۔ موڈ تو اس وقت خراب ہوا، جب حسن نے یہ بتایا کہ وہ مہرز کے گھر قیام نہیں کرسکتا۔

حسن جس ملٹی نیشنل کمپنی سے منسلک تھا۔ اس نے یہاں سے کچھ مشینری خریدی تھی۔ جسے آپریٹ کرنے کی ٹریننگ لینے کی غرض سے اپنے انجینئرز اور کچھ ورکرز کو کیلی فورنیا بھجوایا تھا۔ اس لیے رہائش کا انتظام بھی کمپنی کی طرف سے تھا۔ جس پر مہرز سخت

مایوسی کا شکار ہوا، لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔ حسن کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا اس کی خواہش تھی۔ بنا کچھ کہے ناراضی کا اظہار۔۔۔ مہرز کی یہ عادت اس کے لیے نئی نہیں تھی۔ اس کی بات سن کر جس طرح وہ چپ سا ہوگیا تھا۔ حسن کو وجہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

”یار! اب ناراض مت ہو۔۔۔ بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا ایسی شکل بنا کر۔“

مہرز نے گردن موڑ کر ایک جتاتی نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور دوبارہ سامنے دیکھنے لگا۔ حسن ہنس پڑا۔ ”ایمان سے یار۔۔۔ جب ہنیہ خفا ہوتی ہے نا۔۔۔ تو بالکل ایسے ہی دیکھتی ہے مجھے۔۔۔ یوں خفا ہو کر تو بالکل بیوی لگ رہا ہے میری۔“

حسن نے انتہائی لاڈ سے مہرز کا گال نوچا تو مہرز نے کندھا جھٹک کر اپنے ہاتھ سے اس کا ہاتھ پرے کیا۔

”میں تمہارا دوست ہوں۔ مجھ سے یوں محبت کے اظہار نہ کرو۔“ مہرز اسٹیئرنگ پر ہاتھ جمائے نہایت احتیاط سے کار ڈرائیو کررہا تھا۔ پھر بھی ہر تھوڑی دیر میں وہ ایک اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈال کر اپنے خیالات کا اظہار بھی کردیتا۔ باتوں میں وقت اور راستہ طے ہونے کا اندازہ نہیں ہوا اور گھر آگیا۔ مہرز نے سرسبز لان کے بیچوں بیچ ڈرائیو وے پر گاڑی کھڑی کی۔ حسن نے باہر نکلتے ہوئے ایک اور احسان جتانا ضروری سمجھا۔

”ایک تو میں اپنے گروپ سے ایک دن پہلے تمہارے پاس یہاں آگیا ہوں، کیونکہ مجھے تمہاری یاد نے اس قدر بے چین کردیا تھا کہ میں انتظار نہیں کرسکا اور دوسرا۔۔۔ میں آج کی رات تمہارے گھر ہی ٹھہروں گا، کل سے اپنے گروپ ممبرز کو جوائن کرنا ہے میں نے۔“

”بڑی مہربانی ہے آپ کی۔“ مہرز نے طنزیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا اور اس کا سوٹ کیس ہاتھ میں لے کر کار لاک کردی۔ ”اب یہ بھی بتاؤ کہ اس ڈیڑھ دن میں تمہیں کس طرح وہ ساری جگہیں دکھاؤں۔۔۔ جو میں دکھانا چاہتا ہوں؟ کیا کیا پلانز سوچ رکھے تھے میں نے۔۔۔ سب ستیاناس ہوگیا۔“

”ویسے یہ سن گلاسز بہت سوٹ کررہے ہیں تم پہ۔“ حسن نے بھی حسب عادت بات کو کہیں اور موڑ دیا۔ مہرز نے گہری سانس کھینچ کر اندر لی اور اپنے سن گلاسز اتار کر اسے پکڑا کر بولا۔

”تو۔۔۔ تم لے لو۔“ اور سوٹ کیس اٹھا کر داخلی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ حسن اس کے پیچھے چل پڑا۔

”کیا لڑاکا عورتوں والے انداز اپنا لیے ہیں۔۔۔ اچھا بات تو سن!“ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر مہرز کا رستہ روکا۔

”دیکھو۔۔۔ یہ دو ہفتے شیڈول ذرا ٹائٹ ہے۔ اس کے بعد تمہارے پاس آجاؤں گا۔۔۔ پرامس۔“

مہرز کچھ کہے بنا اسے گھورتا رہا۔ حسن اس کے جواب کا منتظر پوری آنکھیں کھولے، عجیب و غریب ایکسپریشن دے رہا تھا۔ مہرز زیادہ دیر سنجیدہ نہیں رہ پایا اور مسکرانے لگا تو حسن کی جان میں جان آئی۔

✫ ✫ ✫

چھ سال پہلے آج ہی کے دن وہ صبح ہی صبح اٹھ بیٹھی تھی۔ اپنے نکاح پر پہننے کے لیے خریدے گئے جوڑے کو اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کتنی بار خود سے لگا کر ہر زاویے سے گھوم کر دیکھا تھا۔ وہ زیور، چوڑیاں، جوتے۔۔۔ ان تمام چیزوں کو اس نے ہاتھوں میں لے کر بے ساختہ چوما تھا۔ وہ اس قدر خوش تھی۔

لیکن چھ سال بعد طلوع ہونے والا سورج اسے عجیب سے دکھ میں مبتلا کررہا تھا۔ حسب عادت فجر کی نماز کے بعد چہل قدمی کے لیے وہ لان میں آگئی۔ طبیعت بھاری تھی۔ دل پر یادوں کا بوجھ بڑھتا جارہا تھا۔ وہ زیادہ دیر تک چل پھر نہیں سکی تھی اور تھک کر گھاس پر بیٹھ گئی تھی۔

حرا نیلوفر کی فیڈر بنانے کچن میں آئی تو باہر لان میں گھاس پر بیٹھی رامین کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے سرسبز

گھاس کے باریک تنکوں کو ہاتھ میں نرمی سے — پکڑ کر کھینچ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اسی پرانی والی رامین کا چہرہ لگ رہا تھا۔ جس کے لب خاموش اور آنکھیں ماتم کرتی نظر آتی تھیں۔ وہ پریشان ہے۔ حرا یہ سوچ کر اپنے آپ کو روک نہ سکی اور فوراً" اس کے پاس پہنچ گئی تھی۔ عین اس کے سامنے ہی وہ بھی گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی لیکن رامین نے اتنی ہلچل کے باوجود اس کی آمد کو محسوس نہیں کیا تھا۔

حرا نے اس کی انگلیوں کی جانب دیکھا جو مسلسل حرکت میں تھیں۔ وہ سبز گھاس کے سروں پر چند زرد سوکھے تنکوں کو چن چن کر اکھیڑ رہی تھی۔

"کیا کر رہی ہو؟" حرا نے پوچھا تو رامین نے یوں چونک کر اسے دیکھا کہ اسے یقین ہو گیا۔ وہ اب تک واقعی اس کی آمد سے بے خبر رہی تھی۔ وہ خاموش ٹکر ٹکر حرا کو دیکھنے لگی۔ حرا نے دوبارہ سوال کیا اور زیادہ نرم لہجے میں کہا۔

"میں نے پوچھا... کیا کر رہی ہو رامین؟"

"ہوں؟" وہ تنکے نوچنا چھوڑ کر سوچنے لگی کہ کیا جواب دے... وہ تو اپنے نکاح میں شامل مہمانوں کی صورتیں یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کیا سوچ رہی تھی' کیا یاد کر رہی تھی' حرا کی دلچسپی کا اس میں کوئی سامان نہ تھا۔ ہوتا بھی تو وہ یہ سب باتیں اس سے کہنا نہیں چاہتی تھی۔ کافی دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا۔

"یہ آپ دیکھیں... سبز گھاس کے تنکے سوکھ کر زرد ہو رہے ہیں... میں انہیں اکھاڑ رہی ہوں... بدنما لگتے ہیں نا۔"

حرا نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ مبہم سا مسکرائی' پھر کہا۔ "کچھ دن گھاس کو ٹھیک طرح سے پانی نہیں دیا نا۔ اس لیے سوکھ گئی ہے کچھ جگہوں سے... تمہیں انہیں اکھاڑنے کے بجائے وقت گزرنے کا انتظار کرنا چاہیے۔ دیکھنا! چند ماہ میں مناسب دیکھ بھال سے یہ شگوفے بڑھ جائیں گے تو زرد سوکھے تنکے اپنے آپ جھڑ جائیں گے۔"

"لیکن... پورا لان ان کی وجہ سے بدصورت لگ رہا ہے۔" اس نے گھاس میں انگلیاں ڈبو دیں۔

"نہیں رامین... دور سے دیکھنے پر تو یہ بالکل نظر نہیں آ رہے۔ تمہیں اس لیے دکھائی دے رہے ہیں۔ کیونکہ تم سرسبز گھاس کو چھوڑ کر صرف اور صرف ان زرد سوکھے تنکوں پر غور کر رہی ہو۔ ان پر توجہ مت دو... گھاس کو پانی دو اور بس وقت گزرنے کا انتظار کرو... چند ہفتوں بعد تم دیکھو گی تو یہ بدنما حصے تمہیں کہیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملیں گے۔"

جانے حرا کی بات کا رامین پر کیا اثر ہوا تھا' وہ گھاس سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھنے لگی۔ حرا نے اپنی بات جاری رکھی۔

"دیکھو رامین... زندگی کی مثال بھی اسی طرح ہے... ہم گزر جانے والے برے وقت کی تکلیف دہ یادوں پر بار بار توجہ دے کر زندگی کو بدصورت سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ وہ ہماری زندگی کا فقط ایک حصہ ہوتے ہیں' پوری زندگی نہیں اپنے زخموں کو بھرنے کا وقت دو... انہیں بار بار کھرچو مت... جو بھی ہوا' تم اسے بدل سکتی ہو' نہ ہی اپنی زندگی سے نکال سکتی ہو۔"

"مگر میں بھولنا چاہتی ہوں... میں اتنی کوشش کرتی ہوں آج میں جینے کی... پر وہ یادیں میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں میں کیا کروں۔" وہ اب حرا کے سامنے کھل کر بولنا شروع ہوئی تو حرا نے اسے کہنے دیا۔

"میں خوش ہونا چاہتی ہوں... پر یادیں میرا پیچھا نہیں چھوڑتیں... مجھے خوش نہیں ہونے دے رہیں... میں کیا کروں؟ میں چاہتی ہوں میرے ساتھ کچھ ایسا ہو جائے کہ میں سب کچھ بھول جاؤں۔ میں نے سوچا تھا ماما کے مرنے کے بعد..." اس کے گلے میں اٹکتے آنسوؤں کے گولے نے اس کی آواز بھاری کر دی' ایک گہری سانس لے کر اس نے اپنے آنسو اندر اتار لیے۔ "سوچا تھا ماما کے مرنے کے بعد میری زندگی بدل جائے گی۔ بھائی سے مل کر... یہاں آ کر میں سب کچھ بھول جاؤں گی... لیکن ایسا نہیں ہوا۔

میرا ذہن ہر گزری بات کو دن میں سو سو بار دہراتا ہے... کیوں؟" اس نے زچ ہو کر اپنے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ "ہمارے دماغ میں کوئی ڈیلیٹ بٹن کیوں نہیں ہوتا بھابھی۔"

"ہوتا ہے رامین..."

"میرے پاس تو نہیں ہے۔" اس نے بے بسی سے کہتے ہوئے سر جھکا لیا۔

"ہے... بس تم اسے دیکھ نہیں پا رہیں۔"

حرا اسے محبت سے' دلار سے سمجھاتی رہی۔ دلاسے دیتی رہی' اس کے پرخلوص رویے کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا اس پر اور اس نے تہیہ کر لیا۔ وہ آج کا پورا دن ہنس کر خوش رہ کر گزارے گی۔ آج کے اہم دن کو ایک نیا حوالہ دے گی۔ ایک نیا کام کرے گی جو اس نے پہلے نہ کیا ہو اور پھر... ہر آنے والے سال میں اس دن کو اسی حوالے سے یاد کرے گی۔

اپنی اسی حکمت عملی پر عمل کرتی وہ آج بالکل اکیلی ڈزنی لینڈ کا وزٹ کرنے آئی تھی۔

وہاں مہرز کو دیکھ کر اسے پہلے حیرت ہوئی' پھر شدید غصہ آیا تھا۔ اگر وہ خفا ہوئی تھی۔ کم از کم مہرز کو منانے کی کوشش تو کرنی چاہیے تھی۔ لیکن اس نے فون کیا نہ ہی کسی قسم کی وضاحت دی تھی۔ یوں اتفاقاً" سامنا ہو جانے پر بھی مہرز کا رویہ سرد مہری لیے ہوئے تھا۔ مگر اس کے ساتھ جو شخص موجود تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اس کے پاس آیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ شخص دوبارہ دوڑتے ہوئے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"رامین عبید۔" ایک اجنبی مرد کے منہ سے اپنا نام سن کر حیرت زدہ کھڑی تھی۔

"السلام علیکم رامین عبید! کیسے خیریت سے ہیں آپ؟" حسن' بے تکلفی کی انتہا پر پہنچا ہوا تھا۔

"آئم سوری' مگر میں آپ کو پہچان نہیں پا رہی ہوں... کیا آپ اپنا تعارف کروائیں گے۔" اس کا لہجہ محتاط تھا۔

"اتنی آسانی سے نہیں... جناب آپ کچھ محنت وغیرہ کریں' دماغ پر زور ڈالیں... اچھا ایسا کرتے ہیں آپ کو مہلت دیتے ہیں۔ اگر اس آخری شوکیس کے پاس پہنچنے تک آپ کو یاد آ گیا کہ میں کون ہوں؟ تو آپ جیت گئیں... ورنہ دوسری صورت میں آپ کو آئس کریم کھلانی پڑے گی۔"

"ایکسکیوزمی..." رامین نے آنکھیں سکیڑ کر حسن کو بے زاری سے دیکھا۔ "مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس قسم کی شرطوں میں۔ آپ اپنے دوست کے ساتھ اپنی سیر مکمل کریں اور گھر جائیں۔" اتنا کہہ کر وہ تیز قدموں سے سیڑھیاں اترنے لگی اور پھر مینار سے باہر نکل گئی۔

"ہو جی... یہ تو ناراض ہو گئیں۔" حسن کا منہ لٹک گیا۔ اس کی شکل دیکھ کر مہرز کو ہنسی آ گئی تھی۔

"سنیے... یہ میرا پاسپورٹ ہے۔ آپ چاہیں تو چیک کر سکتی ہیں... میرا نام حسن چوہدری ہے... میں آپ کے ساتھ اسکول میں تھا۔ مجھے معاف کر دیں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں نے داڑھی رکھ لی۔ یونیفارم بھی نہیں پہنا اور آپ سے پہچاننے کا مطالبہ کر دیا۔ آئس کریم بھی مانگ لی... آئندہ ایسے نہیں کروں گا... آپ..."

"حسن تم..." وہ جو اسے جھاڑنے کا پکا ارادہ کر چکی تھی۔ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے اسے ٹوک دیا۔ "پہلے نہیں بتا سکتے تھے اسٹوپڈ!"

"کیسی ہو؟" حسن اس کا خوشگوار موڈ دیکھ کر دوبارہ حال چال پوچھنے لگا۔

"میں ٹھیک ہوں اور تم... یہاں... کب آئے۔" مہرز نے تو ذکر ہی نہیں کیا تھا کہ تم سے کوئی رابطہ بھی ہے اس کا۔" حسن اور رامین نے بیک وقت مہرز کی جانب دیکھا جو چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ان کی گفتگو سینے پر ہاتھ باندھے سن رہا تھا۔ توجہ پا کر چلتا ہوا نزدیک آ گیا۔

"ویسے اب تو میں تمہیں ضرور آئس کریم کھلاؤں گی۔" رامین اپنے پرس سے پیسے نکالتے ہوئے بولی تھی۔ "لیکن لے کر تم آؤ گے... پے میں کروں گی۔ منظور..." رامین نے چند ڈالرز حسن کی طرف

بڑھائے تو وہ بدک کر پیچھے ہٹا۔ "مجھے تو معاف ہی رکھو۔"

"ارے۔۔۔ لادو نا۔۔۔ بھائی نہیں ہو؟" رامین کی ریکوئسٹ بے اثر رہی۔ حسن نے مہرز کو پکڑ کر آگے کردیا۔

"بالکل نہیں۔۔۔ میں نہیں جاؤں گا۔۔۔ تم ایسا کرو مہرز کو بھائی بنالو۔" اس سے پہلے کہ رامین کچھ کہتی' مہرز نے حسن کو ڈانٹ دیا۔۔۔ "شٹ اپ۔"

اس کا موڈ بگڑتا دیکھ کر حسن نے بات سنبھالنے کی غرض سے فوراً" ہی رامین کے ہاتھ سے پیسے لے لیے۔ "اچھا لاؤ دو۔۔۔ میں لے کر آتا ہوں۔۔۔ مہرز! تم کون سا فلیور لو گے؟"

"کافی لے آنا مہرز کے لیے۔" اس کے بجائے رامین نے جواب دیا تھا۔ حسن نے رامین کی پسند پوچھی تو مہرز نے کہا۔

"چاکلیٹ فلیور اور الگ سے کپ میں روسٹڈ آلمنڈز لے کر آنا۔" رامین چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ اچھے بچوں کی طرح سرہلاتا حسن آرڈر لے کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔

یوں اچانک ملاقات سے رامین کا موڈ ہشاش بشاش ہوگیا تھا۔ مسکراتے ہوئے اس نے پلٹ کر مہرز کو دیکھا' جو نہایت سنجیدہ صورت بنائے دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈال کر کھڑا اپنے جوتے دیکھ رہا تھا جس کی نوک زمین پر آڑی سیدھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ رامین کے مسکراتے لب سکڑنے لگے۔ آہستہ آہستہ چلتی وہ اس کے نزدیک آکھڑی ہوئی۔

"میری شکل کیا اتنی بری ہے کہ نظر اٹھا کر دیکھنا بھی نہیں چاہتے؟"

مہرز سنبھل کر سیدھا کھڑا ہوا۔ ایک گہری سانس لے کر رامین کے ناراض چہرے پر بھرپور نگاہ ڈالی اور کہا۔ "السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔۔۔ ویسے خدا حافظ کہنا بھی اتنا ہی آسان ہوتا ہے۔" رامین نے جواب دینے میں دیر نہیں لگائی اور نہ ہی جتانے میں تاخیر سے کام لیا۔ مہرز اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کی خاموشی نے رامین کو مزید تپا دیا۔

"مجھے تم سے یہ توقع ہرگز نہیں تھی۔ بہت ہرٹ کیا ہے تمہاری اس حرکت نے مجھے۔" اس کی آواز میں گہرا دکھ جاگزیں تھا۔

"آئم سوری۔۔۔" مہرز وہ کہہ گیا جو اس نے نہ کہنے کا ارادہ کیا تھا مگر اس میں کون سی نئی بات تھی۔ رامین یوں ہی اسے بے اختیار کردیا کرتی تھی۔ "مجھے تم سے مل کر واپس آنا چاہیے تھا۔ میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔"

"یہ تو تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ آج اتفاق سے میں تمہارے سامنے آئی ہوں۔ ورنہ اتنے دن گزرنے کے باوجود تمہیں خیال نہیں آیا تھا کہ تمہیں اپنے اس عمل کی وضاحت کرنی چاہیے۔ جبکہ تم جان چکے تھے کہ میں ناراض ہوں۔ تم نے مجھے کال بیک تک نہیں کی۔ اس کا صاف صاف مطلب تو یہی نکلتا ہے کہ تم یہ سب کچھ جان بوجھ کر کررہے تھے۔" نہایت نپے تلے انداز میں وہ اس کے گریز پر شکوہ کناں تھی۔

"میری میٹنگ تھی رامین۔۔۔ بہت مصروف تھا میں۔" مصالحت کی کمزور سی کوشش رامین کے طوفانی غصے نے ناکام بنادی۔

"میٹنگ ختم بھی ہوئی تھی مہرز! یا اب تک چل رہی ہے؟ تم صاف صاف کیوں نہیں کہتے' تم یہ دوستی توڑنا چاہتے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ یہی سمجھ لو۔" مہرز نے قطعی انداز میں اس کے شک کی تصدیق کردی۔

"میں کیوں سمجھوں؟ تم اپنے منہ سے ایک بار کہہ دو۔۔۔ دوبارہ شکل نہیں دکھاؤں گی تمہیں۔" وہ جھاگ کی طرح بیٹھی تھی۔

"میں ایکسکیوز کرتا ہوں تم ایکسیپٹ نہیں کرتیں۔ وضاحت کروں تمہیں یقین نہیں آتا۔ میں کیا کروں تم بتادو؟ میں تم سے دور جانا نہیں چاہتا' تمہیں اگنور نہیں کرسکتا' میں یہ دوستی ختم نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں؟ یہ واحد رشتہ ہے

جو میں زندگی بھر قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ ہرگز اس سے دستبردار نہیں ہوسکتا۔ چاہوں بھی تو بھی نہیں۔۔۔ یہ میرے بس میں نہیں ہے' بلیو می۔"

خود سے کیے تمام وعدے بھلا کر وہ رامین کے سامنے اپنی بے بسی کا اعتراف کر بیٹھا اور اس کے لہجے کی سچائی رامین کے ذہن و دل سے ہر بدگمانی یکمشت ختم کرگئی تھی۔ پر اس کا اداس مدھم لہجہ' شکست خوردہ انداز دیکھ کر وہ اس کے لیے پریشان ہوگئی۔

"آئی بلیو یو۔" اس نے فوراً" کہا' جو یقین دہانی اس نے مانگی تھی۔ مہرز دے چکا تھا۔

وہ زبردستی مسکرایا تھا۔ رامین اس کے اچھے موڈ کا اطمینان پاکر حسن کی طرف چل پڑی جو تین آئس کریم کونز کو یوں بمشکل اٹھا کر چل رہا تھا۔ جیسے ابھی گرادے گا۔ مہرز وہیں کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ایک بار پھر وہ اپنے آپ سے بری طرح ہارا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تابندہ آنٹی نے تو رامین کو زبردستی یہاں بٹھایا ہے۔۔۔ مگر تم یہاں کس خوشی میں فارغ بیٹھی ہو۔۔۔ جاؤ ہیلپ کراؤ آنٹی کی۔"

تابندہ کچن میں کبابوں کا مسالا تیار کررہی تھیں۔ رضا کے چہرے پر شرارت تھی۔ رامین اپنی مسکراہٹ دبا کر پھر سے مصروف ہوگئی تھی۔ مگر لیلٰی جھنجھلا گئی تھی۔

"ماما نے خود مجھے بھیجا ہے یہاں۔۔۔ مرچوں سے میرے ہاتھ جلتے ہیں۔ مسالا نہیں لگا سکتی میں۔"

"ارے ہاں۔۔۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔۔۔ بہت نازک ہیں تمہارے ہاتھ۔۔۔ لاؤ دکھاؤ ذرا۔۔۔"

اس نے فوراً" لیلٰی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس بے تکلفی کا خمیازہ بھی فوراً" ہی بھگتنا پڑ گیا۔ لیلٰی نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر زور سے مارا۔ "زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

مہرز اسی دم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ مسالا اچھی طرح مکس ہوگیا تھا۔ تابندہ ہاتھ دھونے کے لیے سنک کی طرف بڑھی تھیں کہ کچن کاؤنٹر پر رکھا ان کا ہینڈ بیگ گنگنانے لگا۔

"کوئی بچہ میرے ہینڈ بیگ سے موبائل نکال دے گا پلیز۔"

انہوں نے لاؤنج کی طرف منہ کرکے مدد کی درخواست کی۔ مہرز فوراً" آگے بڑھا اور ان کا ہینڈ بیگ اٹھا کر ان کے پاس لے آیا۔

"بیٹا! موبائل نکال دو' میرے ہاتھ مسالے والے ہورہے ہیں۔" مہرز نے جی کہہ کر ان کے بیگ سے فون نکال کر ان کے سامنے کیا تو وہ ہاتھوں پر صابن ملتے ملتے رامین سے مخاطب ہوئیں۔

"ارے رامین۔۔۔ تمہارے باڈی گارڈ کا فون ہے۔ دوپہر سے پچاس کالیں کرچکا ہے۔ خدا کے لیے اس سے بات کرلو' تاکہ تسلی ہوجائے کہ تم خیر خیریت سے ہو۔۔۔ پلیز بیٹا! یہ رامین کو دے دو۔"

انہوں نے آخری جملہ مہرز سے کہا تھا۔ اس نے خاموشی سے موبائل رامین کو پکڑا دیا۔ جو پہلے ہی خالہ کی بات سن کر صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اس کے ہاتھ سے فون پکڑتے ہی اس نے سیل فون کان سے لگالیا۔ جانے کیوں مہرز کا دل ڈوب سا گیا۔ رامین کے خوشی سے تمتماتے چہرے کو بغور دیکھتا وہ اس کی گفتگو بھی بے حد دھیان سے سن رہا تھا۔ جو یقیناً" کسی دل عزیز ہستی کے ساتھ جاری تھی۔ جسے وہ باربار اپنی خیریت کا یقین دلا رہی تھی۔

"جی ہاں۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" بے اختیار ہنستے ہوئے اس نے کہا۔ "آپ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اس لیے پریشان ہوجاتے ہیں۔ اب تسلی ہوگئی آپ کو؟ ہاں وہ میرے ہاتھ میں کیمرا تھا۔ اس لیے ہینڈ بیگ خالہ کے پاس چھوڑ دیا تھا۔

آئم سوری۔۔۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔۔۔ میں دھیان رکھوں گی۔۔۔ پلیز تھوڑا سا ہنس دیں۔" وہ بڑے لاڈ سے منا رہی تھی۔

"اب میری پرنس سے تو بات کروادیں۔" رامین فون پر اتنی مگن ہوچکی تھی کہ اسے کسی کے ہونے یا نہ ہونے کا بالکل احساس نہیں ہوا۔ دوسری طرف سے

سنائی دیتی چہکار اسے اندر تک سرشار کر گئی۔
"میری گڑیا۔ میرا بے بی۔ میری پرنسس کیسی ہو؟ آئی مس یو سوچ۔" اس نے شدت جذبات میں آکر فون پر ہی پیار بھیجا تھا۔

محبت کے اس والہانہ اظہار نے مہریز کو واپس حقیقت کی دنیا میں لا پٹخا تھا۔ وہ کیسے بھول گیا کہ رامین شادی شدہ ہے۔ اس کی ایک بیٹی ہے۔ وہ تو اسے دیکھ چکا تھا رامین کی گود میں۔ اس دن رضا کے گھر۔ پھر وہ کیسے بھول گیا؟

اپنے آپ پر افسوس کرتا وہ کیبن سے باہر آیا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے ایک نظر رامین کو دیکھا' جو ابھی تک فون پر مصروف تھی۔ وہ اس وقت بھی اس کی زندگی میں نہیں تھا۔ جب ہو سکتا تھا تو پھر آج کس طرح وہ اپنی جگہ بنا سکتا ہے۔ رامین کو تو شاید کبھی بھی اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ یہ خود اس کی چاہ تھی جو ہمیشہ اسے رامین کے قریب لے جاتی رہی۔

سیل فون پر آنے والے میسج نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔ کیبن سے بہت دور درختوں کے زرد پتوں کو کچلتا بے خیالی میں چلتا ہوں وہ ٹھٹک کر رکا اور جیب سے فون نکال کر میسج پڑھنے لگا۔ پیغام بھیجنے والے کو یقیناً" احساس نہیں تھا کہ اس نے مہریز پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ جواب بھیجتے ہی وہ تیز قدموں سے واپس ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ ماضی کے گرداب سے نکلنے کی واحد صورت یہی تھی کہ وہ بہتی ناؤ میں سوار ہو جائے۔ فی الوقت اسے فرار چاہیے تھا۔ بہانہ کوئی بھی ہوتا اسے دور جانا ہی تھا۔ سزا بھی دینا تھی خود کو۔ بے اختیار وہ رامین کے اس قدر نزدیک آگیا تھا۔ اسے خود سے شرمندگی تھی۔ ملال تھا' پچھتاوا تھا۔ غلطی اس کی تھی۔ سزا بھی اسے ہی ملنی چاہیے۔ یوں کسی سے کچھ کہے بغیر اس نے واپسی کا سفر اختیار کر لیا۔ حال میں واپسی کا۔

☆ ☆ ☆

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترک محبت کا بھروسا بھی نہیں
بھول جاتے ہیں کسی کو مگر ایسا بھی نہیں
یاد کرتے ہیں کسی کو' مگر اتنا بھی نہیں
ایک مدت سے تیری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں
سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترک محبت کا' بھروسا بھی نہیں

محض سات دن بعد رامین کو اپنے سامنے دیکھ کر خود سے کیے تمام عہد ریت کی دیوار ثابت ہوئے تھے۔ وہ اپنے آپ سے ہار گیا تھا۔ اپنی محبت سے ہار گیا تھا اور یہ شکست اسے ہمیشہ کی طرح سرخرو کر گئی۔ اسے اپنی محبت کی پائیداری پر فخر محسوس ہوا تھا۔

آج وہ جان گیا تھا رامین سے متعلق اس کے جذبے کبھی ماند نہیں پڑنے والے۔ چاہے کچھ حاصل ہو یا نہ ہو۔

وہ عمر بھر اسے اول روز کی طرح چاہے گا۔ وہ کبھی اس کا دل نہیں توڑ سکتا۔ اسے دکھی نہیں دیکھ سکتا۔ چاہے اس کے لیے وہ خود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے' ٹوٹ جائے' ختم ہو جائے' حسن سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی رامین کو محویت سے تکتے ہوئے وہ ادراک کی کئی منزلیں طے کرتا چلا گیا۔

چھوٹی اینٹوں سے بنے فرش کے کنارے پتھریلے فٹ پاتھ پر سازندے جاز کی دھن بجا رہے تھے۔ آوٹ ڈور ریسٹورنٹس سے آتی فرنچ کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو لوگوں کی بھوک میں اضافہ کرتی انہیں اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔ شام ڈھل رہی تھی اور ماحول کی رومانیت نہایت اثر انگیز تھی۔

مہریز نے لیمن ایڈ کے تین گلاس خریدے' تینوں اس سڑک کے آخری سرے پر موجود ایک قدیم طرز کی عمارت کے سامنے پہنچ گئے جس کے گیٹ کی ستون پر "ہاؤنٹڈ مینشن" کے الفاظ درج تھے۔

"یہ رائیڈ بہت خوف ناک ہے۔ ایسا کرو تم دونوں چلے جاؤ میں باہر ہی ویٹ کرتی ہوں۔"

"دونوں۔۔۔ اب ساتھ یہاں تک آگئی ہو تو اندر بھی چلو۔ اتنے سارے لوگ ہیں ڈرنے کی کیا بات ہے۔"

"اتنے سارے لوگوں کے ساتھ بھی ڈرتی ہو۔"

"اتنے سارے لوگ؟"

"تمہاری فیملی۔" مہریز کے حلق میں لیمن ایڈ اٹکنے لگا۔" "بھائی کے پاس اتنی فرصت تھوڑی ہوتی ہے کہ ہر جگہ ساتھ لے کر جائیں۔ ویسے میں اپنی بھابھی اور بھتیجی کے ساتھ ہی آتی ہوں ہمیشہ۔۔۔ بس آج اکیلی چلی آئی۔"

"میں تمہارے ہزبینڈ کی بات کر رہا تھا۔"

"تم زین کو کیسے جانتے ہو۔" اس نے دیکھا۔ وہ حیران بھی تھی اور متجسس بھی لیکن لہجہ کچھ پشیمان سا تھا۔

"میں نہیں جانتا۔" اس نے فوراً" کہا۔ "میو سیمپٹی میں تمہارے لیے فون آیا تھا نا۔ میں نے دیا تھا تمہیں۔"

"زین کا فون؟" اور پھر وہ ساری کہانی سمجھ گئی' مہریز کو غلط فہمی ہوئی تھی۔

"بھائی کا فون تھا۔ انہی کی بیٹی سے بات ہوئی تھی میری۔"

"اچھا۔۔۔ ویسے کیا کرتے ہیں تمہارے شوہر؟" مہریز نے پتا نہیں کہاں سے اتنی جرات اکٹھی کر لی یہ سوال کرنے کی۔

"میری شادی نہیں ہوئی۔" رامین سر جھکائے کیوکی طرف واپس آتے ہوئے بولی۔ اس کا سر مزید جھک گیا "صرف نکاح ہوا تھا۔ وہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ ڈیڑھ ہفتے بعد۔"

اس نے سنا اور وہیں ٹھہر گیا رامین نے ٹھٹک کر اس کا رکنا بھی محسوس کر لیا تھا۔ اسے انتظار رہا کہ مہریز کچھ کہے مگر وہ خاموش کھڑا اسے بس دیکھے جا رہا تھا۔

وہ کیا کہتا۔ اس کے اندر تو گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ کتنا رویا تھا وہ اس رات۔ اپنے رب کے آگے سر بسجود ہو کر کیسے گڑگڑا کر اس نے رامین کو اپنے لیے مانگا تھا۔ کتنی شدت سے اس نے چاہا تھا وہ شخص اسے چھوڑ کر چلا جائے۔ اور ایسا ہو گیا تھا۔ اس کی دعا قبول ہو گئی تھی۔ اور یہ اسے آج معلوم ہو رہا تھا۔ اتنے سالوں بعد۔

اتنے سارے دن گزر جانے کے بعد اسے پتا چل رہا تھا تو وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا محسوس کرے۔ رامین کے لیے افسوس کرے' جسے یہ دکھ اٹھانا پڑا۔ یا اپنے لیے خوشی محسوس کرے کہ اب وہ اسے پا سکتا ہے۔

"زین نے رخصتی سے پہلے ہی ڈائیورس دے دی تھی مجھے۔" رامین نے جیسے پہاڑ کو دھکیلا تھا۔ بہت تکلیف ہو رہی تھی اسے یہ سب کہنے میں۔

"کیوں۔۔۔ کیوں کیا اس نے ایسا؟"

وہ جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔ جواب دینے کے لیے اسے یاد کرنا پڑتا۔ ذہن میں ہر اذیت ناک لمحہ جس سے وہ گزر آئی تھی' پر شاید وہ تکلیف نہیں گزری تھی۔

آج کا دن وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ سو زبردستی مسکرا کر اس نے مہریز کے مقابل آتے ہوئے لاپروا انداز میں کہا۔ "میرا خیال ہے میں اسے اچھی نہیں لگتی تھی۔" اتنا کہہ کر وہ بلاوجہ ہنسے لگی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ مہریز اس کی روح میں جھانکنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ اس سے کچھ نہیں چھپا سکتی۔

"تم اسے اچھی نہیں لگتی تھیں؟" اس نے تم پر خاصا زور دیتے ہوئے تبصرہ کیا "اندھا تھا کیا؟"

"نہیں۔" ایک بار پھر بلاوجہ کی کھلکھلاہٹ۔ "اندھی تو میں ہوں۔ ایک آنکھ سے دکھائی نہیں دیتا مجھے۔ یہ دیکھو!" اس نے پنجوں کے بل اچک کر مہریز کو اپنی بائیں آنکھ پوری طرح کھول کر دکھانے کی کوشش کی۔

"مذاق مت کرو۔" مہریز خود ہی تھوڑا سا پیچھے ہو کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے۔ میں مذاق نہیں کر رہی۔ دیکھو! غور سے میری آنکھوں میں۔ تمہیں فرق پتا چلے گا۔" اسی وقت حسن نے مہریز کو ہاتھ ہلا کر اندر جاتی کیو میں واپس

آنے کے لیے آواز دی۔

"چلو۔" مہرز نے پہلے اسے آگے بڑھنے کے لیے کہا تو رامین نے بری سی شکل بنالی۔

"مجھے نہیں جانا نا۔ بس میں اس پاتھ سے گزر کر دوسری طرف سے نکل جاؤں گی۔ مینشن کے اندر نہیں جاؤں گی۔" وہ کسی بچے کی طرح ضد پر اڑ گئی تھی۔ مہرز نے بڑے اطمینان سے جیبوں میں ہاتھ ڈال کر زمین پر قدم جماتے ہوئے اسے وارننگ دی۔

"اگر تم ساتھ نہیں چلوگی تو میں بھی یہاں سے نہیں ہلوں گا سمجھیں!" وہ کچھ دیر تو اسے گھورتی رہی جیسے اس کی ثابت قدمی کا اندازہ کررہی ہو۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ وہ واقعی اکیلے نہیں جانے والا تو تھوڑا جھلاتے، مگر مسکراتے ہوئے وہ پیر پٹختی آگے جاتی کیو میں شامل ہوگئی۔

کیولین سے باہر آکر حسن، رامین اور مہرز کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے سامنے ہی چند ستونوں پر ان افراد کے Statue busts تھے جو مینشن میں پراسرار طور پر ہلاک ہوگئے تھے۔ ان ستونوں پر کندہ تحریر ان افراد کی موت کی وجہ عجیب پہیلی کی صورت میں ظاہر کررہی تھیں۔ وہ باری باری ہر ستون کو بغور دیکھتا زیر لب دہرا رہا تھا، انکل جیکب کے ستون پر لکھی آخر سطر۔

"Now try to diseover
Who killed who"

(یہ جاننے کی کوشش کریں، کس نے کس کو مارا؟) پڑھ کر وہ ٹھٹک گیا۔

"ایں۔ یہ کیا بات ہوئی؟" حسن، رامین کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اب ہمیں کیسے پتا چلے گا کس نے کس کو مارا؟"۔

"اندر ان تمام افراد کی روحیں گھوم رہی ہیں، ان سے پوچھ لینا۔ چلو چلو۔" رامین مزے سے کہتی آگے بڑھ گئی۔

گزرگاہ کے بیچ کھڑی چھوٹی سی دیوار کے چاروں اطراف میوزیکل۔ انسٹرومنٹس ریلیف نظر آرہے تھے۔

رامین اور حسن جس انسٹرومنٹ پر ہاتھ سے چھو ڈالتے وہ دھن بکھیرنے لگتا۔ چند منٹ تک وہ دونوں لطف اندوز ہوتے رہے۔

مینشن کے داخلی دروازے کو پار کرکے ایک ہشت پہلو کمرے میں داخل ہوگئے۔ جس کی دیواروں پر بڑی بڑی پورٹریٹس آویزاں تھیں۔ پورٹریٹس کے نیچے جلتی بجھتی لو سے مدھم روشنی پیدا کرتی موم بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ ان کے اندر پہنچتے ہی دروازہ بند ہوگیا اور ایک خوفناک آواز سنائی دی۔

"اس مینشن سے باہر جانے کے تمام راستے بند کیے جاچکے ہیں۔ نہ کوئی کھڑکی، نہ ہی دروازہ ہے۔"

اس کے بعد ایک زوردار قہقہہ کے ساتھ ہی کمرے میں اندھیرا ہوگیا۔ تمام روشنیاں یکدم بجھ گئیں۔ چھت غائب ہوئی اور بادلوں کی زبردست گڑگڑاہٹ کے ساتھ جیسے بجلی کوند گئی۔ اس پل بھر کی چمک میں اپنے سروں پر تمام لوگوں کو چھت سے ٹنگا ڈھانچہ نظر آیا اور کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی چیخ سنائی دی۔

"ہائے ای۔" حسن اچھل کر پاس کھڑے مہرز سے لپٹ گیا۔

مہرز بری طرح جھنجلایا اور اسے پرے ہٹا کر رامین کی طرف دیکھا۔ اسی وقت لائٹ واپس آگئی۔ مہرز نے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے کھڑی رامین کو مسکرا کر دیکھا۔ یقیناً" اس نے بہت پہلے ہی یہ حفاظتی اقدامات کرلیے تھے۔ وہ آنکھیں سختی سے بند کیے ہوئے تھی۔ تیز روشنی کے احساس ہونے پر اس نے پہلے ایک آنکھ کھول کر دیکھا، پھر دونوں آنکھیں کھول دیں۔ مہرز نے اس کے کان میں ٹھنسی انگلی کو پکڑ کر ہٹایا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کمرے کا دروازہ خود بخود کھل گیا اور سب لوگ ایک ایک کرکے مینشن میں داخل ہونے لگے۔

مہرز کے ہاتھ میں رامین کا لرزتا ہاتھ اس کے ڈر کو ظاہر کررہا تھا۔ اس نے ہلکا سا دباؤ بڑھاتے ہوئے اپنی گرفت مضبوط کی۔ گیلری کے باہر رائیڈ کے لیے ڈوم

بگیز ٹریک پر ایک لائن میں آگے آتی جارہی تھیں۔ جس میں بیک وقت دو ہی لوگ بیٹھ سکتے تھے۔ مہرز اور رامین ایک ساتھ بیٹھنے لگے تو حسن، چڑ کر مہرز کو اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بدلہ لینے کا ڈراوا دیتا ایک انگریز عورت کے ساتھ جاکر بیٹھ گیا۔

ڈوم بگی میں بیٹھتے ہوئے رامین نے آہستگی سے اپنا ہاتھ مہرز کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ اس بھوت کی آواز یہاں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ڈوم بگی گراؤنڈ فلور پر پہنچی جہاں بھوتوں کی برتھ ڈے پارٹی منائی جارہی تھی۔ ایک طویل ڈائننگ ٹیبل کے گرد چمکتی روحیں ناچتی گاتی، جن کے آرپار دیکھا جاسکتا تھا، خوشیاں منارہی تھیں۔

"شکر ہے انہوں نے ہمیں انوائٹ نہیں کیا۔" رامین نے جھرجھری لے کر مہرز سے کہا۔

"اگر کرلیتیں تو میں ضرور جاتا وہاں۔" مہرز نے میز کی طرف اشارہ کیا۔ "اور وہ جو سب سے حسین روح بیٹھی ہے کیک کے سامنے۔ اس کے ساتھ ڈانس کرتا۔"

"تو اب چلے جاؤ۔ انویٹیشن کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔" رامین نے جل کر جواب دیا اور وہ مسکرا کر سامنے دیکھنے لگا۔

ایک جھٹکا کھا کر ڈوم بگی قبرستان میں داخل ہوگئی۔ جہاں بے شمار قبروں کے گرد جھاڑ جھنکار بکھرا پڑا تھا۔ کریہہ صورت آسیب کتبوں کے پیچھے سے اچانک برآمد ہوتے۔ پھر ہوا میں تحلیل ہوجاتے۔ صدیوں پہلے مرنے والوں کو آج ہی قبر پھاڑنے کا خیال آیا تھا۔ ایک کے بعد ایک مردہ قہقہے لگاتا۔ گیت گاتا برآمد ہونے لگا۔ وہ ایک خاص پُراسراریت جو شروع سے اس بھوت بنگلہ کا ماحول اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔ پوری طرح بے نقاب ہوکر سب کو چیخنے پر مجبور کردیا تھا۔ بھوتوں کے ساتھ زندوں کی چیخیں گڈمڈ ہورہی تھی۔ مہرز تھوڑی تھوڑی دیر میں رامین کی خیریت کا اطمینان کرتا یا پھر اسے باتوں میں الجھا لیتا۔ مگر اچانک ہی اس نے کہا۔

"وہ دیکھو۔" مہرز نے رامین کی توجہ آئینوں کی طرف دلائی تو وہ جو ارادہ کیے بیٹھی تھی کہ ہرگز اس جانب نہیں دیکھے گی۔ مہرز کے کہنے پر بے دھیانی میں سامنے نظر ڈالی۔ آئینے میں ان دونوں کے عکس کے درمیان ایک Poltergiest بیٹھا ان کی حیرت کا مزا لے رہا تھا۔ رامین نے دانت پیستے ہوئے زور سے ایک دھمو کا رسید کیا، جو بھوت کو نہیں یقیناً" مہرز کے کندھے پر لگا تھا۔

رائیڈ کا اختتام ہوچکا تھا۔ مہرز نے اترنے میں رامین کی مدد کی۔ پھر اپنے پیچھے آنے والی بگی سے حسن کو نکلتے دیکھا۔ وہ بھی اترنے کے بعد ان کے ساتھ آکر کھڑا ہوگیا۔

"آپ لوگ بڑے خوش لگ رہے ہیں، رشتہ داروں سے ملاقات ہوگئی۔" اس نے دونوں کے مسکراتے چہروں کو دیکھ کر فقرہ کسا۔

"اتنی خوف ناک شکل کے رشتہ دار تمہارے ہی ہوسکتے ہیں۔" رامین نے جواب دینے میں دیر نہیں لگائی۔

مہرز نے اس کے برجستہ جملے سے خوب لطف لیا تھا۔

"تم اتنے تھوڑے سے دنوں کے لیے آئے ہو۔ اب اگلی بار چکر لگاؤ تو پوری فیملی کے ساتھ آنا۔" رامین حسن سے باتیں کرتی آگے بڑھتی رہی۔ "اب دوبارہ کب آنا ہوگا۔"

مہرز نے تو آئی پوڈ سننا شروع کیا۔ اس کے کانوں میں ائیرفون لگے تھے۔ حسن نے ایک نظر اسے دیکھا۔

"ان موصوف سے کہو شادی کرلیں۔ اس کی شادی پر میں ضرور آؤں گا۔" رامین نے مسکرا کر مہرز کی طرف دیکھا جو ان دونوں کی گفتگو سے بے نیاز گانا سننے میں مصروف تھا۔ اس نے چڑ کر اس کا ائیرفون کھینچا۔

"چھوڑو اسے۔ باتیں کرو ہم سے۔ کون سے گانے سن رہے ہو؟" مہرز کے جواب دینے سے قبل وہ ائیرفون اپنے کانوں میں لگاچکی تھی۔

”جلیبی بائی؟“ رامین کو پہلے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ”مہرز۔۔۔ تم ایسے گانے بھی سنتے ہو؟“ پھر وہ ہنس پڑی۔ اس کے سوال پر مہرز نے بوکھلا کر حسن کی طرف دیکھا‘ کیونکہ آئی پوڈ اس کا تھا‘ بجائے وضاحت کرنے کے حسن بھی اسے لتاڑنے لگا۔

”شرم آنی چاہیے مہرز تمہیں۔۔۔ بھلا یہ گانا ہے شریفوں کے سننے والا۔۔۔“ اس کی بات رامین کی بے ساختہ ہنسی میں دب کر رہ گئی۔ اس طرح کھل کر ہنستی ہوئی وہ مہرز کو بہت اچھی لگی۔ اتنی اچھی کہ مہرز نے خود بھی کسی قسم کی وضاحت دینے کا ارادہ ترک کر دیا۔ غلط فہمی ہی سہی۔۔۔ پر اس کی ہنسی رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

”آج مجھے اتنا مزا آیا ہے‘ میں بتا نہیں سکتی۔ کاش آنے والا ہر دن اسی طرح گزرے۔“ وہ حسرت آمیز لہجے میں اپنی خوشیوں کے دائمی ہونے کی خواہش مند تھی۔

”یہ تو تم پر منحصر ہے۔“ مہرز مسکرایا۔ ”اگر تم چاہو تو ہر دن اسی طرح بھرپور طریقے سے گزار سکتی ہو۔“

”یہ اتنا آسان تھوڑی ہے۔“ اس نے سر جھٹک کر جیسے افسوس کا اظہار کیا۔ ”ہم تینوں ہر روز تو یہاں اکٹھے نہیں ہوسکتے نا۔“

حسن کی بات یاد آتے ہی اس کے لب مسکرانے لگے۔

”حسن کہہ رہا تھا مہرز سے کہو‘ شادی کر لے۔ اس کی شادی پر ضرور آؤں گا میں۔۔۔ پوری فیملی کے ساتھ۔۔۔“

مہرز نے ایک لمحے کے لیے بھی رامین پر سے نظریں ہٹائی نہیں تھیں اور پھر اس نے کچھ ایسا کہا کہ وہ چونک کر اس کی جانب دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔

”سوری کیا کہا تم نے۔۔۔ میں نے سنا نہیں۔“ وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”میں کہہ رہا ہوں کہ میں اسے واپس نہیں جانے دوں گا۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ میں شادی کر رہا ہوں۔۔۔ بہت جلد۔“

”اوہ رئیلی!“ رامین کی ایک دم سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کہے۔ مہرز نے اچانک ہی اس کے سر پر جیسے بم پھوڑا تھا۔

”ہاں۔۔۔“ مہرز کا اطمینان قابل دید تھا۔ جیسے ساری تیاریاں مکمل ہو چکی ہوں۔

”اور تم نے ہمیں بتایا بھی نہیں۔۔۔ حسن کو بھی معلوم نہیں۔ ورنہ وہ مجھ سے نہ کہتا کہ تمہیں شادی کے لیے رضامند کروں۔“ مہرز نے ایک بھرپور بدن کو بھر لینے والی سانس بھری اور ہاتھوں کو سینے پر باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے رامین کا ردعمل دیکھ کر مزا آیا تھا۔

”چلو اچھا ہے۔۔۔ میں نے یہاں کوئی شادی اٹینڈ نہیں کی اب تک۔۔۔ پتا نہیں یہاں رسمیں وغیرہ کیسی ہوتی ہیں۔ ویسے تم نے کیا سوچا ہے۔ پاکستانی اسٹائل میں شادی کرو گے یا امریکن؟“

”بھئی لڑکی پاکستانی ہے تو شادی بھی اسی طرح کروں گا۔“ رامین کو یہ بات سن کر ہنسی آگئی۔

”یعنی تم۔۔۔“ اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں انگلی سے مہرز کی طرف اشارہ کیا۔ ”گولڈن شیروانی اور سہرے کے ساتھ۔۔۔ ڈالر کے نوٹوں کا بڑا سا ہار پہن کر۔۔۔ سفید گھوڑی پہ سوار ہو کر دلہن بیاہنے جاؤ گے؟“

مہرز اسی طرح آگے بڑھ کر رامین کے قریب آیا۔ ”تم بتاؤ تمہیں کیا پسند ہے۔ سفید گھوڑی یا بلیک سپورٹس کار؟“

”یہ تو اپنی ہونے والی دلہن سے پوچھو۔۔۔ میں کیا بتاؤں؟“ انتہائی غیر محسوس انداز میں وہ الٹے قدموں تھوڑا سا پیچھے ہٹی تھی۔ مہرز دو قدم اور آگے بڑھ کر دوبارہ اس کے بالکل نزدیک آگیا۔

”اسی سے تو پوچھا ہے۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں رامین!“

رامین نے سنے تھے بالکل صاف اور واضح طور پہ۔

وہ ایک ایک لفظ جو مہرز کی زبان سے ادا ہوئے۔ مشکل تھی میں تمہیں‘ یقین کرنے میں ہو رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ سمٹ کر معدوم ہوتی چلی گئی۔

”کیا کہہ رہے ہو مہرز؟“ اس نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے مہرز کی جانب یوں دیکھا جیسے اسے اپنے الفاظ واپس لینے کی تنبیہہ کر رہی ہو۔

”تمہیں برا لگا؟“

”تمہارے منہ سے یہ بات سن کر واقعی بہت برا لگا۔“ مہرز کے لیے اس کا یہ ردعمل قطعی غیر متوقع تھا۔

”تم ابھی شادی نہیں کرنا چاہتیں۔۔۔ یا مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں؟“

”میں کبھی بھی۔۔۔ کسی سے بھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ مضبوط لہجے میں دوٹوک جواب دیتے ہوئے اسے بس ایک لمحہ لگا تھا۔

”بہت سال پہلے میں اس تجربے سے گزر چکی ہوں اور وہ ہرگز ایسا خوشگوار نہیں تھا کہ میں اسے بار بار دہراتی رہوں۔ میں آج جہاں ہوں‘ جیسی ہوں جس حال میں ہوں مطمئن ہوں۔“

”تم میرے ساتھ خوش رہو گی رامین!“

”مگر تم میرے ساتھ خوش نہیں رہو گے مہرز۔۔۔ میں تمہاری توقعات پر پوری نہیں اتر سکوں گی۔“

”کیسی توقعات؟ مجھے صرف تمہارا ساتھ چاہیے‘ تم جیسی ہو‘ مجھے اچھی لگتی ہو‘ میں تمہیں بدلنا نہیں چاہتا۔“

”یہ تو تم ابھی کہہ رہے ہو نا۔۔۔ جب میں تمہاری بیوی بن جاؤں گی۔۔۔ تب تمہیں میری خامیاں نظر آئیں گی۔ میں نارمل لڑکی نہیں ہوں۔ زین نے اسی لیے ڈائیورس دی تھی مجھے۔“ پہلے جو اس کی بات پر خفگی کا اظہار کر رہی تھی۔ اب اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش میں تھی۔ وہ بیک وقت رحم کی بھیک مانگ رہی تھی اور دھتکار بھی رہی تھی۔ مہرز نے آگے بڑھ کر اسے بازوؤں سے تھام لیا۔

”تم بھول کیوں نہیں جاتیں اسے۔۔۔ ایک تلخ تجربے کی بنیاد پر اپنی آئندہ زندگی خوشیوں سے خالی کر لینا کہاں کی عقل مندی ہے رامین! بھول جاؤ اپنا ماضی۔“

وہ اسے بہت پیار سے سمجھا رہا تھا۔ جبکہ رامین اس کی مضبوط گرفت کے باوجود خود کو ٹوٹتا پھوٹتا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے مہرز کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ اپنے آنسوؤں کو آنکھوں سے بہنے سے روک لیا تھا اس نے۔۔۔ مگر وہ نمی آواز میں اتر آئی۔

”مہرز۔۔۔ مجھے مجبور مت کرو۔۔۔ اس اندھے کنویں میں دوبارہ کودنے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔۔۔ میرے لیے سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔“

”کچھ ختم نہیں ہوا ہے۔۔۔ تمہارے سامنے پوری زندگی پڑی ہے ابھی۔۔۔ میرا بھروسا کرو رامین! میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔“

”میں نے تمہیں زین کے بارے میں اس لیے بتایا تھا کہ تم ترس کھا کر مجھے پروپوز کر دو؟“

”میں تم پر ترس کیوں کھاؤں گا؟“

”کیونکہ تم نے ہمیشہ ایسا ہی کیا ہے۔۔۔ میری ہر اچھی بری بات کو سپورٹ کیا ہے۔ میری خوشی کے لیے خود کو لیٹ ڈاؤن کیا ہے۔۔۔ اور آج بھی تم یہی کر رہے ہو۔۔۔ مجھ سے ہمدردی رکھتے ہو۔۔۔ مگر اس کے لیے اپنی لائف برباد مت کرو۔“

”یہ۔۔۔ محبت بھی تو ہو سکتی ہے۔“

”پلیز۔۔۔“ رامین نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کیا۔ ”میں اسے محبت نہیں مان سکتی۔“ اسے غصہ آنے لگا تھا۔

”مت مانو۔۔۔ وقت خود ثابت کرے گا۔ مگر یہ بات اپنے ذہن سے نکال دو کہ زین کا تمہاری زندگی سے چلے جانا کوئی سانحہ تھا۔۔۔ جو بھی ہوا۔۔۔ اچھے کے لیے ہوا ہے۔۔۔ تمہیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ اس کے بغیر تم زیادہ خوش ہو۔۔۔ میں بہت خوش ہوں کہ اس نے تمہیں چھوڑ دیا۔۔۔ میں نے چاہا تھا ایسا ہو جائے۔“

”تم چاہتے تھے کہ زین مجھے چھوڑ دے؟“ رامین نے آہستگی سے اس کے ہاتھ اپنے بازوؤں پر سے

ہٹائے اور پیچھے ہٹ گئی۔

"میں تمہارے گھر آیا تھا رامین... میں نے زین کو دیکھا تھا مارکیٹ میں تمہارے ساتھ۔ تب میں نے... میں نے اللہ سے تمہیں مانگا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم میرے سوا کسی اور کی ہو کر رہو۔ میں نے دعا کی تھی' وہ تمہیں چھوڑ کر چلا جائے اور تم میری ہو جاؤ۔"

کتنے برسوں کی چاہت... اور کتنا کم وقت ملا تھا اظہار کے لیے۔ پھر بھی اس نے پوری کوشش کی تھی۔ کہ وہ رامین کو اپنی محبت کا یقین دلا سکے... مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔

"میں ہمیشہ تمہیں اپنا خیر خواہ سمجھتی آئی تھی... مگر مجھے نہیں معلوم تھا تم اس طرح مجھے تباہ کرو گے... تمہاری بددعا نے میری زندگی برباد کر دی... میرے بابا ختم ہو گئے... انہیں آخری بار دیکھ بھی نہیں پائی میں... وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے... تم نہیں جانتے میری ماما نے میرے ساتھ کیا' کیا... تم ان خود غرض انسانوں میں سے ایک ہو... جو اپنی خوشی حاصل کرنے کی دعا میں مانگ کر دوسروں کو زندہ درگور کر دیتے ہیں... تم میرا درد کبھی نہیں سمجھ سکتے... وہ تکلیف کبھی محسوس نہیں کر سکتے جو میں نے سہی۔" ہر درد' ہر دکھ دوبارہ 'زندہ ہو چکا تھا' وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

"میں سمجھ سکتا ہوں۔" یقین دلانے کے لیے بدگمانی کے جانے اور کتنے کڑے امتحانوں سے گزرنا تھا اسے۔

"تم نہیں سمجھ سکتے۔" وہ ہسٹریائی ہو رہی تھی۔ "تمہیں نہیں معلوم جب سر سے خون بہتا ہے تو کتنا درد ہوتا ہے... اور... زخم دینے والے ہاتھ اپنے ہوں تو آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں..." اپنے آنسوؤں کے پار اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"میری بات سنو رامین!" مہرز نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر اس نے بے رحمی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"میں کچھ نہیں سننا چاہتی... تم یہاں سے چلے جاؤ۔ آئندہ مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔"

رامین نے بار بار دلاسا دیتے مہرز کو زور سے پیچھے دھکیلا... آنکھوں سے آنسو جھٹک کر ہتھیلی سے صاف کیے اور فوراً" تیز قدموں سے چلتی دور چلی گئی۔ وہ اسے روک نہیں سکتا تھا۔ جب وہ ناراض ہوتی تھی تو کوئی بھی عذر یا وضاحت قبول نہیں کرتی تھی اور آج تو وہ ہر رشتہ ہر تعلق توڑ کر جا رہی تھی۔ وہ کس حیثیت سے اسے روکتا... کیا کہتا؟

ڈزنی لینڈ کے گیٹ سے باہر پارکنگ میں کھڑی اپنی کار کا دروازہ کھولتے' اسے اسٹارٹ کر کے مین سڑک پر لاتے ہوئے وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پا چکی تھی۔ گھر نزدیک ہی تھا۔ پھر بھی اسے بے حد احتیاط سے ڈرائیو کرنا تھا زندہ سلامت اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے۔ شام پھیل چکی تھی... اندھیرا بڑھنے لگا تھا... لمحہ بہ لمحہ۔

☼ ☼ ☼

نیند تو جیسے کمرے سے باہر ہی رہ گئی تھی۔ بستر پر پندرہ منٹ سختی سے آنکھیں بند کر رکھنے کے باوجود وہ سو نہیں پائی تو جھنجلا کر اٹھ بیٹھی۔ لیمپ آن کیا' کتاب اٹھائی اور صفحے پلٹنے لگی۔ پڑھنے کی کوشش کی تو ایک لفظ سمجھ نہیں آیا۔ ہر تحریر اپنا مفہوم کھو چکی تھی۔ غصے میں اس نے کتاب اچھال دی جو ہلکی سی دھپ کے ساتھ بستر پر جا گری۔ بستر سے اتر کر پیروں میں سلیپرز گھسیٹتی وہ اپنے ڈیک کے پاس آئی اور اسے آن کر دیا۔ آواز نہایت کم رکھتے ہوئے وہ فلور کشن پر وہیں بیٹھ گئی۔ گانا بیچ میں سے ہی کہیں شروع ہوا۔

No summers high
No warm july
No harvest moon to
Light one tender
august night
No autumn breeze
No falling leaves

بستر پر پڑا اس کا موبائل گنگنایا تھا۔ اس نے کشن سے اٹھ کر اپنا فون اٹھایا اور کال ریسیو کر لی۔ ابھی ہیلو کہا تھا کہ دوسری طرف سے التجا سنائی دی۔

"پلیز رامین! فون بند مت کرنا... تم سن رہی ہونا۔" وہ مہرز تھا۔

"بولو..." حتی الامکان اپنی آواز اور لہجہ بے تاثر سپاٹ رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"میں جانتا ہوں' تم نے منع کیا تھا۔ لیکن یہ بات کہے بغیر... میں مرنا نہیں چاہتا۔" وہ سانس روکے سننے لگی۔ "میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں رامین آئی لو یو۔"

اور کال منقطع ہو گئی۔ رامین بے چین ہو کر ہیلو ہیلو کرتی رہی۔ مگر دوسری طرف انگیج ٹون کے علاوہ کوئی آواز نہیں تھی۔ اس نے فون اپنی نگاہوں کے سامنے لا کر نمبر دیکھا اور ری ڈائل کر دیا۔ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا وہ اسے فون کیوں ملا رہی ہے... وہ تو کبھی اس کی شکل نہ دیکھنے کا تہیہ کر چکی تھی' کبھی بات نہ کرنے کی قسم کھائے بیٹھی تھی تو پھر اب؟ کال مل نہیں سکی تھی۔ انگیج ٹون کی آواز تھی اور بس... ہاں... کمرے میں Stieve Wonders کی آواز ضرور تھی۔

Not even time for birds
to fly to southern skies
I just called to say
I love you...
and i mean it
from the bottom
of my heart

دل پگھل رہا تھا... عجیب انداز سے... وہ بے اختیار ہو رہی تھی... جبکہ وہ نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے خود اپنے آپ سے ہی لڑتے چلے جا رہی تھی مگر اس کا دل ہر دلیل کو مسترد کرتا ایک ہی گردان کیے جا رہا تھا۔

"مہرز اتنے برے سلوک کا مستحق ہرگز نہیں تھا۔"

ٹھیک ہے... وہ شادی نہیں کرنا چاہتی... یہ بھی ٹھیک ہے کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتی... لیکن... کم از کم وہ آرام سے اس کی بات تو سن سکتی تھی۔ تھوڑے سے تحمل کا مظاہرہ کر سکتی تھی۔ اس کے ساتھ جو بھی ہوا تھا۔ زین سے علیحدگی' پاپا کی ڈیتھ' ماما کا تشدد اور بھائی سے جدائی... ان سب میں مہرز کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ مانتی نہ مانتی' صبح کے ڈپریشن نے نکاس کا غلط راستہ اختیار کیا تھا۔ اس کی بھڑاس غلط انسان پر نکلی تھی۔

☼ ☼ ☼

پھر کسی پیاس کے صحرا میں مجھے نیند آئی
اور میں خواب میں ڈھونڈوں تجھے پانی کی طرح

وہ "سراب" تھا۔ چمکتا رہتا ہے جسے پیاسا دور سے دیکھے... تو پانی سمجھے... اس نے بھی یہی غلطی کی تھی... انتہائی مایوسی کے عالم میں وہ تھک ہار کر وہیں بیٹھ گئی... کھولتی ریت اس کا بدن جھلسائے دے رہی تھی... پر اب اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ آگے جانا اس کے بس میں نہیں تھا... وہ اور نہیں چل سکتی تھی۔

تب ہی کسی نے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ سر اٹھا کر دیکھا تو کچھ اجنبی چہرے اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے... جن کے سایوں کی وجہ سے سر پر پڑتی تیز دھوپ کا رستہ رک گیا تھا... وہ ٹکر ٹکر سب کے چہرے دیکھنے لگی۔ ان میں سے کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا... وہ سب آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔

پھر... ایک ایک کر کے وہ سب ہٹتے چلے گئے... وہ پریشان سی ادھر ادھر دیکھتی اٹھ کھڑی ہوئی... اب وہ پھر اکیلی تھی۔ اس نے دوبارہ آسمان کی طرف دیکھا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

"میرے مالک مجھے سیراب کر دے۔"

گڑگڑا کر دعا مانگنے کے بعد جیسے ہی اپنے ہاتھ نیچے کیے سامنے ایک شخص دکھائی دیا۔ جس نے دونوں ہاتھوں سے خوش نما رنگوں سے مزین پیالا تھاما ہوا تھا۔ اس شخص نے خود آگے بڑھ کر پیالہ اس کے سامنے

پیش کردیا۔

اس کے ہونٹ تر ہو چکے تھے۔ زبان پر ٹھنڈے میٹھے پانی کا ذائقہ تھا اور جیسے جیسے سوکھا حلق سیراب ہو رہا تھا اس کے ہاتھ پاؤں میں جان آتی جا رہی تھی۔ اس نے احسان مندی سے اس شخص کی جانب دیکھا جو پہلے ہی اسے نہایت محبت سے تک رہا تھا۔ اس کی پیاس بجھ گئی تو پیالا ہونٹوں سے جدا کردیا۔ جانے کتنی دیر سے وہ پانی پی رہی تھی مگر وہ پیالا ہنوز پانی سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ وہ حیران ہوئی۔ اسی دم آسمان سے بارش برسنے لگی۔ ہلکی ہلکی بارش۔۔۔ اس کی رگ و پے میں سکون اترنے لگا۔

"رامین۔۔۔" کسی نے اس کا نام پکارا تھا۔ سرعت سے پلٹتے ہوئے اس شخص کو دیکھا تو خوف سے رامین کی جان نکل گئی۔ وہ مہربان۔۔۔ چہرہ سرخ خون سے تر بتر تھا۔

بارش کا قطرہ اچھل کر اس کی آنکھ میں گرا۔۔۔ اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ فوراً" اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اپنا لیمپ جلا کر اس نے ٹائم دیکھا' صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ تو یہ خواب تھا۔ گھڑی دیکھ کر اس نے ایک طویل گہری سانس لی۔ عجیب سی خوشبو اور خنکی تھی کمرے میں۔۔۔

اس طویل خواب کو ذہن میں دہراتے ہوئے وہ دوبارہ تکیے پر سر رکھ کے لیٹ گئی۔ یہ خواب اسے پہلے بھی ایک بار دکھائی دیا تھا؟ ماما کی وفات سے پہلے اور اب دوبارہ نظر آیا ہے۔ وہ شخص۔۔۔ کون تھا؟ ایک گہری سانس لے کر اس نے آنکھیں بند کرلیں اور کوشش کر کے اس کا چہرہ یاد کرنے لگی اور پھر چشم تصور میں اس شخص کا چہرہ نظر آتے ہی وہ لرز کر رہ گئی۔۔۔ وہ اسے اچھی طرح جانتی تھی۔

خون میں تر بتر چہرہ۔۔۔ مہرز کا تھا۔

☼ ☼ ☼

فری وے پر سب ہی گاڑیاں بہت تیز رفتار تھیں۔ اس کی اسپورٹس کار بھی تیزی سے ہر گاڑی کو پیچھے چھوڑتی آگے بڑھ رہی تھی لیکن اس کا ذہن پیچھے کی طرف دوڑ رہا تھا۔ وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر کار کی رفتار تھوڑی اور بڑھا دی۔ وہ آواز اس کے ارد گرد ہر طرف گونج رہی تھی۔

"تمہاری بددعا نے میری زندگی برباد کردی۔" جال دیتی' شکوہ کرتی آواز۔۔۔ مہرز نے ایک گاڑی کو اوور ٹیک کیا' پر دل جہاں رکا تھا' وہاں سے ایک انچ آگے نہیں بڑھا تھا۔

"تم میرا درد کبھی نہیں سمجھ سکتے۔۔۔ وہ تکلیف کبھی محسوس نہیں کرسکتے جو میں نے کی ہے۔"

اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ سر جھٹک کر اس نے آنسوؤں کو آنکھ سے باہر نکالا۔۔۔ ہاتھ اسٹیئرنگ سے ہٹا تا تو کار بے قابو ہو سکتی تھی۔ وہ اپنی کار اور اپنے آپ پر قابو پانے کی بھرپور جدوجہد کر رہا تھا۔ کار تو کنٹرول میں تھی مگر وہ خود۔۔۔

"تم یہاں سے چلے جاؤ۔ آئندہ مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔"

مہرز نے رفتار اور بڑھا دی۔۔۔ اپنے اور اس کے درمیان فاصلہ بھی بڑھا دیا۔ اس کا شہر بہت بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ پر اس کا خیال پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ وہ اس کی ہر بات مانتا آیا تھا۔ یہ بھی مان رہا تھا۔ وہ اس سے دور جانا چاہتی تھی۔ وہ دور جا رہا تھا۔ وہ کبھی اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ ملاقات کا ہر امکان ختم کر رہا تھا۔ مگر ایک کسک دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔ کیا رامین کو کبھی معلوم ہو سکے گا کہ وہ اسے دیوانوں کی طرح چاہتا رہا ہے جو وہ کہنا چاہتا تھا' اس کا موقع تو آج بھی نہیں ملا تھا۔

اس نے اپنا سیل فون اٹھایا اور رامین کا نمبر ملایا۔ اسی وقت ایک سرخ کار نے اسے اوور ٹیک کیا۔ مہرز نے ہارن پہ ہاتھ رکھا' اسے بجایا' مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

رامین نے ہیلو کہا۔ مہرز کو ڈر تھا۔ وہ اس کی آواز سنتے ہی فون بند کردے گی۔ اس لیے پہلی بات کی گئی تھی اس نے۔۔۔ شکر ہے رامین اس کی بات سننے کے لیے رضامند ہو گئی تھی۔۔۔ اور پھر مہرز نے کہہ دیا۔ حالانکہ وہ اس طرح یہ اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔۔۔ اور یہی اس نے کبھی یہ سوچا تھا کہ محبت کے اعتراف کے بعد وہ کبھی اس سے مل نہیں پائے گا۔ اسے دیکھ نہیں پائے گا۔

شام کو رامین کی سنگت میں گزارے گئے وہ چند گھنٹے ہر خوف' ہر اندیشے سے پاک تھے۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنی محبت کو حاصل کرنا ممکن نظر آرہا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا اس خواہش کا اظہار ہی رامین کو ہمیشہ کے لیے اس سے دور لے جائے گا۔ دو فقروں میں اپنی بات کہہ کر مہرز نے فون منقطع کر کے سیٹ پر اچھال دیا۔ وہ رامین کا نفرت بھرا جواب سننا نہیں چاہتا تھا۔۔۔ ورنہ اسی لمحے مر جاتا۔۔۔

سرخ کار ابھی تک اسے آگے نکلنے سے روکے ہوئے تھی۔ غصے میں جبڑے بھینچ کر اس نے ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھتے ہوئے اس کار کو دائیں جانب سے اوور ٹیک کرنے کا ارادہ کیا۔ اس لمحے اپنی لین تبدیل کرنے سے پہلے اسے انڈیکیٹر دینے کا خیال نہیں آیا تھا۔ اس لین میں تیز رفتاری سے آتے ٹرک نے ہارن بجا کر اسے خبردار کیا تھا۔ مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس اسپورٹس کار کو زد میں آنے سے بچانے کے لیے اس نے پورا اسٹیئرنگ گھما لیا' اس کے باوجود ایک دھماکے کے ساتھ ٹرک نے کار کو ٹکر ماری تھی۔

مہرز کی اسپورٹس کار وہ ٹکر برداشت نہیں کرپائی اور بیچ سڑک پر لہرا کر اپنا توازن کھوتی ہوئی الٹ گئی۔ ونڈ اسکرین کرچی کرچی ہو کر اس کے پورے جسم سے لپٹ گئی تھی۔ اگر سیٹ بیلٹ نہ بندھی ہوتی تو اسٹیئرنگ وہیل اس کے سینے کو توڑ ڈالتا۔

اس کی گردن میں زبردست جھٹکے لگ رہے تھے۔ کار الٹنے کے باوجود رکی نہیں' بلکہ سڑک پر گھسٹتی جا رہی تھی۔ پھر ایک جھٹکے سے اس کے پورے جسم کا بوجھ بائیں طرف منتقل ہو گیا۔ کار اپنے بائیں حصے پر الٹ کر آخر کار رک ہی گئی۔ پیچھے تمام گاڑیاں رک گئی تھیں۔۔۔ بھری پری سڑک پر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو رہا تھا۔ مسلسل ہارن بج رہے تھے۔ لوگ چیخ رہے تھے۔ اسے پکار رہے تھے۔ لیکن وہ انہیں دیکھ سکتا تھا نہ سن سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا اپنا خون بہہ رہا تھا۔

"تمہیں نہیں معلوم جب سر سے خون بہتا ہے تو کتنا درد ہوتا ہے۔"

اسے درد ہو رہا تھا اور بہت درد ہو رہا تھا' وہ جان گیا تھا۔

"اور زخم دینے والے ہاتھ اپنے ہوں تو آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔"

اس نے اندھی ہوتی آنکھوں کو کھلا رکھنے کی ناکام سی کوشش کی۔۔۔ دوڑتے قدم' اجنبی چہرے۔۔۔ اس کے لیے پریشان تھے۔ سڑک پر اوندھی پڑی کار میں لہولہان مہرز کو یقین ہو گیا۔۔۔ وہ مر رہا ہے۔ اس کے حواس معطل ہو رہے تھے۔

زندگی ساتھ چھوڑ رہی تھی۔

"میرے مرنے کے بعد۔۔۔ کیا وہ مجھے دیکھنے آئے گی؟"

ذہن تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ بند ہوتی آنکھوں نے دنیا سے منہ موڑ لیا تھا۔

آخری خیال یہی آیا تھا۔ "کیا وہ آئے گی؟"

☼ ☼ ☼

کار سیٹ کی پشت پر سر ٹکائے وہ آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔

"اتنی چپ چپ کیوں ہو گڑیا؟" مہ جبیں نے سڑک پر نظریں جمائے ہوئے اس سے پیار سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ بس ایسے ہی۔۔۔ تھک گئی ہوں شاید۔" وہ بدقت مسکرائی۔

"تمہاری خاموشی کی وجہ سے آج مجھے یہ راستہ بہت لمبا لگ رہا ہے۔" انہوں نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

"اب تو پہنچ گئے ہیں نابیکرز فیلڈ۔ تھوڑی دیر میں

آپ کا گھر آہی جائے گا۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن پہلے میں فیول بھروالوں۔۔۔" انہوں نے گاڑی گیس اسٹیشن کے احاطے میں لے جاتے ہوئے کہا۔ کچھ پیسے لے کر رامین گاڑی سے اتری اور پیٹرول کا پمپ ہاتھ میں لے کر گاڑی میں پیٹرول بھرنے لگی۔

مہ جبیں کا سیل فون بجنے لگا۔ فون سنتے ہی وہ بے حد گھبرا گئی تھیں۔ وہ جلدی سے پائپ واپس جگہ پر رکھ کر گاڑی کے اندر آگئی۔

"وہ ٹھیک تو ہے؟ میرے خدایا۔۔۔ میں پہنچ رہی ہوں۔" مہ جبیں نے سیل آف کرنے کے بعد نہایت پریشانی کے عالم میں گاڑی مین سڑک پر لاکر اسپتال کی طرف موڑی۔۔۔

"کیا ہوا خالہ۔۔۔ سب خیریت ہے؟"

"نہیں۔۔۔ خیریت نہیں ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا میری بہت اچھی فرینڈ کا بیٹا' جو ہمارے نیبرز میں رہتے ہیں۔۔۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ بہت سیریس کنڈیشن ہے اس کی۔ وقار وہیں اسپتال میں ہیں۔"

"اچھا وہ۔۔۔ رز؟ جن کے گھر آپ نے کیک بھجوایا تھا۔" اسے یاد آگیا۔

"ہاں وہی۔۔۔ اس کا نام مہرز ہے۔"

"جی۔۔۔؟" رامین کی نگاہوں کے سامنے وہی ہنستا مسکراتا چہرہ یکدم خون میں نہا گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے دھڑدھڑاتے دل پر قابو پانے میں ناکام ہوچکی تھی۔

"اللہ کرے وہ ٹھیک ہو۔" اسپتال کے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی بے اختیار اس کا دل چاہا وہ کار سے باہر کود جائے۔ اس سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد اسے صحیح سلامت دیکھ کر اپنی تسلی کرنا چاہتی تھی۔

مہ جبیں نے پارکنگ لاٹ میں گاڑی کھڑی کی اور تیز تیز قدم اٹھاتے اسپتال کے ایمرجنسی یونٹ کی طرف بڑھیں۔ استقبالیہ پر ہی وقار خالو نظر آگئے۔ رامین کا ذہن آندھیوں کی زد میں تھا' اس نے بے قرار ہو کر ادھر ادھر دیکھا' تو آئی سی یو کے باہر کاریڈور میں حسن نظر آیا۔

"کیا ہوا ہے اسے حسن۔۔۔ بولو؟" حسن کا کالر پکڑ کر وہ زور زور سے رونا شروع ہوگئی۔ "بتاؤ مجھے۔۔۔ وہ زندہ ہے نا۔۔۔ وہ ٹھیک ہے نا؟"

"رامین سنبھالو خود کو۔۔۔" مہ جبیں دوڑ کر اس کے نزدیک آئیں۔ اور اسے کندھوں سے تھام کر سہارا دیا۔

"نہیں خالہ۔۔۔ وہ مجھ سے ناراض ہے۔ اس نے کہا تھا وہ مر جائے گا۔ دیکھیں وہ چلا گیا۔ اسے روک لیں پلیز اسے روک لیں۔ اب میں اس سے کبھی نہیں لڑوں گی۔ اسے واپس بلالیں۔" رامین ان کے ہاتھوں سے نکلی جارہی تھی۔ وہ حسن کا بازو کھینچ کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے التجا کرنے لگی۔

"وہ تمہارا دوست ہے نا' تمہاری بات ضرور سنے گا۔ اس سے کہو مجھے معاف کردے۔۔۔ دیکھو اس کی ہارٹ بیٹ رک گئی ہے۔ وہ اسے لے کر جارہے ہیں۔ انہیں روکو حسن۔۔۔" رامین کو شیشے کے پار ہارٹ مانیٹر صاف نظر آرہا تھا۔ جس میں دل کی دھڑکن سیدھی لکیر کی صورت چل رہی تھی۔

حسن نے مڑ کر دیکھا' رامین ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ہارٹ مانیٹر پہ دل کی دھڑکن لکیر کی صورت نظر آتے آتے معدوم ہونے لگی۔

"رامین! وہ بالکل ٹھیک ہے۔" حسن نے اسے کندھوں سے تھام کر نرمی سے سمجھایا۔ "ہارٹ مانیٹر آف کردیا گیا ہے۔ اسے روم میں شفٹ کر رہے ہیں۔ کچھ گھنٹوں بعد اسے ہوش آجائے گا۔ اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔"

اسے یقین نہیں آیا۔ وہ یک ٹک حسن کے ہونٹوں کی جنبش دیکھتی رہی۔ جو اسے مہرز کے زندہ ہونے کی نوید سنا رہے تھے۔

حسن نے دوبارہ کہا۔ "ہی از فائن رامین!"

"اللہ کا شکر ہے۔" مہ جبیں نے رامین کو اپنے بازوؤں میں بھرتے ہوئے اس کا سر اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے کہا۔

☼ ☼ ☼

مہرز ابھی تک خواب آور دواؤں کے زیر اثر تھا۔ رامین اس کے بیڈ کے بالکل پاس کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے زخمی چہرے اور دائیں بازو پر موجود خراشوں پر باریک کھرنڈ ابھرنے لگا تھا۔ بایاں بازو دو جگہ سے فریکچر تھا' جن پر پلاسٹر چڑھا دیا گیا تھا۔ کار الٹ جانے باعث اس کے سر کو شدید جھٹکے لگے تھے۔ زخم بھی آیا تھا پر زیادہ گہرا نہیں تھا۔ اس کی خوش قسمتی تھی' ونڈ اسکرین کی کرچیوں سے آنکھیں محفوظ رہی تھیں۔ پولیس ڈاکٹرز سے رپورٹ لے چکی تھی' وہ نشے میں نہیں تھا۔ یہ ایکسیڈنٹ ذہنی دباؤ جلد بازی کا نتیجہ تھا۔

رامین سانس روکے جانے کب سے اس کے زخم گنے چلے جارہی تھی۔ پھر بھول جاتی اور دوبارہ گننے لگتی۔ اسی دوران اس کی پلکوں پر ٹھہرے آنسو چھلک کر مہرز کی کلائی پر گرے۔ اس باریک سی خراش پر جس کے کناروں پر ہلکا سا خون ابھی تک تازہ تھا۔ وہ آنسو اس خراش میں جذب ہوا اور مہرز کا ہاتھ لرزا۔

"جب تم روتی ہو' مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔" اس نے سچ کہا تھا۔ رامین کے رونے سے واقعی اسے تکلیف ہورہی تھی۔ وہ لب بھینچ کر فوراً" پیچھے ہٹ گئی اور بے رحمی سے تمام آنسو پونچھ ڈالے۔ اسے اپنے آپ سے نفرت ہورہی تھی۔ جب وہ کہہ رہا تھا کہ اس کا درد سمجھ سکتا ہے تو رامین کو یقین نہیں آیا تھا۔ بھلا جب اس نے وہ درد سہا نہیں تو جان کیسے سکتا تھا۔ سمجھ کیسے سکتا تھا؟ مگر اب وہ جان گئی تھی۔ کسی تکلیف کا احساس کرنے کے لیے خود وہ زخم کھانا ضروری نہیں ہوتا۔ اگر ہم کسی کو تہ دل سے چاہتے ہوں تو اس کا ہر حال ہمارے اوپر اترتا ہے۔ اس کا ہنسنا ہمیں ہنساتا ہے' اس کی خوشی ہماری خوشی ہوتی ہے' اس کے آنسو ہماری آنکھ سے بہتے ہیں اور اس کا درد۔۔۔ ہم اپنے جسم پر سہتے ہیں اور سسکتے ہیں۔

یہ درد تو جسم کے تھے۔ ان سب سے بڑھ کر ایک زخم اور تھا جو اس کے دل کو گھائل کر رہا تھا۔ پچھتاوے اور افسوس کا۔ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا دل کو۔۔۔ مہرز کی اس حالت کی ذمہ دار وہی تھی اور سب سے بڑھ کر غم خوار بھی خود وہی تھی۔ ندامت کے آنسو ٹھہرنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

حسن آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ وہ بے آواز قدموں سے چلتا ہوا اس کے نزدیک آگیا اور جھک کر سرگوشی کی۔ "اٹھو رامین' باہر آنٹی بلارہی ہیں' اب تم گھر جاؤ۔ رات بہت ہوگئی ہے۔" اس نے سر اٹھا کر حسن کی طرف دیکھا۔

پتا نہیں کیوں اسے خوف محسوس ہوا کہ اس کمرے سے باہر آکسیجن نہیں ہے۔ وہ مہرز کے پاس سے چلی گئی تو مر جائے گی۔ اس سوچ نے قدم جکڑ لیے تھے۔

"صبح دوبارہ آجانا۔" حسن اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

"کیا صبح ہوگی؟" اس نے ساتھ کچھ اور بھی کہا جو حسن کو سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"تم گھر جاکر آرام کرنا۔۔۔ جب مہرز کو ہوش آیا' میں تمہیں کال کرکے بتادوں گا۔"

رامین نے سر جھکالیا پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

پورا گھر خالی پڑا تھا' یقیناً" خالہ اور خالو اسپتال جاچکے تھے۔ اس کی نظر ڈائننگ ٹیبل پر رکھے ہوئے ایک پیکٹ پر جارکی۔ وہ میز کے نزدیک آئی اور پیکٹ کھول کر تمام چیزیں باہر نکال لیں۔

ایک سیل فون' چابیاں' ڈرائیونگ لائسنس اور والٹ۔ ان میں سے دو چیزوں کو وہ اچھی طرح پہچانتی

تھی۔ سیل فون اور والٹ مہرز کا تھا‘ اس نے ڈرائیونگ لائسنس اٹھایا تو تصویر دیکھ کر اس کا دل آنکھوں میں سمٹ آیا۔ مہرز کی تصویر دیکھ کر اس کی بے تابی میں خاطر خواہ کمی آئی تھی۔ اپنے لیے چائے بنانے کچن میں آئی تو فریج پر لگے نوٹ کو پڑھا‘ مہ جبیں نے لکھا تھا‘ وہ دوپہر تک آکر اسے اپنے ساتھ دوبارہ اسپتال لے جائیں گی۔ مہرز کو ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔ حسن کو اپنی ٹریننگ پر واپس آنا تھا اس لیے وہ مہرز کے پاس رک رہی تھیں۔ شام میں حسن دوبارہ آنے والا تھا۔

اپنی چائے لے کر وہ باہر لان میں کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس کی نظریں مسلسل مہرز کے گھر کا طواف کر رہی تھیں نجانے کیوں بڑی شدت سے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کسی طرح اس کے گھر کے اندر پہنچ جائے۔

ڈائننگ ٹیبل پر آکر پھر سے وہ پیکٹ کھولا‘ نہایت عقیدت اور محبت سے ہر شے پہ ہاتھ پھیرتی مہرز کی تصویر کو دیکھے گئی۔ بہت آسان ہوتا ہے درد سہنا۔ پچھتاوے کا بوجھ اٹھانا بہت مشکل ہوتا ہے اور وہ تو شاید ہر مشکل کام کرنے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی سن کر وہ اچھل پڑی۔ دھڑ دھڑاتے دل کو قابو میں لاتی فون کی طرف بڑھی‘ دوسری طرف وقار خالو تھے۔

”رامین۔ ابھی تھوڑی دیر میں مہرز کے آفس سے مسٹر جوزف آئیں گے۔ ہماری ڈائننگ ٹیبل پر جو پیکٹ ہے اس میں مہرز کے گھر کی چابیاں ہیں۔ وہ انہیں دے دینا۔ بلکہ تم بھی ساتھ چلی جانا۔ مسٹر جوزف اسٹڈی میں جائیں گے اور وہاں سے اس کی کار کے انشورنس کے کاغذات لے آئیں گے۔ اوکے۔“

”جی....“ اور اس سے پہلے کہ وہ مہرز کے بارے میں پوچھتی انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔

مسٹر جوزف دس منٹ بعد ہی آگئے۔ ان کے بیل بجانے پر اس نے چابیاں ہاتھ میں لیں‘ دروازہ کھولا اور دھڑکتے دل کے ساتھ مہرز کے گھر کی جانب چل پڑی۔

☼ ☼ ☼

مسٹر جوزف مطلوبہ فائل لے کر چلے گئے تو اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اب وہ اکیلی تھی۔ آج پہلی بار وہ اس گھر کے اندر آئی تھی مگر بالکل بھی اجنبیت محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اسے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ ہچکچاہٹ بھی نہیں ہو رہی تھی۔ پورا گھر خالی پڑا تھا۔ مہرز کے کمرے کے علاوہ فی الحال اسے اور کچھ نہیں دیکھنا تھا۔ اس کا ارادہ وہاں کچھ دیر بیٹھنے کا تھا۔ اور بس....... پھر وہ واپس چلی جاتی۔

اتنا اندازہ تو تھا اسے کہ لان کی طرف آخری سرے پر اس کا کمرا ہے۔ قدم اپنے آپ بڑھتے ہوئے جا رہے تھے۔ اسے کوئی تردد نہیں کرنا پڑ رہا تھا۔ ایک بے اختیاری سی کیفیت طاری تھی‘ جس کے زیر اثر وہ کچھ بھی سمجھنے بوجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھی تھی۔ اسے سکون کی تلاش تھی۔ جو اسے وہیں مل سکتا تھا۔ جہاں مہرز کی خوشبو تھی۔ اس کی موجودگی کا احساس تھا۔

دروازہ کھولتے ہی اس نے گہری سانس کے ساتھ اس مخصوص مہک کو اپنے اندر اتار لیا‘ جو مہرز کی پہچان تھی۔ پتا نہیں واقعی اس کا کمرا خوشبو سے مہک رہا تھا یا اسے لگ رہا تھا۔

کچھ دیر آئینے کے سامنے کھڑی رہی جیسے مہرز کا عکس ابھی تک وہیں ٹھہرا ہو۔ پھر پلٹی۔ بیڈ کے نزدیک آئی اور سائیڈ ٹیبل پر سجے فریم میں مہرز کی اپنے ماں باپ کے ساتھ تصویر کو ہاتھ میں لے کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ کافی دیر نہایت غور سے مہرز کو دیکھتی رہی۔ پہلی بار وہ اسے اس نظر سے دیکھ رہی تھی‘ جو نئی نئی اس کے دل میں مہرز کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ وہ کتنا گڈ لکنگ ہے‘ یہ اسے اب معلوم ہوا تھا۔ سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے اس نے وہ فریم واپس جگہ پر رکھ دیا۔ پھر جانے کیوں اس نے درازیں کھولیں‘ ایک کے بعد دوسری پھر تیسری‘ وہ ہر اس چیز کو بھرپور توجہ دے رہی تھی۔ جس پر مہرز سرسری سی نظر بھی شاید ہی ڈالتا ہو گا۔ پہلی دراز کو آہستگی سے اپنی جانب دھکیلا چھوٹے بڑے باکسز گفٹ ریپر میں لپٹے رکھے ہوئے تھے‘ اسے بند کرنے کے بعد اس نے دوسری دراز کھولی۔ چھوٹی سی البم‘ ڈائری اور جیولری باکس۔ وہ بھی اس نے بند کر دی مگر تیسری دراز کھولنے کے بعد وہ اسے بند نہیں کر پائی۔ جس میں چھوٹے بچوں کی کہانیوں والی کتابیں اور انگلش کامکس بھری ہوئی تھیں۔ رامین سانس روکے اس دراز میں پڑی کتابوں کو دیکھے گئے۔ وہ سب اس کی تھیں۔

اسے یاد تھا وہ بکس پڑھنے کے بعد مہرز کو دے دیا کرتی تھی مگر کتنے سال ہو گئے تھے۔ وہ انہیں اب تک سنبھال کر کیوں رکھے ہوئے تھا؟ لرزتے کانپتے ہاتھوں سے اس نے سب کچھ دوبارہ اسی طرح رکھا۔ اور دوسری دراز نکال کر اپنے سامنے رکھ لی۔ ڈائری اٹھائی‘ کھولی۔ اس ڈائری میں کچھ بھی لکھا ہوا نہیں تھا۔ پوری ڈائری میں جابجا اسٹکرز اور بہت سی ٹافیز کے ریپرز پیسٹ کیے گئے تھے۔ جو اس نے مہرز کو دیے تھے۔ کلاس ون سے فور تک۔ اسے ٹھیک سے یاد نہیں آرہا تھا یا پھر یقین نہیں آرہا تھا۔ اچھی طرح دیکھنے کے بعد اس نے ڈائری واپس رکھی اور جیولری باکس اپنی گود میں رکھ کر کھول لیا۔ چھوٹا سا سبز رومال‘ ایک ٹوٹا ہوا کلپ‘ ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے‘ اس نے اپنی آنکھیں رگڑیں۔ وہ سب کچھ صاف دیکھنا چاہتی تھی۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے حلق میں اٹکتے آنسوؤں کو گلے کے اندر اتار لیا۔ استعمال شدہ پنسلیں‘ اس نے ننھی منی کئی پنسلیں اٹھا کر دیکھیں‘ جو اتنی چھوٹی ہو چکی تھیں کہ انہیں پکڑ کر کچھ لکھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس کی شروع سے عادت تھی۔ وہ ہمیشہ پنسل کو آخر تک استعمال کیا کرتی تھی۔ یہ سب معمولی اور بے کار چیزیں جنہیں مہرز نے کسی خزانے کی طرح سنبھال کر رکھا۔ وہ سب رامین کی تھیں۔

البم میں ان کے اسکول کی بہت سی پکچرز تھیں‘ کلاس گروپ فوٹوز‘ پکنک کارنیول اور سب سے آخر میں فیرویل فنکشن کی تصاویر تھیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے ساری تصویریں دیکھ رہی تھی۔

”یہ محبت بھی تو ہو سکتی ہے۔“

”میں نہیں مانتی۔“

”مت مانو‘ وقت خود ثابت کر دے گا۔“

اور وقت نے کیسا ثابت کیا تھا۔ بیس اکیس سال۔ اس نے رامین کے ساتھ گزارے ہوئے لمحوں کی ایک ایک یاد کو متاع حیات کی طرح سنبھال کر رکھا تھا۔

”میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں رامین آئی لو یو۔“

کیا تھی وہ...؟ ایک عام سی لڑکی‘ جسے وہ دیوانوں کی طرح چاہتا آیا تھا‘ وہ پوری دراز رامین سے مہرز کی محبت کے ثبوتوں سے بھری پڑی تھی۔ سب سے پہلی دراز بھی نکال لی تھی اس نے۔ وہ چھوٹے بڑے گفٹ باکسز جن میں سے اکثر گفٹ پیپرز کے کنارے سفید ہو چکے تھے‘ ”تقریباً“ دس گیارہ تھے۔ ہر ایک پر تاریخ پڑی تھی۔ چھوٹے سے کارڈ پر وش کیا گیا تھا۔

”ہیپی برتھ ڈے رامین۔“

وہ اس کا گھر جانتا تھا۔ فون نمبر جانتا تھا۔ اس کے باوجود وہ کبھی اس کے پیچھے نہیں آیا تھا۔ جس طرح وہ ہر سال اس کی برتھ ڈے یاد رکھتی رہی تھی‘ وہ بھی رکھتا آیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اس نے یاد رکھا تھا بلکہ ہر سال کا ایک گفٹ بھی خریدتا تھا‘ اس سال کا بھی‘ جب وہ الگ ہوئے تھے‘ حالانکہ اس وقت بظاہر وہ اس سے شدید خفا تھا۔

اتنے پرخلوص انسان نے اسے چاہا‘ اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہا۔ اور اس نے کیا کیا؟ اس نے مہرز کو دھتکار دیا تھا۔ آخر کیا چاہیے تھا اسے دائمی خوشی؟ لازوال محبت؟ یا عزت و احترام؟

اسے مل تو رہی تھی ہاں اس ہستی سے نہیں مل پائی تھی جس سے وہ امید کر رہی تھی مگر مل تو رہی تھی۔ لیکن اس نے شک کیا۔ اور ٹھکرا دیا۔

اس ضدی بچے کی طرح جسے کھانے کو مٹی نہ دی جائے تو مٹھائی کھانے سے بھی انکار کر دیتا ہے۔

اس نے بھی مہرز کے ساتھ یہی کیا تھا۔ صرف مہرز ہی کیا۔ وہ تو شاہ زیب 'عزا' نیلوفر اپنی خالاؤں اور کزنز کے ہوتے ہوئے بھی محبت کی کمی کا رونا روئے جا رہی تھی اب تک۔۔۔ یہ ناشکری نہیں تو اور کیا تھا۔

نازنین کے ماہرانہ ہاتھ ایک لکڑی کے بلاک کو خوب صورت جسم میں باآسانی تبدیل کر لیتے تھے پر اس سے اپنی بیٹی اپنے مطابق ڈھالی نہیں گئی تو سخت ہاتھوں سے اس کی صورت مسخ کرنے پر تل گئی تھی' اپنی بے بسی پر غصہ آتا تھا اسے۔ رامین کو ماں سے متوقع محبت نہ ملی تو وہ خود ترسی کی دلدل میں دھنستی چلی گئی تھی۔

دونوں ماں بیٹی میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ ایک خود پرستی میں مبتلا۔ ایک خود ترسی میں۔ دونوں کیفیات انسان کو صرف "میں" تک محدود رکھتی ہیں۔ وہ صرف اپنے بارے میں ہی سوچتے ہیں بس۔ اور ان کے اس "میں" کا بھگتان ان کے پیاروں کو بھگتنا پڑتا ہے' ایک ظالم تو دوسرا مظلوم بن کر تمام عمر اسی رنج میں گرفتار رہتا ہے کہ اسے اس کا حق نہیں ملا۔

یہ دونوں انسان کبھی خوش نہیں رہ پاتے' بے یقین' بے اعتبار رہتے ہیں۔ کسی نعمت کا شکر بھی ادا نہیں کر پاتے۔

اپنے من مندر میں خود اپنی مورت سجا کر نازنین اس کے سامنے سربسجود رہتی بھینٹ لیتی' روپیوں کی' زیور کی' ہیروں کی سونے چاندی کی۔ سب چڑھاوے لے کر بھی اس بت کے لبوں پر حوصلہ افزا مسکراہٹ نمودار نہیں ہوتی۔ وہ کسی کو کچھ نہیں دے سکتا' ماتھے کی شکن تک نہیں۔ لبوں کی مسکراہٹ نہیں' خوشی تو بہت دور کی بات ہے۔

ایسا ہی بت رامین نے بھی خود پر ترس کھا کر بنایا تھا۔ وہ اس کی عبادت نہیں کرتی تھی۔ اس کے گلے لگ کر اپنا دل ہلکا کر لیتی تھی' اس کا ہاتھ تھام کر روتی تھی' اب خوشی کے عالم میں وہ بت اسے نہیں چھوڑ رہا تھا۔ اپنی ماں کے ہاتھوں سے بنائے بت کتنی آسانی سے توڑ ڈالے تھے اس نے' اور اپنی مورت؟ اس کے سامنے وہ خود کو بے جان محسوس کر رہی تھی۔ ہاتھ کیسے اٹھاتی۔؟

☆ ☆ ☆

اس کا ذہن بے دار ہوا تو اس نے بہت وقت سے آنکھیں کھولیں' کمرے میں نیلگوں سفید سی روشنی تھی۔ وہ شدید نقاہت محسوس کر رہا تھا' ٹوٹتے جسم میں ہلنے جلنے کی طاقت نہیں تھی۔ یونہی لیٹے لیٹے وہ یاد کرنے لگا' آخری بار ہوش میں رہتے ہوئے اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ ایکسیڈنٹ...

اسے یاد آگیا تھا۔ اور اس وقت وہ یقیناً اسپتال کے بیڈ پر لیٹا تھا۔ لیکن اسے اس طرح بیڈ پر سیدھے لیٹے ہوئے کتنے گھنٹے یا دن گزر چکے تھے اسے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ آہستہ سے گردن ہلاتے ہوئے اس نے اپنے اردگرد دیکھنے کی کوشش کی' کمرا خالی تھا۔

اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ اسی سوتی جاگتی کیفیت میں اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی' پھر بند ہونے کی اور پھر قدموں کی چاپ لحہ بہ لحہ نزدیک آنے لگی۔ کوئی اس کے بالکل پاس آکر ٹھہر گیا۔ مہرز بدستور اپنی آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔

خاموشی کا وقفہ طویل ہوتے ہوتے وہ دوبارہ نیند میں جانے والا تھا کہ اسے محسوس ہوا' اس کے ہاتھ میں کھبی چند باریک سوئیاں ایک ایک کر کے نکل رہی تھی۔ درد تحلیل ہونے لگا' ہر ایک سوئی کے نکلتے ہی محبت بھرا لمس جسم میں اترنے لگتا تھا' اس کے زخموں کو سہلایا جا رہا تھا۔ ذہن یکدم پوری طرح بے دار ہو گیا۔

کچھ لمحوں بعد وہ جادوئی لمس اس کی پیشانی پر بکھرنے لگا' پھر چہرے پر۔۔۔ جہاں جہاں چھوا جاتا' وہ حصہ درد سے خالی ہوتا جا رہا تھا۔

اس کے لب مبہم سا مسکرائے۔

"کون؟" اس نے بند آنکھوں سے دیکھنا چاہا۔

وہ لمس ٹھہرا' پھر مہکتی سانس میں لپٹے چند الفاظ کا تعارف اس کے پورے وجود میں سرایت کر گیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ مسکرائی۔ جانے اس نے کیا کہا' مہرز کی سمجھ میں نہیں آیا تھا' وہ کافی دیر سے اس کا ہاتھ اور پیشانی سہلا رہی تھی جس کے باعث ہر درد معدوم ہونے لگا تھا' پر اب اس کی انگلیاں ساکت تھیں' مہرز نے پرسکون ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کہا۔

"رک کیوں گئیں۔ مجھے آرام مل رہا تھا۔" اس کے ایسا کہتے ہی وہ لمس دوبارہ سے رگ جاں میں زندگی بن کر اترنے لگا۔

☆ ☆ ☆

مہرز گہری نیند میں چلا گیا تو رامین نے مرہم واپس میڈیسن ٹرے میں رکھ دیا۔ وہ اس کے بازو اور چہرے پر موجود خراشوں پر مرہم لگا رہی تھی۔ اب جبکہ وہ سو چکا تھا تو رامین خاموشی سے اس کے بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ کر اسے غور سے دیکھنے لگی۔

بہت محبت اور پیار سے۔۔۔ ایسی نظر سے اس نے آج سے پہلے کسی مرد کو نہیں دیکھا تھا۔ آخر مہرز میں ایسا کیا تھا؟ یہاں آنے سے پہلے اس نے اپنی پوری زندگی کا تجزیہ کر لیا تھا' اپنے تمام سوالوں کے جواب حاصل کر لیے تھے' اسے کیا نہیں ملا تھا۔ اور اسے کیا چاہیے تھا۔ وہ جان چکی تھی۔

کتاب زندگی کی سب سے طویل الجھن کا اختتام ہو گیا تھا۔ اور بڑے ہی عجیب انداز میں ہوا تھا۔ اس پل' اس لمحے مہرز کے گھر میں اس کے بیڈ روم میں۔ اس کی دراز میں رکھی اپنی تمام چیزوں کو دیکھ لینے کے بعد اس نے پہلی بار خود پر فخر کیا تھا۔ اور شاید پہلی بار اپنی ذات میں مقید اس روتے دھوتے ماتم کرتے وجود سے گھن محسوس کی تھی' اسے کراہیت آرہی تھی اس ناشکرے بت سے جو خود اس کا ہم شکل تھا۔ اسی کی ذات کا پرتو۔ اس چھوٹے سے خزانے نے۔۔۔ اس کی توقیر میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ وہ معتبر ٹھہرا دی گئی تھی' نہایت قابل احترام ہستی جس کے لیے خود ترسی کے بت کو پاش پاش کرنا بے حد سہل تھا اور اس نے کر دیا تھا۔ اپنی زندگی کے چھبیس سالوں میں وہ کتنے مردوں سے ملی تھی۔ اس کے پاپا' جو ماما سے محبت کرتے تھے مگر جانوروں کی طرح سلوک کرتے اور بے عزت کیا کرتے تھے۔

وہ ترکھان جو بہلانے بہلانے سے ایک کم سن بچی کو گود میں بٹھا کر اپنی حیوانی جبلت کی تسکین چاہتا تھا۔ اس کی ماں کی شاعری سے محبت کرنے والے' جو اپنی غلیظ نگاہوں سے اسے سر سے پاؤں تک ناپتے رہتے تھے اور پھر زین۔۔۔ محبت کا دعوے دار جسے نکاح میں لانے کے بعد ذلیل کر کے چھوڑ گیا تھا۔ رامین کی نظر میں محبت سے زیادہ ناقابل اعتبار کوئی تھا ہی نہیں۔

اسے عزت و تکریم پانے کی خواہش تھی ہمیشہ سے' اور یہی خواہش اس سے وہ تمام فیصلے کرواتی چلی گئی تھی جس کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی اسے۔

مہرز وہ واحد شخص تھا جو صرف اس سے محبت نہیں کرتا تھا' اس کا احترام بھی کرتا تھا۔ اسے خود سے کمتر نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی رائے' اس کی ناراضی کو ویسی ہی اہمیت دیا کرتا تھا جتنی کہ خود اپنے آپ کو دیتا تھا۔

فقط غیر مشروط محبت کا احساس اسے مہرز کے قریب نہیں لایا تھا۔ نہیں!

صرف محبت ہوتی تو وہ کبھی اعتبار نہ کرتی' کبھی مہرز کی زندگی میں شامل ہونے کا فیصلہ نہ کرتی۔

صحیح دیکھا تھا اس نے۔ وہ خواب سچ ہی تھا۔ اس کی عمر بھر کی پیاس صرف مہرز ہی بجھا سکتا تھا۔ اور کوئی نہیں!